مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیّارہ ڈائجسٹ

نومبر 2011

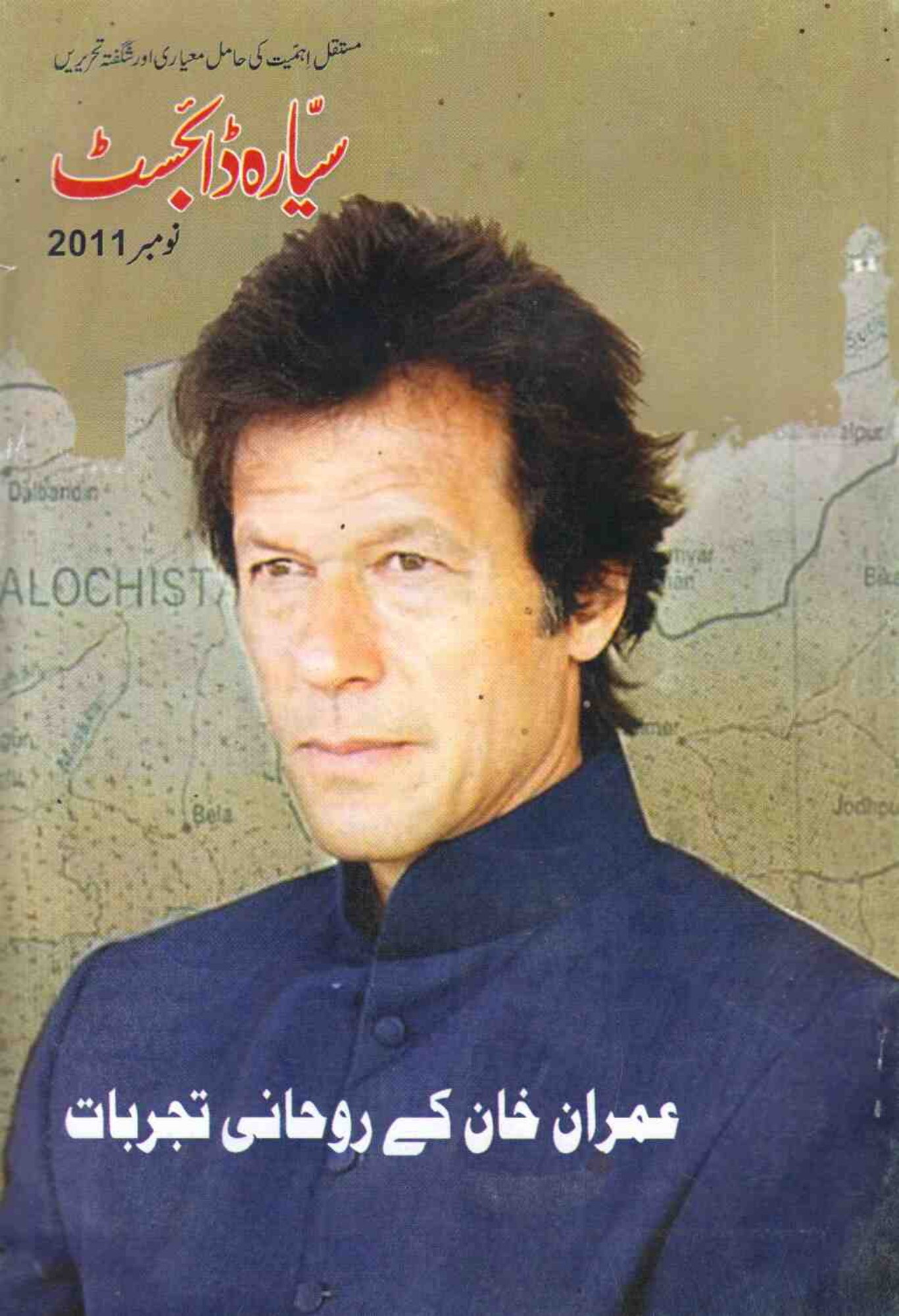

عمران خان کے روحانی تجربات

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی۔ اس سے پہلے کہ تم قابو پالو ان پر (ان کو معاف کر دیا جائے گا) اور خوب جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اے ایمان والو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ اور جدوجہد کرو اس کی راہ میں تاکہ تم فلاح پاؤ۔ بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر ان ہی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تاکہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) عذاب سے روز قیامت' تو قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کیلئے عذاب دردناک ہوگا۔ بہت چاہیں گے کہ نکلیں اس آگ سے اور وہ نہیں نکل سکیں گے اس سے اور ان کیلئے عذاب ہوگا ہمیشہ رہنے والا اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کی (سزا یہ ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ بدلہ دینے کیلئے جو انہوں نے کیا (اور) عبرتناک سزا اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے پھر جس نے توبہ کر لی اپنے (اس) ظلم کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو بے شک اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا اس پر بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

(آیت 34 تا 39) (ترجمہ بحوالہ ضیاء القرآن)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمتع، قرآن اور حج مفرد کا بیان

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ سے چلے اور ہمیں صرف حج کا خیال تھا (یعنی حج کا احرام باندھا تھا) پھر جب ہم مکہ پہنچے اور کعبہ کا طواف کر چکے تو نبی ﷺ نے حکم دیا کہ جس کیساتھ قربانی نہیں وہ (حج کے) احرام سے باہر ہو جائے پس جن لوگوں کے پاس قربانی نہیں تھی وہ احرام سے باہر ہو گئے اور آپ ﷺ کی ازواج کیساتھ بھی قربانی نہیں تھی لہٰذا وہ احرام سے باہر ہو گئیں۔ اُمّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حائضہ ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کا طواف نہ کر سکی جب محصب کی رات آئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ لوگ تو عمرہ اور حج دونوں کر کے لوٹیں گے اور میں صرف حج کر کے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو جب مکہ آئی تھی تو طواف نہیں کیا تھا؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اپنے بھائی کے ساتھ تنعیم تک جا، وہاں سے عمرے کا احرام باندھ لے پھر عمرے سے فارغ ہو کر فلاں جگہ پر ہمیں ملنا۔ اُمّ المؤمنین صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اپنے آپ کو تم سب کا روکنے والا سمجھتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا عقری حلقی کیا تم نے قربانی والے دن طواف نہیں کیا؟ صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے عرض کیا ہاں کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر کچھ حرج نہیں چلو۔

(آیت 34 تا 39) (ترجمہ بحوالہ ضیاء القرآن)

www.urdukorner.com

اس شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	تمتع، قرآن اور حج مفرد کا بیان اور جس شخص کیساتھ قربانی نہ ہو اسکو حج کا احرام توڑ دینا اور اسکے بدلے میں عمرہ کر لینا بھی درست ہے
14	دستک	کامران امجد خان	پاک امریکہ تعلقات فیصلہ کن موڑ پر
39	جوگان	عارف محمود ڈیل	قوت فیصلہ کو تیز کرنیوالا ایک انتہائی دلچسپ کھیل
43	ایک سے ایک	انجم انصار	ٹیلیفون کے کرشمے جو لوگوں کی اصلیت ظاہر کرنے کا سبب بن جاتا ہے!
46	گواہوں میں برابری	ڈاکٹر ذاکر نائیک	گواہی کیلئے عورت اور مرد میں برابری کے حوالے سے غیر مسلموں کے سوالات کے جواب دیتی ایمان افروز تحریر!
49	خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں	قلندر حسین	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
69	لیبیا: شمالی افریقہ کا مسلمان ملک	سید وقار عظیم	لیبیا کی تاریخ اور موجودہ حالات کے متعلق تحقیقاتی مضمون!
75	آنزرول	تسنیم کوثر چیمہ	ایک ہندو لڑکی کی کہانی، حق کی تلاش اس کو بے چین کیے رکھتی!
91	پارس ہاتھ	رسول میمن	ایک شخص کی کہانی جو پوری بستی کی امیدوں کا محور تھا، سندھی ادب سے انتخاب!
97	دولت	نواز خان	جرم و سزا پر مبنی خصوصی کہانی جس کا آپ کو ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے!

17 عمران خان

☆ عمران خان کے روحانی تجربات
☆ وہ جس نے عمران کی زندگی کا دھارا بدل دیا
☆ اپنے ساتھ انگریز بیوی نہ لانا: والدہ کی ہدایت
☆ عمران خان کے متفرق خیالات کی جھلکیاں

169 سیارہ کچن کارنر

☆ ہومس چک پیز ڈپ
☆ سپائسی کباب رول
☆ ٹکڑے والا سوجی حلوہ
☆ گلاوٹ کے کباب
☆ ہنی مسٹرڈ گرلڈ چکن
☆ لبنانی کباب

اس شمارے میں

117	سیلاب کہانیاں	پروفیسر محمد ظریف	حالیہ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی لہو رنگ سچی کہانیاں!
122	نجات	شمع خالد	والدین کا فسانہ، انکے معصوم بچے نے انہیں نجات کا "راستہ" فراہم کر دیا!
132	اولگا	عرفان جاوید	ایک جرمن دوشیزہ کی کہانی، جس کے دیس میں سچے جذبوں کا فقدان تھا!
139	ازالہ	محمد سلیم اختر	وہ کسی کا مجرم تھا اور غلطی سدھارنا چاہتا تھا مگر اسے موقع نہ مل سکا!
145	جھوٹی روٹی	جیلانی بانو	معاشرتی تفریق اور اسکے اثرات کو واضح کرتی سفاک تحریر!
150	احتیاط	ایس۔ امتیاز احمد	ایک محروم تمنا کا حال جس نے ایک نوجوان سہارا ڈھونڈ لیا تھا!
161	کوما کہانیاں	مرزا مظفر بیگ	کوما سے جاگ اٹھنے والوں کی کہانیاں، جاگنے کے بعد انکی زندگیاں بدل گئیں!
173	ہنسے تو پھنسے	عارفہ صبح خان	طنز و مزاح کی چاشنی لیے، خوامخواہ ہنسنے کے نقصانات واضح کرتی شگفتہ تحریر!
181	بزم شاعری	ادارہ	باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
186	ناگ دیوتا کا شکار	یوسف علی	ایک پراسرار سانپ کے شکار کا حیرت انگیز واقعہ، راوی کا اصرار ہے کہ تمام واقعات من و عن سچے ہیں!
197	ملگجی عورت	فہمیدہ کوثر	ایک عورت کی کہانی، جس کے وجود سے سب تنگ تھے!

129 ٹیکنالوجی کی دنیا

☆ گمنام جینئس (ایسے تخلیق کار جن سے دنیا واقف نہیں)
☆ ویب ٹریفک کا ایک فیصد آئی پیڈ یوزرز
☆ ڈاٹ کام ـــــ خدا حافظ
(ڈاٹ کام کا راج اب ختم ہونے کو ہے)

200 کھلتی ہے آرزو کی کلی

ایک زندہ دل خوش گفتار لڑکی کی کہانی زندگی کے نشیب و فراز اسے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں
شوکت افضل کے قلم سے

www.urdukorner.com

www.fac[illegible]com/sayaradigest
Email:editor[illegible]yara@yahoo.com
sayyaradig[illegible]gmail.com
editorsayya[illegible]hotmail.com
Phone:92-0[illegible]7245412
Mobile:0300[illegible]30206

جلد: 47۔ شمارہ: 11 نومبر 2011ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

سیارہ ڈائجسٹ لاہور

[illegible]

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب
معاون مدیران : جویریہ کامران۔ روفی خان۔ فرحان امجد
سرکولیشن منیجر : بشیر احمد
مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان۔ 0333-4207684
نگران پرنٹنگ : خالد محمود۔ محمد توفیق
طابع : اللہ والا پرنٹرز، شاہراہ قائداعظم لاہور

شعبہ اشتہارات : کراچی: محمد عابد مرزا۔ 0321-3758492
لاہور: طارق محمود۔ 0300-4144781

مجلس مشاورت
رفیق غوری، ریاض آفندی
پروفیسر خالد پرویز، فیاض عمر، عارف محمود ائیل

قیمت 55 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

اظہار خیال

اسلامی نمبرز

محترم و مکرم جناب کامران امجد خان صاحب
سلام مسنون! سیارہ ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ ماشاء اللہ سیارہ ڈائجسٹ نے اپنی اشاعت کے روز اول سے اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے۔ سلجھے سلجھے موضوعات پر نکھری نکھری تحریریں سیارہ ڈائجسٹ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ آپ لوگوں نے جو ہم پر احسان عظیم فرمایا ہے وہ دو درجن کے قریب مختلف موضوعات پر سیارہ ڈائجسٹ کے نمبرز ہیں۔ ان نمبرز نے متوسط طبقہ کی بہت سی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ خداوند کریم آپ لوگوں کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔ اپنی ایک تازہ ترین غزل بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کسی قریبی اشاعت میں جگہ پائے گی۔
(ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم ضلع جہلم)

☆☆

انتظار رہتا ہے

السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میں پچھلے چند ماہ سے سیارہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اس سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ہر ماہ شدت سے اسکا انتظار رہتا ہے۔ ماشاء اللہ جریدے کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ اگر کسی ایک کی بھی تعریف نہ کی جائے تو بے جا ہوگا۔ اس کے لیے آپ کا تمام سٹاف مبارکباد کا مستحق ہے۔ جن کی انتھک محنتوں اور کوششوں سے یہ رسالہ آج اس مقام تک پہنچا ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو دن گیارہویں اور رات بارہویں ترقی دے۔
[illegible] ڈائجسٹ [illegible] شرکت کر رہی ہوں اور اپنی دو غزلیں بزم شاعری کے لیے بھیج رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے تاکہ میں آئندہ بھی اس میں شامل ہوتی رہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ساری ٹیم کو اپنی حفاظت میں رکھے (آمین)
(دعا گو، عصمت اقبال عین۔ منگلا ڈیم)

☆☆

تمام سلسلے خوب رہے

جناب محترم کامران امجد خان صاحب
السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ اکتوبر 2011 کا سیارہ ڈائجسٹ ہمارے سامنے ہے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکلز کا انتخاب لاجواب رہا۔ غزلیں عمدہ رہیں۔ اپنی تحریریں ہم آپ کو ارسال خدمت کر چکے ہیں جو یقیناً آپ کو مل گئی ہوں گی۔ برائے مہربانی انہیں قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر سٹاف اور سیارہ ڈائجسٹ کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والوں کو دعا و سلام۔ برائے مہربانی اپنا خیال رکھیے گا۔
(ایس امتیاز احمد، کراچی)

☆☆

محکمہ ڈاک والے

عزیزم کامران امجد خان صاحب، السلام علیکم! خیریت مطلوب، خیریت موجود۔ لہو رنگ کراچی کے حالات پر ایک نظم گزشتہ ماہ ارسال کی تھی۔ میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اب کاش کوئی سرکاری

www.urdukorner.com

"اہل دل" (اگر کوئی ہو) تو اس شہر کے سنگینی، دل دوز اور غمگین، منظوم کوائف پڑھ کر دل پر اثر لے۔ توقع تو یہی ہے کہ میرا تحریر کردہ شگفتہ افسانہ "ابا...... جے" ستمبر کے شمارے کی زینت بن چکا ہوگا۔ "کبابستان" تو محکمہ ڈاک والے پی گئے۔

اس نظم کے سلسلے میں میری التجا ہے کہ ازراہ کرم اسے کسی علیحدہ صفحہ پر جگہ عطا فرمائیں اور فہرست میں بھی اس کا نام دے دیں تاکہ سند رہے اور یہ بوقت ضرورت کام آئے۔

بھائی امجد رؤف خان کو سلام۔

(پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی)

☆ پروفیسر صاحب، آپ کے شہر کے امن وامان کی حالت تو دگرگوں ہے ہی مگر لگتا ہے کہ شہر کراچی کے محکمۂ ڈاک والے بھی کسی سے "کم" نہیں۔ آپ کی دونوں تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور دونوں بار آپ کو اعزازی شمارے ارسال کیے گئے ہیں لیکن آپ کی لاعلمی سے لگتا ہے کہ آپ تک یہ شمارے نہیں پہنچ پائے اور درمیان میں ہی "گول" کر لیے گئے۔

☆☆

نفسانفسی کے دور میں

محترمی ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! اکتوبر کا شمارہ موصول ہوا، اس کے لیے شکریہ۔ سب سے پہلے میں شوق خانوادی صاحب کو ان کی دونوں دعائیں قبول ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو ہدیہ تبریک پیش کرنے والوں پر اپنی خاص نظر رکھتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ شوق صاحب بھی مجھے اپنی قیمتی دعاؤں میں شامل رکھیں۔ شکریہ!

جس طرح محترمہ کنول صاحبہ اپنی گوناگوں قیمتی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ماہنامہ سیارہ کے صفحات کو رونق بخشتی ہیں! میں ان کی ہمت اور کوشش کو سلام کرتی ہوں اور شکریہ کے ساتھ یہ دعا کرتی ہوں کہ یاسمین ہمیں اپنی ذات کا پیارا سا احساس دینے کے لیے ہمیشہ ہم میں موجود رہیں (آمین)۔

پروفیسر محمد ظریف خاں ذرہ نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے جس طرح میری تحریروں کو خاص توجہ سے پڑھتے ہیں یہ زیادتی ہوگی کہ میں ان کا ذکر نہ کروں۔ اس نفسانفسی کے دور میں کسی کی بے لاگ اور بے لوث تعریف کرنے کے لیے بھی جگر اور ظرف چاہیے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان کا نام محمد ظریف کی طرح اعلیٰ ظرف خان بھی ہوتا۔ اگرچہ گزشتہ کئی سالوں سے یہ اپنی مختلف علمی وادبی خدمات کے صلہ میں ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پھر بھی وہ اوروں کی بھلائی سے غافل نہیں رہتے۔ "جے" میاں بیوی تو ہمہ صفت موصوف ہیں۔ انکی ہمت، حوصلہ، جدوجہد اور ٹیلنٹ کے بارے میں لکھنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

اسکے علاوہ نمرہ حیدر جس خلوص سے میری کہانیاں پڑھ کر پذیرائی بخشتی ہیں اس کے لیے بھی میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

بہترین خواہشات کے ساتھ طالب دعا۔

(شوکت افضل۔ اسلام آباد)

☆☆

آزادی سے ناآشنا

گرامی القدر جناب کامران امجد خان صاحب مدیر منتظم "سیارہ ڈائجسٹ" السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ شمارہ اکتوبر زینت مطالعہ ہے۔ آپ نے اپنے صفحہ "دستک" میں "سندھ میں سیلاب کی تباہ کاریاں اور حکمرانوں کی بے حسی" کا جائزہ لیا ہے جو قابل داد ہے۔ آج ہمیں آزاد ہوئے 64 سال ہو

گئے ہیں۔ افسوس کہ ہم ہر سال آزادی کی سالگرہ بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں، کروڑوں روپے کا کاغذ محض رنگ برنگی جھنڈیوں پر ضائع ہو جاتا ہے اور اتنا ہی کپڑا جھنڈے بنا کر لہرانے میں...... ہم آج تک لفظ آزادی سے ناآشنا ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ جیسے عظیم انسان کی کوششوں سے 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا لیکن جلد ہی ہمارے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں کی وجہ سے اس کا مشرقی حصہ ہم سے جدا ہو کر ایک علیحدہ ملک بنگلہ دیش کہلایا۔ کیا ہمارے حکمرانوں نے یہ سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ آج بھی ہمارے سروں پر وہی گدھ منڈلا رہے ہیں۔

ہماری حکمران پارٹی کے جد اعلیٰ ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کو روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ دے کر اپنا لوہا منوایا۔ افسوس کہ آج وہ بھٹو ہے نہ اس کے بیٹے اور نہ اس کی دو دفعہ منتخب ہونے والی بیٹی بینظیر بھٹو ہے...... ہاں بینظیر بھٹو کے شوہر نامدار آصف علی زرداری صدارتی عہدہ پر براجمان ہیں۔ ان کے چار سالہ دور میں مہنگائی، بیروزگاری، طویل لوڈشیڈنگ اور سیلاب کی تباہ کاریاں ہیں، سرعام ڈکیتیاں ہیں اور تو اور گڈ گورننس دوربین سے بھی نہیں دیکھی جا سکتی۔

یہاں پہلے لوگ طاعون، چیچک اور ٹی بی جیسی وباؤں سے موت کو گلے لگاتے تھے۔ آج کل ایک نئی آفت ڈینگی بخار نے لے لی ہے۔ یہ مرض بھی ایک مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ یہ مچھر عام گھٹیا مچھروں کے برعکس صاف پانی پر پلتا ہے اور سرسبز ماحول میں رہائش پسند کرتا ہے۔ وقت بے وقت نہیں کاٹتا بلکہ طلوع آفتاب یا غروب آفتاب میں واردات کرتا ہے۔

پچھلے دنوں میڈیا پر آیا کہ جب سری لنکن ماہرین کی ڈینگی دشمن ٹیم لاہور کے ایک ہسپتال میں مریضوں کی کیفیت دیکھنے پہنچی تو ان ڈاکٹروں کے علاوہ اردگرد کے گملوں میں قیام پذیر ڈینگیوں نے بھی اپنے انڈوں سمیت ان کا استقبال کیا چنانچہ مہمان ٹیم نے ڈینگی کی دیدہ دلیری سراہتے ہوئے حکومت پنجاب کی مستعدی کو زیرلب داد دی۔

جس طرح کچھ عرصہ پہلے شریف حکومت نے مہنگی چینی سستی کروانے کے لیے اتنے جوش سے شوگر ملز اور پرچون کی دکانوں پر چھاپے مارے کہ چینی سستی ہونے کی بجائے بازار سے غائب ہو گئی۔ جس طرح آٹھ روپے کی روٹی پانچ روپے میں فراہم کرنے کے لیے سستے تندوروں کی سکیم میں اربوں روپے جلا کر ہاتھ جھاڑ لیے گئے۔ اسی طرح ڈینگی سے نمٹنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور اس موذی مچھر نے کئی گھروں کے چراغ گل کر دیئے ہیں کیونکہ اس کے ٹیسٹ اور پھر علاج ہر شخص کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔

آج کل الیکشن لسٹوں کے مکمل ہونے کا شور و غوغا ہے۔ ہم میں جب تک ووٹ کی قدر و قیمت کا شعور نہ ہوگا ہمارے ہاں الیکشن میں جیت کر آنے والے لوگوں سے بننے والی اسمبلی کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شعور ہم میں تعلیم سے اجاگر ہوگا جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ "سیارہ ڈائجسٹ" کو بمعہ پوری ٹیم عزت وتوقیر دے۔ بڑھے چلو بڑھے چلو کہ ہماری منزل ابھی دور ہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

(قلندر حسین سید، احمد پور شرقیہ)

☆☆

خواہش پوری ہو گئی

محترم کامران امجد صاحب! آپ نے گزشتہ

www.urdukorner.com

شمارے میں ہماری پسندیدہ رائٹر شوکت افضل صاحبہ کی تحریر کے ساتھ ان کی تصویر شائع کر کے ہماری دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ کچھ عرصہ قبل ان کی کتابوں کے اشتہار میں ان کی تصویر شائع ہوئی تھی مگر وہ بہت غیر واضح تھی اور اس سے انکی شخصیت کے بارے میں تاثر قائم کرنا ممکن نہ تھا تاہم تازہ تصویر واضح بھی ہے اور اس سے یقیناً ہمارے جیسے ان کے دیگر پڑھنے والوں کو ان کی شخصیت کا درست تاثر قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ تمام رائٹرز کی تصاویر شائع کیا کریں تاکہ پڑھنے والوں کو رائٹرز کی شخصیت کو جاننے اور ذہن میں موجود شبیہہ کو مزید واضح کرنے میں مدد مل سکے۔

(لائبہ رفیق۔ بذریعہ ای میل)

☆لائبہ! آپ قارئین کے اصرار کو دیکھتے ہوئے ہی ہم نے شوکت افضل صاحبہ کی تازہ تصویر کو نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ دیگر رائٹرز کی تصاویر بھی شائع کی جارہی ہیں۔

☆☆

''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں''

قابل احترام امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے ذریعے آپ اور آپ کی ٹیم جو قومی خدمت انجام دے رہی ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ میں یہاں خصوصی طور پر قلندر حسین صاحب کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ہم قارئین کے لیے بے انتہا محنت اور کوششوں سے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی کر کے معلومات کا نچوڑ مہیا کرتے ہیں۔ یہ لاجواب خدمت ہے جس سے میرے جیسے بے شمار قارئین مستفید ہو رہے ہیں۔ مجھے خاص طور پر سفرناموں سے لیا گیا انتخاب بے حد پسند ہے۔ اس کے علاوہ آغاز میں جو اقوال زریں وہ پیش کرتے ہیں وہ بے حد خاصے کی چیز ہیں۔ میری طرف سے انہیں اس قابل تحسین خدمت پر بہت شکریہ اور مبارک پہنچا دیجیے۔ ان سے ایک گزارش ہے کہ اگر وہ مختصر انتخابات کو زیادہ جگہ دیں تو اس سے قارئین کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوگا اور انہیں مواد بھی زیادہ اور متنوع مل سکے گا۔ امید ہے محترم قلندر حسین صاحب اس تجویز سے اتفاق کریں گے۔

(نعمان خان، کراچی)

☆☆

خواتین کارنر

محترم جویریہ کامران صاحبہ! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ میں خواتین کا شعبہ شروع کرنے اور اس میں معیاری مواد فراہم کرنے پر میں آپ کو اور آپ کی ٹیم کو بے حد مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس سے ہم خواتین کو بہت کچھ نیا پڑھنے کو تو ملے گا ہی ساتھ ہی اپنے پن کا احساس بھی بڑھے گا۔ کچن کارنر میں آپ کا انداز اور ترکیب بتانے کا طریقہ بہت خوب ہے۔ روایتی اور خشک انداز میں ریسیپیز بتانے کے بجائے آپ لوگ خوبصورت الفاظ کے ساتھ تراکیب بیان کرتی ہیں جو ذائقہ اور مزے میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ تمام Recipes بھی معیاری ہوتی ہیں جو آپ لوگوں کی محنت کا ثبوت ہیں۔ البتہ ایک شکوہ یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک ماہ خواتین کے کارناموں اور خدمات کے حوالے سے انٹرویوز شائع کیے اور اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا حالانکہ اس سے خواتین کو آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کی تحریک مل سکتی ہے۔ اب یہ سلسلہ جاری رکھیں بلکہ اسے مزید نمایاں کریں۔

(زاہدہ خالد، لاہور)

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

کامران امجد خان

پاک امریکہ تعلقات فیصلہ کن موڑ پر

امریکہ اور پاکستان کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات اب تشویشناک صورتحال اختیار کر گئے ہیں۔ دونوں طرف طویل خاموشی اور اپنے اپنے مؤقف کو لے کر ڈٹے رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فریقین اب ایک دوسرے سے ڈپلومیسی کے بغیر صاف بات کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ سے مفادات پر مبنی رہے ہیں۔ سابق سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں جنگ سے شروع ہونے والے یہ تعلقات دونوں ممالک کے لیے کسی نہ کسی طرح سودمند رہے اور باہمی مفادات کے حصول کی خاطر دونوں ممالک نے اختلافات کو پس پشت ڈالے رکھا۔ تاہم اب حالات ایسے موڑ پر آپہنچے ہیں کہ امریکہ اب کھلے عام پاکستان اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کو دہشت گردوں سے رابطے اور ان کی امداد کا مجرم قرار دے رہا ہے۔ جبکہ پاکستان کو امریکی ایجنٹوں کی مشکوک سرگرمیوں اور اتحادی قرار دینے کے باوجود ہزیمت آمیز روسیہ پر تحفظات ہیں۔

امریکہ سے تعلقات میں بگاڑ کی ابتداء ریمنڈ ڈیوس کے واقعہ سے ہوئی تھی۔ اس وقت تک پاکستانی ایجنسیاں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھیں کہ سی آئی اے کے اہلکار پاکستان میں انتہائی خطرناک خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور اس بات کے باقاعدہ ثبوت موجود تھے۔ ریمنڈ ڈیوس مقامی سی آئی اے چیف تھا اور اس پر پاکستانی ایجنسیاں کافی دیر سے نظر رکھے ہوئے تھیں۔ ریمنڈ کی گرفتاری اور رہائی تک پاک امریکہ تعلقات میں دراڑیں واضح ہوگئی تھیں۔ ریمنڈ کے معاملے میں پاکستان کا سٹینڈ اور امریکی دباؤ کے باوجود ایک مخصوص وقت تک امریکہ کو زچ کیے رکھنا امریکہ کے لیے ایک دھچکا

اور حیرت انگیز امر تھا۔ امریکہ نے اس کا بھرپور جواب دینے کا فیصلہ کیا اور کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن کے خلاف خفیہ آپریشن اسی ہزیمت کا جواب تھا اور اسی سے واضح ہوگیا تھا کہ مفادات میں ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے۔

تعلقات میں موجودہ تناؤ کا باعث حقانی نیٹ ورک کو قرار دیا جارہا ہے۔ یہ نیٹ ورک القاعدہ کے سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور اس کا توڑ کرنے کے لیے امریکہ نے خود ہی تشکیل دیا تھا اور پاکستانی ایجنسیوں کی مدد سے امریکہ ایک عرصہ تک اس نیٹ ورک کو خود بھی سپورٹ کرتا رہا ہے مگر یکایک یہ نیٹ ورک امریکہ کے لیے ایک دہشت گرد تنظیم بن گیا۔ اور اب تو یہ نیٹ ورک پاکستان سے تعلقات میں تناؤ کا باعث بھی بن گیا ہے۔ اس کی وجہ گزشتہ دنوں کابل میں امریکی سفارت خانے پر ہونے والا ایک حملہ تھا۔ یہ حملہ بالکل اسی نوعیت کا تھا جیسے پاکستان میں پی این ایس نیوی بیس اور لاہور کے مناواں پولیس سنٹر پر ہوا تھا۔ بالکل ویسے ہی ٹرینڈ حملہ آور اور اسی نوعیت کے منظم بھر دہشت گردوں نے کئی گھنٹے امریکہ کے ٹرینڈ فوجیوں کو ان کے ہیڈکوارٹر میں الجھائے رکھا اور جدید ترین ہتھیاروں اور تمام تر ذرائع کے باوجود امریکی فورسز کو ان دہشت گردوں سے چھٹکارا پانے میں گھنٹوں لگ گئے۔ اس حملے اور اس بڑی ہزیمت کے خلاف امریکی عوام اور ذرائع ابلاغ چیخ اٹھے اور یہ سوال اٹھانے لگے کہ دس سال افغانستان میں رہنے کے باوجود امریکہ نے وہاں کیا حاصل کیا ہے۔ سینکڑوں فوجی مروانے کے باوجود وہ اپنے ہیڈکوارٹر کو بھی محفوظ نہیں بنا سکا۔

امریکی انتظامیہ اور پینٹاگون نے اس ساری صورتحال سے بچنے کے لیے سارا الزام پاکستان پر دھرنے کا فیصلہ کیا اور توپوں کا رُخ پاکستان کی طرف کر دیا۔ اس حملے کو حقانی نیٹ ورک کی کارستانی قرار دیا گیا اور اس کے پیچھے پاکستانی ایجنسیوں کے ملوث ہونے کا الزام لگا دیا گیا۔ اب امریکہ کا مطالبہ ہے کہ پاکستان حقانی نیٹ ورک کے خلاف فوری کارروائی کرے اور چونکہ اس نیٹ ورک کے تانے بانے پاکستان میں وزیرستان سے ملتے ہیں لہٰذا وہاں فوری آپریشن کیا جائے یا امریکہ کو حملوں کی اجازت دی جائے۔

پاکستان اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے اور پاک فوج کو جن چیلنجز کا سامنا ہے اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ کوئی نیا محاذ کھول لے لیکن امریکہ ہر حال میں شمالی وزیرستان میں آپریشن پر پاک فوج کو مجبور کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے انکار کی وجہ سے امریکہ نے پاکستان کی فوجی امداد روک لی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو بھی مزید قرضہ دینے سے روک دیا ہے اور عالمی سطح پر پاکستان کو تنہا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس حوالے سے ایک تشویشناک خبر یہ ہے کہ امریکہ اور بھارت مل کر افغانستان کے ساتھ سٹریٹجک معاہدے کر رہے ہیں جن کا مقصد پاکستان کے خلاف کارروائیاں کرنا اور افغانستان میں

www.urdukorner.com

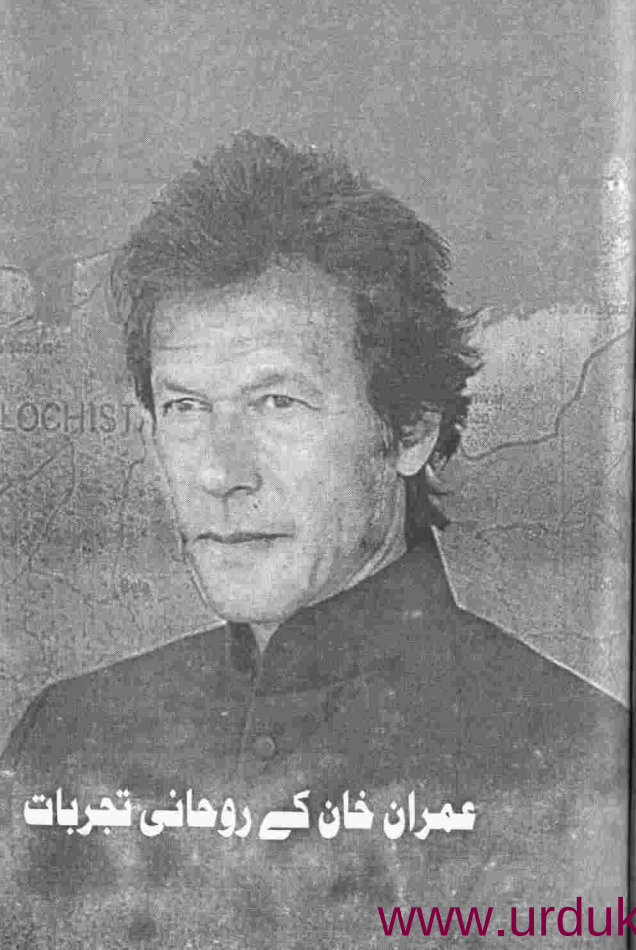

پاکستان کے اثر و رسوخ کو ختم کر کے اس کے خلاف محاذ کھڑا کرنا ہے۔ امریکی حکام اب کھلے عام پاکستانی فوج کو دہشت گردوں کا مددگار قرار دے رہے ہیں اور امریکی صدر سمیت تمام امریکی عہدیدار پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک بریفنگ میں امریکی وزیر دفاع لیون پنیٹا نے اس بات کا اعتراف کیا کہ سی آئی اے پاکستان میں دہشت گردوں کے خلاف خفیہ آپریشن کر رہی ہے۔ انہوں نے ان خفیہ سرگرمیوں کی تفصیل بیان نہیں کی مگر یہ واضح ہے کہ اب بھی امریکی اہلکار پاکستان میں سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کی جڑیں کہاں تک پہنچ چکی ہیں یہ کسی کو معلوم نہیں۔

دونوں ممالک کے تعلقات اب ایک فیصلہ کن موڑ پر ہیں اور آئندہ آنے والے دنوں میں یہ واضح ہو جائے گا کہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات کا مستقبل کیا ہوگا۔ اب تک پاکستانی فوج نے ایک جرأتمندانہ موقف اختیار کر رکھا ہے۔ یہ امریکی غلامی سے نجات کا ایک اہم موقع بھی ہے جسے ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیے۔

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

میں اور میرا پاکستان۔۔۔عمران خان

ایڈیٹر

عمران خان.....اس وقت پاکستانی قوم کیلئے امید کی کرن بنے ہوئے ہیں۔ کرپٹ سیاستدانوں سے تنگ عوام عمران کو تبدیلی کا مرکزی کردار تصور کر رہے ہیں۔ کبھی وہ ایک سپورٹس مین اور سٹار کے طور پر پاکستانی عوام کے دلوں پر راج کرتے تھے، پھر اُن کی شخصیت تبدیل ہوئی اور وہ اپنے ساتھ پاکستانی قوم کی تقدیر بدلنے کا عزم لیکر سیاست کے میدان میں اُترے اور اپنے حوصلے، ہمت، جرأت، شفاف کردار اور کرپشن سے پاک ریکارڈ کے باعث پاکستانیوں کی اُمیدوں کا مرکز بن گئے۔ عمران خان کی شخصیت میں تبدیلی کے پس پردہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کی زندگی، اس کے عمل و کردار، شخصیت اور سوچ کو یکسر تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ ایسے تجربات ہوتے ہیں جن کے اثرات انسان کی ساری زندگی پر محیط رہتے ہیں اور ان سے انسان کی منزل اور اس کے مقاصد طے پاتے ہیں۔ عمران خان بھی کچھ ایسے روحانی تجربات سے گزرے ہیں جو ان کی شخصیت میں تبدیلی اور انہیں ایک مختلف انسان بنانے کا باعث بن گئے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''میں اور میرا پاکستان'' انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ ہم اس کتاب سے چند اقتباسات شائع کر رہے ہیں جن میں خاص طور پر ان کے روحانی تجربات شامل ہیں تاہم ان کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کتاب برطانیہ کے مشہور اشاعتی ادارے BANTAM PRESS نے شائع کی ہے۔ پاکستان میں اس کے ڈسٹری بیوٹر ریڈنگ بکسز لاہور اور لبرٹی بکس کراچی ہیں۔ ہم اس کتاب کے ناشر اور ڈسٹری بیوٹر کے ممنون ہیں اور سیارہ ڈائجسٹ میں کچھ اقتباسات شائع کرنے کا مقصد اس کتاب کا تعارف ہے۔

عمران خان کے روحانی تجربات

☆پہلا روحانی تجربہ

''چودہ برس کی عمر میں مجھے پہلا روحانی تجربہ ہوا، جب میں مذہب اور خدا کے بارے میں تشکیک کا شکار تھا۔ میری والدہ اپنی بیرجی کی لاہور میں ہمارے گھر پہلی اور آخری بار آمد کی وجہ سے بہت زیادہ پرجوش تھیں۔ انہوں نے مجھے اس بزرگ خاتون سے متعارف کرایا تاکہ وہ مجھے دعائیں اور راہنمائی دے سکیں۔ وہ خاتون فرش پر اپنی تین چار مریدنیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ان کا چہرہ چادر سے ڈھکا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی امی نے ان کا چہرہ دیکھا۔ چند منٹ وہ خاموش رہیں اور پھر اچانک کہا کہ میں نے ناظرہ مکمل طور پر نہیں پڑھا۔ میں بالکل ششدر رہ گیا۔ میں نے قرآن پاک ختم نہیں کیا تھا مگر اس کے بارے میں صرف مجھے پڑھانے کے لیے آنے والے مولوی صاحب جانتے تھے۔ مجھے قرآن پاک کی تعلیم سکول سے آنے کے بعد دی جاتی تھی اور اس وقت میں قرآن پاک پڑھنا بالکل نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت میری بس یہی خواہش ہوتی کہ زمان پارک میں اپنے کزنوں کے ساتھ کھیلوں۔ ایک سال بعد بیچارے مولوی صاحب نے یہ جان لیا کہ میں ایک لاعلاج مسئلہ ہوں اور ہم نے ایک دن مل کر منصوبہ بنایا کہ

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

میرے والدین کو بتا دیا جائے کہ میں نے قرآن پاک ختم کر لیا ہے۔

پیر جی کے حقیقت بتانے کے بعد میری والدہ نے میری طرف دیکھا اور میرے حیران زدہ چہرے سے اس بات کو پا لیا کہ ان کی پیر جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پیر جی نے میری والدہ کو بتایا کہ پریشانی کی ضرورت نہیں کیونکہ میں ایک نیک روح ہوں اور بالکل درست ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنی والدہ کے چہرے پر اطمینان کا سانس دیکھا۔ پیر جی نے یہ بھی کہا کہ میں ایک مشہور انسان بنوں گا اور میری والدہ کا نام ایک جانا پہچانا نام بنے گا، اکیس برس بعد جب میری والدہ کینسر کی وجہ سے دم توڑ گئیں تو میں نے ان کے نام پر شوکت خانم میموریل ہسپتال قائم کیا جو کہ آج گھر گھر میں جانا پہچانا نام ہے۔''

☆بابا جھلا کی درست پیش گوئی

1987ء کے ورلڈ کپ سیمی فائنل میں شکست کے بعد عمران خان نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد وہ دوستوں کے ہمراہ لاہور کے سرحدی علاقے کے قریب شکار کے لیے گئے جس سے فراغت کے بعد ان کے میزبان نے انہیں ایک روحانی پیر سے ملنے کی ترغیب دی۔ اس واقعہ کے بارے میں عمران لکھتے ہیں ''شکار کے بعد ہمارے میزبان نے تجویز کیا کہ مجھے اس روحانی بزرگ سے ضرور ملنا چاہیے جو میرے گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں آنے والے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ مجھے اس کام کا کوئی خاص مصرف نظر نہیں آیا لیکن اوروں کے اصرار پر میں ان سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔ آدمی جس کا نام بابا جھلا تھا وہ لاہور کی سرحد سے چند میل پرے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کا قد چھوٹا، تیکھی نگاہیں اور پر حمکنت چہرہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں کیونکہ گاؤں میں کسی کے پاس ٹی وی نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی ایسا شخص دکھتا تھا جس کی کرکٹ میں دلچسپی ہو۔ اس نے یقینی طور پر میری ریٹائرمنٹ کے بارے میں نہیں سنا ہوگا۔ باوجودیکہ یہ خبر شہ سرخیوں میں شائع رہی۔ میرے میزبان نے پوچھا کہ مجھے ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ آدمی نے میری طرف نظر پھیری اور کہا کہ میں نے اپنا پروفیشن نہیں چھوڑا۔ سب نے اسے یہی بتایا کہ میں کرکٹ سے ریٹائر ہو چکا اور دوبارہ کھیلنے کا کوئی ارادہ نہیں مگر اس نے زور دے کر کہا یہ اللہ کی مرضی ہے کہ تم ابھی بھی کھیل میں ہو۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میری کتنی بہنیں ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔''

اس کے بعد عمران نے لکھا ہے کہ بابا نے ان کے دوست محمد صدیق کے کاروبار سے متعلق بھی باتیں بالکل درست بتا دیں۔ ان باتوں نے عمران اور ان کے دوستوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس واقعہ کے تین ماہ بعد ضیاء الحق نے قومی ٹیم کو دیئے گئے ایک عشائیہ میں جنرل ضیاء الحق نے عمران خان کو ملک کی خاطر ریٹائرمنٹ واپس لینے اور پاکستان کی کپتانی کے لیے کہہ دیا۔ ایک ہفتے بعد

www.urdukorner.com

ویسٹ انڈیز کے دورے کے لیے عمران ٹیم کی قیادت کر رہے تھے اور ان کے دوست کا کاروبار بھی بابا جھلا کی پیش گوئی کے عین مطابق رُخ اختیار کر رہا تھا۔

☆وہ جس نے عمران کی زندگی کا دھارا بدل دیا

عمران خان پر جس روحانی شخصیت کا سب سے زیادہ اثر رہا وہ میاں بشیر ہیں۔ اس کتاب میں عمران خان نے ان کے حوالے سے بہت سی باتیں بیان کی ہیں۔ کرکٹ، کینسر ہسپتال کی تعمیر، سیاست، بوتھم سے بال ٹمپرنگ کے مقدمے سمیت کئی معاملات میں ان کے روحانی کمالات کا ذکر کیا ہے۔ عمران خان کی کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے میاں بشیر کی روحانی شخصیت کو سمجھنے اور عمران خان پر ان کے اثر کی بابت پڑھنے والوں کو خاصی معلومات ملیں گی۔ عمران خان لکھتے ہیں:

''میری ایک ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کے بارے میں میں کہنا چاہوں گا کہ مجھ پر ہونے والا وہ واحد انتہائی طاقتور روحانی اثر تھا جس نے میری زندگی کا رُخ مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ لاہور میں ایک دوست نے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ وہاں پر ایک تیرے صاحب بھی تھے جو دبلے پتلے اور کلین شیو تھے۔ ساٹھ کے پیٹے کے ان صاحب کا نام میاں بشیر تھا۔ ان کے چہرے پر موجود جھریوں سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں بہت سے مصائب جھیلے ہوں گے۔ وہ ایک جونیئر ریٹائرڈ سول سرونٹ تھے جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑی مشکل کے ساتھ اپنی معمولی پنشن پر گزارا کر رہے ہیں۔ کھانے کے دوران وہ صاحب بالکل خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر عدم دلچسپی کا تاثر نمایاں تھا۔ کھانے کے بعد ان صاحب نے ملائمت کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں قرآن کریم کی فلاں آیت تواتر کے ساتھ پڑھتا ہوں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو اس آیت کے بارے میں جانتا تک نہیں۔ میرے اس جواب پر وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یوں لگا جیسے وہ کسی نکتے پر مرکوز ہو چکے ہیں۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا اور کہا: ''معذرت، یہ تو تمہاری والدہ تھیں جو تمہاری حفاظت کے لیے یہ آیت پڑھتی تھیں۔'' میں حیران رہ گیا کیونکہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میری ماں قرآن کریم کی ایک آیت تین بار پڑھ کر مجھ پر پھونکا کرتی تھیں۔ ان صاحب نے مجھے کہا کہ میں اسی آیت کی وجہ سے محفوظ رہا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے میرے خاندان میں پیش آنے والے کچھ واقعات کے بارے میں بتایا جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ انتہائی ذاتی نوعیت کے واقعات تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ فن کہاں سے سیکھا جس پر ان کا جواب تھا ''یہ سب اللہ کی رضا ہے۔ بعض اوقات وہ مجھے میرے کہے بغیر کچھ

چیزیں دکھا دیتا ہے لیکن بعض اوقات میں کسی چیز کے بارے میں علم دینے کی فریاد کر کر کے تھک جاتا ہوں لیکن وہ انکار کر دیتا ہے۔''

اگلے ایک دو سال تک میں کئی مرتبہ میاں بشیر سے ملا جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری والدہ کی رہبر کی طرح وہ بہت منکسر المزاج اور بے ریا شخص تھے جو اپنی دانائی کے بارے میں عاجزی کا رویہ رکھتے تھے۔ وہ انتہائی غیر متکبر تھے اور انہوں نے مجھے بڑی مشکل سے یہ سمجھایا کہ ان کے پاس ماضی یا مستقبل میں جھانکنے کا کوئی فن نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ مراقبہ کرتے ہیں اور اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے تو وہ کبھی کبھی ''پردہ'' ہٹا دیتا

ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ ہر ملاقات میں میرا خدا کے وجود پر ایمان پختہ ہوتا گیا۔ میں اپنی والدہ کے انتقال پر بہت غصے میں تھا اور یہاں پر ایک ایسا انسان موجود تھا جو میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب حاصل کرنے میں میری مدد کر رہا تھا۔ دو تین سال کے عرصے کے دوران انہوں نے میرے ایسے کئی مسئلوں کو حل کر دیا جو میرے ایمان کی راہ میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان سے اسلام کو جس طرح سیکھا اور جس طرح مجھے سکول میں پڑھایا جاتا تھا یا جس طرح مولوی مجھے گھر میں آ کر قرآن پاک پڑھاتے تھے اس میں یہ فرق تھا کہ میاں بشیر صاحب نے

www.urdukorner.com

کبھی ظاہری مذہبی رسومات پر زور نہیں دیا۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں پانچ وقت نماز پڑھوں، رمضان میں روزے رکھوں۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں قرآن پاک پڑھوں۔ اس کے بجائے انہوں نے مجھے ان کے پیچھے جو ہے اس کے بارے میں بتایا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی کو ظاہری رسومات کے مظاہرے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے گا تو یہ محض خالی خولی رسومات ہوں گی، سب سے پہلے اندرونی تبدیلی آتی ہے۔ انہوں نے میرے اندر ایمان کی جوت جگا دی۔ بعض اوقات مجھے ان کی بات سمجھنے میں چھ چھ ماہ لگ جاتے لیکن انہوں نے مجھے کبھی جلدی کے لیے نہیں کہا۔"

عمران نے جوا کھیل کر پارٹی کا قرضہ اُتارا

"اپنے خاندان کے ساتھ میں انگلینڈ میں تھا اور میرا برادر نسبتی بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ انگلینڈ بمقابلہ جنوبی افریقہ ٹیسٹ میچ کا کیا بنے گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کی دلچسپی میچ پر اس کے شرط لگانے کی وجہ سے ہے۔ میں نے میچ دیکھنے کا فیصلہ کیا اور جانا کہ وہ پہلے ہی دس ہزار پاؤنڈ ہار چکا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مشورے دینے کے لیے مجھے میچ دیکھنا ہوگا اور اس کی ڈوبی رقم کی تلافی کے بعد جیتا جانے والا ہر پاؤنڈ میرے پارٹی قرضوں کی ادائیگی کے لیے ہوگا۔ میں نے زندگی میں کبھی جوا کھیلا نہ ہی کبھی اس طرف رغبت کی وجہ جان سکا لیکن اب کہ میں نے اپنی پارٹی کے قرضوں کو اُتارنے کے لیے دو دن بن گولڈ سمتھ کے ساتھ میچ دیکھا تاکہ اسے بتا سکوں اسے کب کیا کرنا ہے۔ میرے مشوروں کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اپنے ذمہ رقم ادا کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ میرے پاس بھی اتنی رقم آ گئی کہ پارٹی کا قرضہ اُتار سکوں۔ ایک موقع پر ایک جواری نے اس سے کہا کہ مسٹر سمتھ تم کہیں اپنے بہنوئی کے ساتھ تو نہیں بیٹھے ہوئے؟"

اپنے ساتھ انگریز بیوی نہ لانا: والدہ کی ہدایت

"جب اٹھارہ برس کی عمر میں پہلی بار انگلینڈ روانہ ہو رہا تھا تو والدہ نے مجھے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی کہ اپنے ساتھ انگریز بیوی مت لانا۔

"عمران خان نے چوبیس برس اس حکم سے سرتابی نہیں کی لیکن بالآخر جمائما سے شادی کر کے وہ نافرمانی کے مرتکب ہو ہی گئے۔ عمران خان کے دماغ میں یہ خیال ہمیشہ راسخ رہا کہ ان کی بہنوں اور کزنوں کی طرح ان کی شادی بھی ارینجڈ ہوگی لیکن وقت نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ انہیں انگریز بیوی ہی لاتے بنی اور شادی بھی ارینجڈ نہیں بلکہ پسند کی تھی۔ جمائما اور ان کی علیحدگی سے ان کی والدہ کی وہ پیش گوئی پوری ہو گئی جس میں انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کسی مغربی خاتون کو ہمارے کلچر میں

خود کو ڈھالنا ناممکن ہوگا۔ اس معاملے میں بھی میاں بشیر عمران کی مدد کو آئے اور ان کی راہنمائی کی۔ جمائما سے ملاقات سے قبل تک وہ پاکستانی لڑکی سے ہی شادی کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے لیکن جمائما سے مل کر وہ اتنا متاثر ہوئے کہ اپنا خیال بدل دیا۔ جمائما سے تعلق کی وجہ سے ان پر سیاست میں یہودی لابی کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا جبکہ عمران خان کے بقول جب انہوں نے جمائما سے شادی کی تو ان کے ذہن میں سیاست میں حصہ لینے کا بالکل بھی خیال نہیں تھا۔ عمران خان کے بقول ان سے شادی سے قبل جمائما کو پاکستانی معاشرے میں خواتین کو درپیش مشکلات کا سنا کر بہت ڈرایا گیا لیکن وہ ثابت قدم رہیں۔ جمائما پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے اشارے پر میڈیا میں اپنے خلاف بے بنیاد پراپیگنڈہ سے بہت آزردہ رہتی تھیں۔ سیاست میں بہت زیادہ مصروفیت کے باعث جمائما کو مناسب وقت نہ دینے کو عمران نے علیحدگی کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔

اقبال کے علاوہ جن اسلامی دانشوروں سے متاثر ہوئے

جدید اسلامی مفکرین میں عمران خان اقبال کی فکر سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب میں انہوں نے اقبال کے خیالات کو جس طرح سمجھا، بڑھے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کے علاوہ جن اسلامی دانشوروں کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے ان میں گائی ایٹن، محمد اسد اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن شامل ہیں۔ گائی ایٹن سوئٹزر لینڈ میں پیدا ہوئے۔ ڈپلومیٹ، صحافی اور براڈ کاسٹر رہے۔ سفارتی حیثیت سے کام کرنے سے قبل وہ معلم اور صحافی کے طور پر جمیکا اور مصر میں قیام پذیر رہے۔ مصر میں قیام کے دوران وہ مسلمان ہوئے۔ ان کا اسلامی نام سدی حسن شاذلی ہے۔ اس کی معروف کتابوں میں King of the Castle، Islam and the Destiny of Man اور The Richest Vein شامل ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب 1949ء میں اشاعتی ادارے فیبر اینڈ فیبر نے ٹی ایس ایلیٹ کی سفارش پر چھاپی۔ عمران خان نے بتایا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اسلام کے روحانی پہلو پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور مشرق اور مغرب کے درمیان پل قائم کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ گائی ایٹن کی طرح محمد اسد بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وہ بھی اتفاق

www.urdukorner.com

سے ڈپلومیٹ اور صحافی رہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی علمیت کے بھی عمران خان بہت معترف ہیں۔ وہ ان کے اس اصول سے اتفاق کرتے ہیں کہ قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اس کی آیات کو انفرادی حیثیت میں دیکھنے کی بجائے کلیت میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں آیات کو کلیت میں نہ دیکھنے کی روش سے مبلغ حضرات لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ روایتی علماء کے دباؤ پر انہیں پاکستان چھوڑنا پڑا۔ عمران خان ایوب خان کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب ان کی رجعتی کو بھی جانتے ہیں۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تین معروف کتابیں ''قرآن کے بنیادی موضوعات''، ''اسلام اور جدیدیت'' اور ''اسلام'' کا اردو میں ترجمہ عربی عالم محمد کاظم کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول ڈاکٹر فضل الرحمٰن، اقبال کے بعد اسلامی فکر کے دوسرے بڑے شارح ہیں۔

آصف علی زرداری سے واحد ملاقات

''1989ء میں کراچی میں بینظیر بھٹو کے گھر بلاول ہاؤس ملنے گیا تاکہ انہیں ہسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں تعاون کا کہہ سکوں۔ بینظیر مصروف تھیں اس لیے ہمیں آصف علی زرداری سے ملنے کا موقع دیا۔ آکسفورڈ میں بینظیر کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے میں توقع کر رہا تھا کہ مجھے ہمدردانہ سنا جائے گا۔ آصف زرداری میرے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے اور میری نمائشی تعریف کرتے رہے۔ تاہم انہوں نے مجھے کسی مدد کی پیشکش نہ کی بلکہ اس کی بجائے وہ میرے ہمراہ جانے والے دوست طارق شفیع سے زیادہ دیر محو کلام رہے۔ طارق کا تعلق پاکستان میں ٹیکسٹائل انڈسٹری کے بڑے گھرانوں سے تھا، زرداری اسے پیپلز پارٹی کے گڑھ سندھ میں دو فیکٹریاں لگانے کا کہتے رہے، ان کا کہنا تھا کہ وہ صوبے میں کچھ لوگوں کو روزگار مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہسپتال کے لیے مستقبل میں کبھی بھی بینظیر اور نہ ان کے شوہر کی طرف سے کسی قسم کی مدد کی گئی۔ شوکت خانم کے افتتاح کے موقع پر بینظیر اور آصف علی زرداری نے ہسپتال کے افتتاح کی خواہش ظاہر کی جو مجھے قبول نہیں تھی کیونکہ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ یہ افتتاح ہسپتال کی پہلی کینسر مریضہ غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی 10 سالہ سمیرا یوسف کریں گی۔''

عمران خان کے متفرق خیالات کی جھلکیاں

☆''پاکستان نژاد برطانوی صحافی طارق علی کے برعکس ہمارے ہاں بائیں بازو کا میڈیا اور طبقہ دانشوراں پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق کی بہت سی خلاف ورزیوں پر سٹینڈ لینے میں ناکام رہا۔ اس کے پیچھے بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ حقیقی طور پر سمجھتے اور محسوس کرتے تھے کہ پاکستان میں طالبانائزیشن کا ممکنہ خطرہ ڈرون حملوں اور پاکستان فورسز کے قبائلی علاقوں میں آپریشن کے

باعث انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ وہ صحافی اور کالم نویس جو پہلے خود کو سامراج مخالف لبرل کے طور پر متعارف کراتے تھے اچانک دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارے ہتھیار ڈالنے کے حمایتی بن گئے۔ ان کی پاکستان کی خودمختاری کو درپیش خطرے اور اپنے ہم وطنوں پر بمباری پر خاموشی حیران کن تھی۔ این جی اوز نے اس ضمن میں کچھ نہیں کیا کہ ان کو مغربی ڈونرز فنڈ دیتے ہیں۔ بڑی سیاسی جماعتیں اس لیے خاموش رہیں کیونکہ وہ امریکہ کی حمایت کھونے سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس صورتحال میں میری پارٹی اور مذہبی جماعتیں ہی باقی بچی تھیں جنہوں نے سٹینڈ لیا۔''

☆''اقبال جن تاریخی حالات میں رہتے تھے، وہ کئی اعتبارات سے آج سے مختلف تھا تاہم جو کچھ انہوں نے کہا وہ ہم سے اور ہمارے عہد سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے۔ حقیقت میں اقبال کا پیغام ماضی اور حال کے کسی بھی دوسرے مسلمان مفکر سے آج زیادہ متعلقہ اور اہم ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے روایتی اور جدید دونوں قسم کے چیلنجز کا سامنا کیا بلکہ زیادہ اہم طور پر یہ کہ وہ قرآن پاک جس کو انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد بنایا تھا اس کے اجتماعی تصور کا واضح ادراک رکھتے تھے۔ اقبال کی چند معروف نظموں کو زیادہ تر اگ سے پڑھا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری کا بنیادی پیغام، جو ان کی انقلابی روح کا عکاس، بے خوف تخیل اور انصاف کے لیے پرجوش وابستگی اور خودشناسی کی عظمت سے بھرپور ہے، اس کو عوامی حلقوں سے دور رکھا گیا۔ اقبال کے خیال میں اسلامی دانشورانہ فکر کو گھن لگنا اور زوال آج سے پانچ سو سال قبل اس وقت شروع ہوا جب اجتہاد، جس کا مطلب ہے مذہب اور اس سے جڑی روایات کے بارے میں دانشورانہ غور وفکر ہوتا ہے، کے دروازے بند کیے گئے۔''

☆''پاکستان کے مغرب زدہ طبقہ کا ایک حصہ ایسا موجود ہے جو محض سیکولر نہیں بلکہ دراصل اسلام مخالف ہے اور وہ ملایا بنیاد پرستی کو اسلام پر حملے کے لیے علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سابق ترک وزیراعظم نجم الدین اربکان نے ترکی میں اسلام مخالف اشرافیہ کے بالکل ایسا ہی رویے کے متعلق گفتگو کی تھی، ایک انٹرویو میں انہوں نے بیان کیا کہ ترک پارلیمنٹ میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر لبرل لوگ شور مچاتے اور تضحیک کے طور پر ڈیسک پیٹتے تھے۔''

بینظیر بھٹو سے پہلی ملاقات کا قصہ

''بینظیر سے میں پہلی بار اس وقت ملا جب وہ ایسے شخص کے چیتھڑے اُڑا رہی تھیں جس نے ان کے سوشلسٹ ہونے کی معتبری کے بارے میں سوال کی جرأت کی تھی۔ آکسفورڈ میں طالبعلم کی حیثیت سے میرا ضیاء ملک کے ساتھ ایک گھر میں مشترکہ قیام تھا۔ ایک روز جب میں گھر پلٹا اور گھر کے باہر موٹر سائیکل کو تالا چڑھا رہا تھا تو بہت کرتی خاتون کی آواز میں سن سکتا تھا۔ ضیاء ملک نے

www.urdukorner.com

آکسفورڈ سے تعلق رکھنے والے دوسروں پاکستانیوں سے بینظیر کو ملوانے کے لیے بلایا تھا تاہم وہ یہ بات کر کے مؤثر زرعی اصلاحات کو سندھ میں پورے طور پر نافذ نہیں کیا گیا خود ہی مہمان کو مشتعل کر چکا تھا۔ لازمی طور پر یہ بینظیر بھٹو کے لیے حساس موضوع تھا، جس کے والد نے 1972ء میں محدود زرعی اصلاحات کے ساتھ جاگیرداروں کی طاقت کو کم کرنے کی علامتی کوشش کی تھی۔ میں نے بینظیر کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی اور اس پہلی ملاقات کے بعد ہم اچھے دوست بن گئے۔ بینظیر انگریزوں کے ساتھ نرم خو اور پاکستانیوں کے ساتھ حاکمانہ رویہ روا رکھنے کی شہرت رکھتی تھیں۔ 1974ء میں جب ان کی عمر تقریباً 20 برس تھی، میں نے انہیں ہالینڈ میں پاکستانی سفارتخانے میں کرکٹ ٹیم کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں دیکھا، وہ ادھر موجود سفیر پر ایسے حکم جما رہی تھیں جیسے وہ ان کا ذاتی ملازم ہو۔ یہ بھی بالکل واضح ہے کہ بینظیر دور جوانی سے ہی جاہ پسند تھیں۔ وہ میرے آکسفورڈ چھوڑنے کے ایک سال بعد تک ادھر رہیں، میرا ہمیشہ یہ مفروضہ رہا ہے کہ انہوں نے ایسا اس واسطے کیا کہ وہ آکسفورڈ یونین کی صدر بننے کے لیے پرعزم تھیں۔"

ویسٹ انڈیز کے فاسٹ بولرز اور بغیر ہیلمٹ نواز شریف

1987ء کے خزاں میں ہونے والا ایک واقعہ نواز شریف کے مائنڈ سیٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ ورلڈ کپ سے ذرا پہلے اکتوبر 1987ء میں جب میں ٹیم کا کپتان تھا، ہم نے ویسٹ انڈیز کے خلاف قذافی سٹیڈیم لاہور میں وارم اپ میچ کھیلا۔ میچ سے چند لمحے قبل کرکٹ بورڈ کے سیکرٹری شاہد رفیع نے مجھے بتایا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب آج پاکستان ٹیم کی قیادت کریں گے۔ میں حیران ہوا لیکن پھر خود ہی تصور کر لیا کہ ان کا کھیل میں نا شریک قسم کا کردار ہو گا اور وہ ڈریسنگ روم میں بیٹھ کر میچ دیکھیں گے لہٰذا جب میں نے انہیں کرکٹ کے سفید لباس میں ملبوس ویسٹ انڈین کپتان ویوین رچرڈ سے ٹاس کرنے جاتے دیکھا تو حیران رہ گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی کا آنا ابھی باقی تھا۔ وہ ٹاس جیت گئے اور واپس آکر لگے اپنے پیڈ باندھنے۔ ٹیم میں کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا جو وہ دیکھ رہے تھے، نواز شریف کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین بولنگ اٹیک کے خلاف مدثر نذر کے ساتھ اوپننگ کرنے جا رہے تھے۔ مدثر نے بیٹنگ پیڈ، تھائی پیڈ، چیسٹ پیڈ، آرم گارڈ، ہیلمٹ اور گلووز پہنے ہوئے تھے جبکہ نواز شریف نے محض بیٹنگ پیڈ اور فلاپی ہیٹ پہنا اور چہرے پر مسکراہٹ کو ساتھ رکھا۔ وہ لوگ جو کرکٹ کی تاریخ سے آگاہ نہیں، ان کے لیے یہ جاننا اہم ہو گا کہ یہ ایسا بولنگ اٹیک تھا جو دنیائے کرکٹ نے اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں، نوے کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار والے چار بولرز، یہ تھا ویسٹ انڈیز کا تہلکہ خیز بولنگ اٹیک، جس نے بہت سے باصلاحیت کھلاڑیوں کا کیریئر تباہ کر ڈالا۔ بین الاقوامی بیٹسمین اور پروفیشنل کرکٹرز کی راتوں کی نیند اُڑ [illegible] انہیں ان بولرز کا [illegible] کا

مرحلہ درپیش ہوتا اور یہ نواز شریف تھے جو اس سطح کی کرکٹ کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے اور چلے تھے بغیر حفاظتی سامان پہنے اس مہلک بولنگ کا سامنا کرنے۔ چھ فٹ چھ انچ کے ویسٹ انڈین بولر نے پہلی گیند پھینکی تو ہم نے دیکھا کہ اس سے پہلے کہ نواز شریف بلا اُٹھاتے، گیند وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔ ٹیم نے اس پرسکون کا سانس لیا۔ نواز شریف کے حق میں بہتر یہ ہوا کہ دوسری گیند سیدھی پڑی اور اس سے قبل کہ وہ حرکت میں آتے، وکٹیں زمین پر بکھر چکی تھیں۔"

اسے شکست نہیں دی جا سکتی

"بوڑھا اور سمندر" نوبل انعام یافتہ امریکی لکھاری ہیمنگ وے کا شہرۂ آفاق ناول ہے۔ اس ناول میں ایک بوڑھے مچھیرے کی کہانی بیان ہوئی ہے جو کئی روز مچھلی جال میں نہ آنے کے باوجود امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور اپنی دھن میں مگن کام میں جتا رہتا۔ ایک مقام پر بوڑھا جس کا نام سانتیاگو ہے، ایسا فقرہ کہتا ہے جو انسانی عزم و ہمت کے واسطے ایک منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ "انسان شکست کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ انسان کو فنا تو کیا جا سکتا ہے، اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔"

وہ شخص جس کا قصۂ حیات ہم اس کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب کی مدد سے سنانے جا رہے ہیں، اس کی تمام زیست ہیمنگ وے کے مذکورہ بالا فقرے کی عملی تجسیم نظر آتی ہے۔ یہ صاحب عمران خان ہیں جنہیں بلا خوف تردید پاکستان کا سب سے معروف چہرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست میں وارد ہونے سے قبل عمران خان کی شخصیت کے دو بنیادی حوالے تھے۔ اول کرکٹ اور دوم شوکت خانم میموریل ہسپتال۔ اور سماجی راہنما کی حیثیت سے وہ جس مقام بلند پر فائز ہیں اس تک جن حالات سے گزر کر وہ پہنچے ہیں، انہیں جان کر اس علو ہمت شخص کے حوصلے اور عزم کی داد دینا پڑتی ہے اور آدمی بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، ہمت کرے انسان تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا۔ کرکٹ سے دلچسپی بچپن میں ہی قائم ہو گئی تھی، دو کزن پاکستان کرکٹ ٹیم کا حصہ تھے۔ کپتان بھی رہے۔ عمران خان نو برس کی عمر میں والدہ کے ہمراہ لاہور میں پاکستان اور ایم سی سی کا میچ دیکھنے گئے جس میں ان کے کزن جاوید برکی نے سنچری سکور کی تھی، اسی دن انہوں نے قصد کر لیا کہ انہیں بہرصورت ٹیسٹ کرکٹر بننا ہے۔ اس ارادے کے بعد انہیں کبھی یہ شک نہ گزرا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی نہیں کریں گے۔ عمران خان نے یہ بات اس کتاب میں شامل نہیں کی لیکن وہ اپنے ایک انٹرویو میں بتا چکے ہیں کہ انہیں بچپن میں ہمیشہ یہ احساس دلایا گیا کہ کرکٹ میں وہ اپنے دونوں کزنوں سے کمتر صلاحیت کے حامل ہیں۔ پہلے پہلے ٹیسٹ میں بری طرح ناکامی کے بعد، ان کے ساتھی کھلاڑی یہ کہتے پائے گئے کہ وہ آئندہ انٹرنیشنل کرکٹ کا خیال دماغ سے رفع کر دیں۔ ایسی باتوں سے وہ بددل نہیں ہوئے اور جلد ہی کرکٹ میں اپنا نام اور مقام بنا لیا۔ انگلینڈ میں ڈینس للی کی تیز رفتار بولنگ کے کمالات

www.urdukorner.com

دیکھ کر ایسے سحر زدہ ہوئے کہ میڈیم پیسر سے فاسٹ بولر بننے کی تمنا جاگی۔ عمران خان لکھتے ہیں:
''1972ء میں پہلی بار فاسٹ بولر ڈینس للی کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور اس کی تقلید کرنا میری اُمنگ بن گئی۔ سینئر کھلاڑی اور ورسسٹر شائر میں میرے کوچ مصر رہے کہ نہ تو میری جسمانی ساخت اور نہ ہی میرا بولنگ ایکشن ایسا ہے کہ میں فاسٹ بولر بن سکوں اور اگر میں نے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کی تو میں اپنا کیریئر تباہ کر لوں گا۔ یہ آئیڈیل ازم ہی ہے جس نے مجھے خطرات مول لینے کی جرأت عطا کی۔ میں نے فاسٹ بولر بننے کے لیے نہ صرف اپنا بولنگ ایکشن تبدیل کیا بلکہ فاسٹ بولنگ کرنے کے لیے میرا جسم اور بھی زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی کرکٹ میں کوئی دوسرا نہیں جس نے میری طرح مکمل طور پر بولنگ ایکشن تبدیل کیا ہو۔'' یہ تو کرکٹ کے ابتدائی دور کی ایک مثال ہے، ان کے عزم و ہمت کی داستان کیریئر کے آخری دنوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ 1992ء ورلڈ کپ میں پے در پے ناکامیوں کے بعد ان کی قیادت نے جس حیران کن انداز میں ٹورنامنٹ میں واپس آ کر کامیابی اپنے نام کی وہ کرکٹ کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ کرکٹ میں ان کی کامیابیوں کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ بھارت اور انگلینڈ کو ان کی سرزمین پر چت کرنا اہم کارنامہ ہی سہی لیکن جس کارنامے کو وہ کرکٹ میں اپنا سب سے اہم کارنامہ تصور کرتے ہیں وہ ویسٹ انڈیز کی ٹیم سے مسلسل تین سیریز برابر کرنا ہے۔ 1988ء میں پاکستان پندرہ برسوں میں ویسٹ انڈیز کی سرزمین سے سیریز ہارے بغیر لوٹنے والی پہلی ٹیم تھی۔ ویسٹ انڈیز کے امپائرز اگر بے ایمانی نہ کرتے تو پاکستان یقینی طور پر یہ سیریز اپنے نام کر لیتا۔ اس دور میں عمران خان کے بقول ویسٹ انڈیز سے جیت کے لیے سوچا ہی نہ جاتا تھا بلکہ قابل عزت شکست کی فکر کی جاتی۔ کرکٹ کے بعد عمران کا دوسرا کارنامہ شوکت خانم میموریل ہسپتال کا قیام ہے۔ پاکستان جنوبی ایشیا کا پہلا ملک ہے جہاں پر کینسر ہسپتال قائم ہوا۔ یہ معجزہ کس طرح رونما ہوا، اس کے پیچھے کیا کہانی ہے اس کا مختصر احوال اس کتاب کی مدد سے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

عمران خان شوکت خانم میموریل ہسپتال کے بورڈ آف گورنرز تشکیل دے چکے تو لاہور میں چوٹی کے بیس ڈاکٹروں کا اجلاس بلایا تاکہ ان کی آراء کی روشنی میں پیش قدمی کی جا سکے۔ اس اجلاس کا نتیجہ نہایت مایوس کن رہا۔ عمران لکھتے ہیں: ''ایک کے سوا تمام ڈاکٹروں کے خیال میں پاکستان میں قطعی طور پر یہ منصوبہ قابل عمل نہیں۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ یہ ممکن ہے لیکن ایسا راستہ نہیں ہے کہ ہم غریبوں کا مفت علاج کرنے کے قابل ہو سکیں کیونکہ کینسر کے مریض پر اوسط لاگت بہت زیادہ ہے۔ اس اجلاس کے بعد ہمارا مورال ڈاؤن ہو گیا۔ اس صورتحال سے نمٹنے کا میرے پاس کوئی تصور نہیں تھا۔ میں اس منصوبے [illegible] دامن نہیں چھڑا سکتا تھا، ک[illegible]رف میں کھلے عام اس بارے میں اعلان کر

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

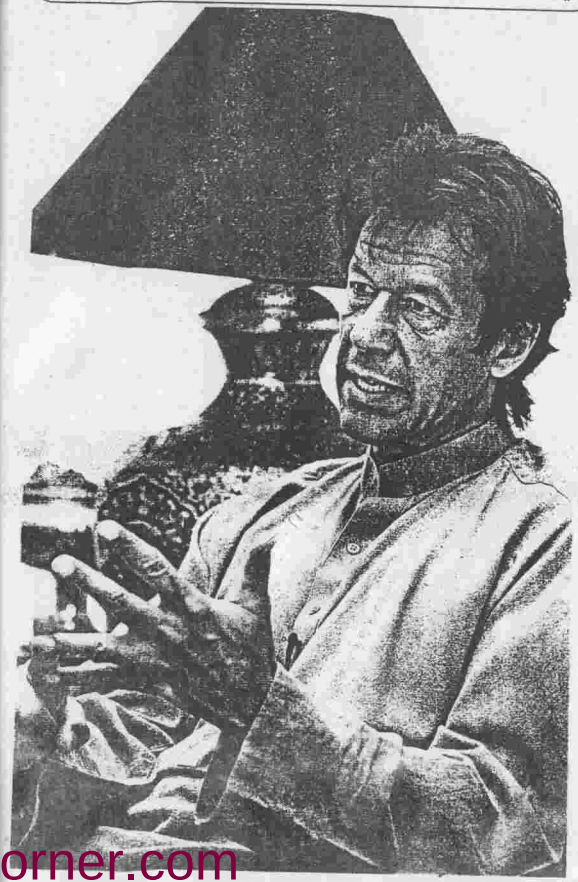

چکا تھا بلکہ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں پہلے ہی رقوم اکٹھی کرنا شروع کر چکا تھا۔ میرے کزن، کرکٹر جاوید برکی نے تجویز کیا کہ مجھے والدہ کے نام پر ڈسپنسری قائم کر کے، اس خیال کو تج دینا چاہیے۔ میری بہنیں جو میرے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتی تھیں انہوں نے مجھے منصوبہ ترک کرنے کا کہا، ان کے خیال میں وگرنہ میں کرکٹ سے ملنے والی ساکھ اور عزت سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا لیکن اب تاخیر ہو چکی تھی اور اگر میں ایسا کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں لوگوں کے عطیات کس طرح واپس کر سکتا تھا؟ مایوسی کے ان دنوں میں پاکستان ایسوسی ایشن آف ڈاکٹرز نارتھ امریکہ کے ڈاکٹروں کے ساتھ اجلاس نے مجھے امید دلائی۔'' عمران خان اب تھوڑے مطمئن تھے لیکن کچھ عرصہ بعد اندازہ ہوا کہ منزل ابھی بہت دور ہے۔ اس صورتحال میں ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام میں تائید ایزدی کو دخل کس قدر تھا۔ نیویارک میں کینسر سپیشلسٹ ڈاکٹر توصیف سے ہسپتال کی تعمیر میں حائل رکاوٹوں کا ذکر ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے انہیں بتایا کہ کینسر ہسپتال کی تعمیر کے لیے ایک ڈاکٹر ایسا ہے جو آپ کے بہت زیادہ کام آ سکتا ہے۔ جس ڈاکٹر کا نام انہوں نے تجویز کیا وہ کوئی اور نہیں عمران خان کے کزن ڈاکٹر نوشیرواں برکی تھے۔ وہ اب اس پراجیکٹ سے وابستہ ہو گئے اور اپنے فرائض کو کمال ذمہ داریوں کے ساتھ نبھایا۔ عمران خان نے کتاب میں ہسپتال کے لیے ان کی خدمات کو بڑے اچھے لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کینسر ہسپتال کی تعمیر کے دوران عمران خان کو بہت سی ایسی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا جن سے وہ پہلے احتراز کرتے۔ مثلاً زندگی بھر اپنے والد سے پیسوں کا تقاضا کرنے سے گریزاں رہے لیکن مشن کی تکمیل کے لیے اب جگہ جگہ پیسے مانگنے پر مجبور ہوئے۔ دولت کے مل بوتے پر مشہور لوگوں سے میل جول کے خواہش مند حضرات کے دعوت نامے وہ ٹھکرا دیا کرتے تھے لیکن اب انہیں یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا۔ کینسر ہسپتال کے لیے بعض ناپسندیدہ صحافیوں کے سامنے بچھ کا پتلا بننا بھی ان کے لیے ذہنی اذیت کا باعث رہا کیونکہ ایک متنی مضمون سے کینسر ہسپتال کو لاکھوں روپے کی امداد سے محروم ہونا پڑ سکتا تھا۔ کینسر ہسپتال کے منصوبے سے ان کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی بچوں سے قریب ہونا تھا۔ بچوں سے کس انداز میں پیش آنا ہے، ان کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہا تھا۔ والدین بچوں کو ملوانے کے لیے گھر آتے تو ان کے کہنے پر بہنوں کو ان کے گھر نہ ہونے کی غلط بیانی کرنا پڑتی جس پر ان کی والدہ خفا بھی ہوتیں۔ کینسر ہسپتال کے لیے بچوں کے سکولوں میں جا کر امداد جمع کرنے کے خیال سے بھی وہ خوفزدہ تھے لیکن انہیں یہ کرنا پڑا اور یوں بچوں سے ان کے مضبوط تعلق کی بنیاد پڑی۔ کرکٹ اور ہسپتال کی تعمیر کے بارے میں ان کی کدوکاوش سے آپ کو مختصراً ہم نے بتا دیا۔ اب تھوڑا عمران خان کے حالات زندگی کا ذکر ہو جائے۔

عمران خان نے زمان پارک لاہور میں قیام پاکستان کے پانچ برس بعد آنکھ کھولی۔ بچپن میں وہ

www.urdukorner.com

عام بچوں کی طرح آوارہ گرد اور پڑھائی سے کنی کترانے والے تھے۔ گھر سے باہر جانے کے لیے ہمہ وقت آمادہ، گرمیوں کے دنوں میں بھی والدہ کے لیے انہیں باہر جانے سے باز رکھنا خاصا مشکل ہو جاتا۔ عمران خان کی شخصیت پر ان کی والدہ کا گہرا اثر ہے۔ کتاب میں جابجا ان کے بارے میں واقعات ملتے ہیں۔ ماں سے محبت کا جذبہ ان کے ہاں اتنا شدید تھا کہ وہ ہر اس کام سے بچنے کی کوشش کرتے جس سے ان کی خفگی کا اندیشہ ہی ہوتا، اسی لیے بچپن میں مالی کے خوف سے درخت سے چھلانگ لگانے سے چوٹ آئی تو اس کو والدہ سے صاف چھپا گئے۔

عمران خان نے اس کتاب میں اپنی نانی اماں کا ذکر بھی کیا ہے جو خاندان بھر کے بچوں میں ہر دلعزیز تھیں اور وہ ان سے ایسی باتیں کر لیتے تھے جنہیں والدین سے کرنے میں انہیں خوف لاحق ہوتا۔ عمران خان کے ننھیال میں کرکٹ کا بڑا چرچا تھا اس لیے بچپن میں ہی اس کھیل سے منسلک ہو گئے۔ عمران خان کی والدہ ہوم ورک کے بارے میں زیادہ تردد کرتیں، اس کے علاوہ بیٹے کی مرضی کے برعکس کسی اور کام پر مجبور نہ کرتیں۔ سکول تو عمران چلے ہی جاتے تھے کہ بجز اس کے اور چارہ ہی کیا تھا لیکن گھر آنے والے مولوی صاحب کو جل دے کر وہ زمان پارک میں جا کر کزنوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتے۔ عمران خان کے والدین مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ والدہ کا پیری فقیری پر بھی اعتقاد تھا۔

اس زمانے کے عمران خان کا خود مذہب کے بارے میں رویہ کیا تھا وہ بتاتے ہیں ''میری والدہ ہمیشہ سے جانتی تھیں کہ وہ چیزیں جن سے مجھے شدید نفرت ہے ان میں سے ایک کسی کام کو بزور کروانا ہے۔ مجھ کو جتنا زیادہ خوف اور دباؤ کے ذریعے بہتر مسلمان بنانے کی کوشش کی جاتی میں اتنی ہی زیادہ مزاحمت کرتا۔ قرآن پاک صراحت سے بیان کرتا ہے ''دین میں جبر نہیں۔'' والدین کے خیالات کے زیراثر ان میں نوآبادیاتی نظام سے نفرت نے جنم لیا۔ والدہ رات میں انہیں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہنے والے دلاوروں کے قصے سناتیں۔ ٹیپو سلطان کا قول ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیڈر کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' والدہ کی زبانی انہیں بار بار سننے کو ملا۔ بچپن میں ماجد خان ان کے کرکٹ ہیرو تھے، اسے حالات کی ستم ظریفی جانیے کہ کپتان بننے کے بعد عمران خان کو انہیں ڈراپ کرنے کا مشکل فیصلہ کرنا پڑا جس سے دونوں کے تعلقات ظاہری سی بات ہے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ماجد خان کے سچے پیرو بننے کا یہ فائدہ انہیں البتہ رہا کہ وہ ان کی تقلید میں شراب پینے سے گریزاں رہے۔ پاکستان سے 1971ء میں اے لیول کرنے کے بعد وہ انگلینڈ سدھارے۔ یہاں شروع شروع میں ان کا جی نہیں لگا۔ والدہ سے اس بابت بات ہوئی تو انہوں نے فرزند دلبند کو وطن لوٹ آنے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کسی اور وقت میں جا کر تعلیم مکمل کر لیں یا پھر اگر چاہیں تو پاکستان میں ہی رہنے کو ترجیح دیں۔ عمران خان کہتے ہیں، ماں کی اس محبت اور حمایت نے

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

انہیں ہمیشہ احساس تحفظ دیا۔ ان کے یقین نے مجھے خودشناسی کی وہ قوت دی جو کامیابی کے لیے بنیادی شرط ہے۔ بعدازاں عمران خان نے خود کو انگلینڈ کے ماحول میں ڈھال لیا۔ اس زمانے کے ان کے قریبی ساتھیوں میں بینظیر بھٹو اور وکرم مہتا شامل تھے۔

بھارت کے ساتھ دونوں جنگوں کو ایک نوجوان کی حیثیت سے انہوں نے دیکھا۔ اپنے مشاہدات انہوں نے مختصراً کتاب میں بیان کیے ہیں۔ 1965ء کی جنگ میں زمان پارک کے تحفظ کے لیے سول ڈیفنس کے تعاون سے ایک فورس بنائی گئی جس کا حصہ بننے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ کم عمر ہونے کے باعث موقع نہ ملنے پر انہیں مایوسی ہوئی۔ اس موقع پر قوم کے جذبے اور یکجہتی سے وہ ازحد متاثر ہوئے۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ ان کے لیے گہرے صدمے کا باعث بنا۔ فوجی آپریشن سے قبل مشرقی پاکستان جانے والی آخری پرواز میں وہ مغربی پاکستان انڈر 19 ٹیم کے رکن کی حیثیت سے سوار تھے۔ ادھر عام عوام ہی نہیں بلکہ کھلاڑیوں کے رویے میں بھی انہیں تناؤ نظر آیا۔ مغربی پاکستان انڈر 19 کے کپتان اشرف الحق جو بعد میں عمران خان کے قریبی دوست بنے، انہوں نے عمران کو وہاں کے لوگوں کے خدشات اور چلنے والی آزادی کی تحریک کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے سنسر شدہ سرکاری میڈیا کی خبروں پر وہ اعتبار کرتے رہے تھے جس کے مطابق سب اچھا ہی رپورٹ کیا جارہا تھا۔ اس سب کے باوجود ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ 1974ء میں عمران خان کو اشرف الحق دوبارہ ملے تو انہوں نے بتایا کہ کتنے زیادہ بنگالی سویلین اس جنگ میں جان سے گئے۔ عمران خان کے خیال میں فریقین کے اعداد و شمار کی پڑتال مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ اس جنگ میں ہزاروں سویلین مارے گئے۔

اشرف الحق سے ملاقات سے قبل جب بھی ان کے انگریز اور ہندو جاننے والے مشرقی پاکستان میں بڑی تعداد میں سویلین اموات کی بات کرتے تو وہ اسے پاکستان اور پاکستانی فوج کے خلاف پراپیگنڈا قرار دیتے لیکن اب ان کا زاویۂ نگاہ بدل چکا تھا۔ ان باتوں سے عمران نے یہ سبق حاصل کیا کہ آئندہ کبھی بھی وہ حکومتی پراپیگنڈا پر یقین نہ کریں گے نہ ہی اپنے عوام کے خلاف فوجی آپریشن کی حمایت کریں گے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے۔ عمران خان ان کی ذہانت اور فطانت کے معترف اور انہیں پکا نیشنلسٹ قرار دیتے ہیں۔ بطور ایک نوجوان 1965ء میں سلامتی کونسل میں بھٹو کی تقریر سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں بھٹو قوم کے لیے وہ کچھ نہ کرسکے جس کی ان میں اہلیت موجود تھی۔ ان کی ناکامی کی وجہ ان کے نزدیک جاگیردارانہ سوچ ہے جس میں مخالفین کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ عمران خان کے خیال میں مصنعتی اور تعلیمی اداروں کو قومیانے کی ان کی پالیسی نے ملک کو شدید نقصان پہنچایا۔ 1979ء میں بھٹو کو پھانسی ہوئی تو ان کو

یہ خبر سری لنکا میں ملی جس پر انہیں افسوس ہوا۔ اسی سال ایران میں انقلاب آیا اور روسی فوج بھی افغانستان میں داخل ہوئی۔ عمران خان نے اس ساری صورتحال کا بڑے مدلل انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ضیاء الحق اب پاکستان کے بلاشرکت غیرے حکمران تھے۔ عمران خان کی پاکستان ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ان کی ملاقات رہتی۔ 1987ء میں ضیاء الحق نے ٹی وی پر آکر عمران خان سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ عمران کو حکمران کی حیثیت سے وہ دوسروں کی طرح اقتدار کو بڑھاوا دینے والے لگے جو اپنے پیچھے تباہ کن ورثہ چھوڑ گئے۔ جونیجو حکومت ختم کرنے کے بعد ضیاء الحق نے انہیں کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی جس کو عمران خان نے رد کردیا۔ اس پیشکش کے چند دن بعد جب وہ فرانس میں تھے، انہیں ضیاء الحق کے طیارے کے تباہ ہونے کی اطلاع ملی۔ بھٹو کی طرح ضیاء الحق کی موت کا بھی انہیں بہت دکھ ہوا۔ معین قریشی کی نگران حکومت نے بھی انہیں وزیر بننے کی آفر دی جو انہوں نے حسب سابق مسترد کردی۔ اس زمانے میں وہ ملکی سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے لیکن سیاسی جماعت تشکیل دینے سے زیادہ وہ نواز شریف اور بینظیر کے متبادل کسی قوت کی حمایت کے خواہاں تھے۔ بینظیر بھٹو اور آصف زرداری نے عمران خان کو ان کے ہاتھوں ہسپتال کا افتتاح نہ کرانے پر انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ عمران خان کے بقول ان کے فون ٹیپ کیے جاتے اور ایک گاڑی بھی ان کے پیچھے لگائی گئی۔ اس صورتحال میں عمران خان کے پاس دو راستے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے سیاسی حریف نواز شریف کے ساتھ مل سکتے تھے یا پھر اسلام آباد حاضر ہوکر حکمرانوں سے ہسپتال کا افتتاح نہ کرانے کی گستاخی پر معافی مانگ سکتے تھے۔ ان کے قریبی دوست اور علامہ اقبال کے نواسے یوسف صلاح الدین نے انہیں پیپلز پارٹی کی حکومت سے صلح کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ بصورت دیگر حکومت ہسپتال کو تباہ کردے گی۔ عمران نے اس مشورے پر کان نہ دھرے اور پیپلز پارٹی حکومت کی کرپشن کو بے نقاب کرنا شروع کردیا۔ نواز شریف بھی یہی کام کررہے تھے لیکن عمران کے بقول وہ چونکہ خود کرپٹ تھے اس لیے عوام نے ان کی بات پر زیادہ یقین نہ کیا۔ 1996ء میں عمران خان نے پارٹی کی بنیاد رکھی اور اگلے ہی برس تحریک انصاف نے انتخابات میں حصہ لیا جس میں اسے عبرتناک شکست ہوئی۔ عمران خان کے خلاف مسلم لیگ نواز نے سیتا وائٹ کا سکینڈل خوب اچھالا۔ یہودی لابی کے عمران خان کی حمایت پر کمربستہ ہونے کی خبروں نے بھی انہیں نقصان پہنچایا۔

نواز شریف نے بھی ان کے ہسپتال کے امدادی کاموں میں روڑے اٹکائے اور ایک بار تو ان کو ارجنٹائن کے صدر کی جانب سے مفت ادویات کا عطیہ اس لیے مل نہیں سکا کہ اس کام کے لیے مطلوبہ خط رفیق تارڑ نے لکھنے سے انکار کردیا تھا۔ عمران نے ہمت نہیں ہاری اور پارٹی کو منظم کرتے

www.urdukorner.com

رہے۔ نواز شریف کے جانے کے بعد جنرل پرویز مشرف اقتدار میں آئے۔ عمران خان سمجھے کہ وہ ملک کے ساتھ مخلص ہیں اور ان کا سات نکاتی ایجنڈا ملک کے مفاد میں ہے لیکن بعدازاں ان پر یہ راز کھل گیا کہ وہ ملک سے مخلص نہیں اور انہیں کرپٹ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں جن کے خلاف کارروائی کے وعدے پر اقتدار میں آئے تھے۔ عمران خان نے مشرف کی حمایت پر قوم سے معافی بھی مانگی۔

2002ء کے الیکشن میں میانوالی سے رکن قومی اسمبلی بننے کے علاوہ ان کے پارٹی کے اکا دکا افراد ہی انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ 2008ء کے الیکشن میں انہوں نے اے پی ڈی ایم کے ساتھ مل کر انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ عدلیہ کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ سیاست میں عمران خان ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کے عزم میں کمی نہیں آئی۔ کچھ عرصہ سے وہ سیاست میں بہت زیادہ متحرک ہیں اور خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ آنے والا وقت ان کا ہے۔ اس خود اعتمادی کی بنیاد ان کے خیال میں قوم کے نوجوانوں میں ان کی بے پناہ مقبولیت ہے۔

حال ہی میں بی بی سی کے ایک اخبار نویس جنہوں نے عمران خان سے ملاقات کی ہے ان کے بقول ''تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے ساتھ چند گھنٹے کی گفتگو کے بعد جب کسی نے مجھے پوچھا کہ کیسا محسوس ہوا تو میرا جواب تھا کہ ''عمران خان کا انتخابات جیتنے سے متعلق اعتماد دیکھ کر مجھے مزید خوف محسوس ہوا۔'' اس کتاب کے آخری صفحے پر بھی وہ قوم کو باور کراتے ہیں کہ اب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے جب وہ اقتدار میں ہوں گے۔ اس حوالے سے وہ اپنے روحانی گرو کی پیش گوئی کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے عمران خان کے ایک دوست عمر فاروق کے استفسار پر کی۔

عمران لکھتے ہیں: عمر فاروق نے پوچھا ''ہماری پارٹی کب اقتدار میں آئے گی؟''

''میاں بشیر نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تقریباً پانچ منٹ استغراق میں گئے اور پھر آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ اس وقت جب میں ذمہ داری اُٹھانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ جب انہوں نے یہ کہا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں تیار نہیں ہوں۔ پارٹی کے قیام کے پندرہ سال بعد، میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اور میری پارٹی نہ صرف یہ کہ تیار ہے بلکہ میری پارٹی ہی وہ واحد پارٹی ہے جو ملک کو اس موجودہ مایوس کن بحران سے نکال سکتی ہے۔ چودہ برس کی میری زندگانی کی مشکل ترین جدوجہد کے بعد اب میری پارٹی آخر کار مائل بہ پرواز ہے، ملک بھر میں اس کا پھیلاؤ جنگل میں آگ کی طرح ہے۔ آج یہ تیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں میں ستر فیصد کی پہلی چوائس ہے۔ اس بات کی تصدیق حالیہ دنوں میں ہونے والے دو سروے رپورٹس سے ہوتی ہے۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا ہے کہ تحریک انصاف وہ خیال ہے جس کا وقت آ چکا ہے۔''

چوگان

قوت فیصلہ کو تیز کرنے والا ایک انتہائی دلچسپ کھیل

عارف محمود ڈاپل

فی الاصل ایک خالص مشرقی کھیل چوگان نہایت قدیم زمانے سے کھیلا جا رہا ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ کہنا انتہائی مشکل ہے کہ کھیل کب شروع ہوا۔ چوگان کا لفظ دلائی لامہ کی پراسرار اور افسانوی سرزمین تبت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا ماخذ ''پیولو'' ہے جس کے معنی گیند کے ہیں۔ یہ کھیل تبت سے دوسرے ممالک میں رائج ہوا۔ تاہم محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کھیل ایرانی الاصل

www.urdukorner.com

ہے۔ اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ کھیل ایرانی شہنشاہ دارا کے دور میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد والے دور میں یہ کھیل مصر، عرب اور ایران میں کھیلا جاتا تھا۔ شہرۂ آفاق عربی ادیب و فاضل الجاحظ نے 860ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ الجاحظ نے اپنے سے تقریباً 800 سال پہلے کی تاریخ لکھی ہے۔

ابتدائی دور میں ایک ٹیم میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے۔ دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیم میں ہزاروں افراد کی شرکت کھیل کے لیے نہیں تھی بلکہ محض مذہبی رسومات تھیں جنہیں وہ لوگ موسم بہار میں اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے بجالاتے تھے تاکہ ان کی فصلیں اچھی ہوں۔

تبت اور چین کی سیاحت کے دوران مشہور سیاح مارکو پولو کو معلوم ہوا کہ چوگان کا کھیل چین میں 600ء سے کھیلا جا رہا ہے تاہم اس کھیل کا پہلا تذکرہ مشہور چینی شاعر شین چوان چی (متوفی ۷۱۳ء) نے کیا ہے۔ چین سے یہ کھیل جاپان اور ہندوستان میں پہنچا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں خاندان غلاماں کی حکومت سے کافی عرصہ قبل کھیلا جاتا رہا ہے۔ برصغیر میں شاہی سرپرستی کے باعث اس کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جود وسخاء فیاضی اور علم پروری کے لیے مشہور خاندان غلاماں کے اولین بادشاہ قطب الدین ایبکؒ کا انتقال چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر نومبر 1210ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ عظیم مغل شہنشاہ اکبر نے تو اس کو بہت اہمیت دی۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے اپنے وزراء اور درباریوں پر پولو کھیلنا لازم قرار دیا۔ سرکاری حکام کو صحیح، بروقت اور فوری فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ چوگان کا کھیل ان میں یہ سب صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی برصغیر میں چوگان بھی معدوم ہو گیا۔ تاوقتیکہ 19ویں صدی میں برٹش آرمی نے اس کو دوبارہ فروغ دیا۔ کلکتہ میں جو اس زمانے میں انگریزی تہذیب کا اولین مرکز تھا پہلی بار برٹش آرمی کے افسروں نے 1863ء میں یہ کھیل کھیلا۔ ان ہی افسروں نے 1869 میں اس کھیل کو برطانیہ میں متعارف کرایا اور پھر وہاں سے یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پہنچا۔ 1874ء میں پہلی بار کھیل کے قواعد وضوابط مرتب کئے گئے اور ٹیم میں کھلاڑیوں کی تعداد دس سے گھٹا کر پانچ کر دی گئی جو بعد میں چار ہو گئی۔ پولو امریکہ میں بہت مقبول ہے۔ سکولوں اور کالجوں تک میں کھیلا جاتا ہے۔ 1995ء کے بعد سے اس کو وہاں بہت عروج حاصل ہوا ہے۔

امریکہ اور ارجنٹائن نیز برطانیہ اور امریکہ کے درمیان چوگان کے انٹرنیشنل میچ ہوتے رہتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے شروع ہونے تک کھیل میں امریکہ اور ارجنٹائن کو برتری حاصل تھی لیکن اب کھیل میں برطانیہ کو برتری حاصل ہے۔ ارجنٹائن نے اولمپک مقابلوں میں ایک مرتبہ پولو کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ کھیل کے لیے گھوڑوں کو خاص طور پر سدھایا جاتا ہے۔ 1930ء کی دھائی میں ارجنٹائن کے گھوڑے زیادہ مقبول تھے تاہم ٹیکساس اور کینیڈا میں پالے جانے والے گھوڑوں کو بھی مقبولیت حاصل تھی۔

کھیل: کھیل کا میدان 300 گز لمبا اور 200 گز چوڑا ہوتا ہے۔ چوگان بالکل ہاکی اور فٹ بال کی طرز پر کھیلا جاتا ہے۔ ہر ٹیم میں چار چار سوار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بید کی بنی ہوئی بلیاں ہوتی ہیں جن کی لمبائی 48 انچ سے 72 انچ تک ہوتی ہے جس سے وہ لکڑی کی سفید گیند کو ضرب لگاتے ہیں گیند کا قطر ساڑھے تین انچ اور وزن ساڑھے

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

انمول موتی

☆غم چھوٹے آدمی کو توڑ دیتا ہے۔ اگر غم میں دینے والے کا خیال رہے تو پھر انسان بہت بلند ہو جاتا ہے۔

☆دنیا کے اندر سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ یہ دنیا گناہ کے متلاشی کے لیے گناہ دیتی ہے اور فضل کے متلاشی کو فضل دیتی ہے۔

☆جس کو صداقت اور نیکی کا سفر کرنے کی خواہش ہے وہ جان لے کہ یہ منظوری کا اعلان ہے۔ جس کو منظور نہیں کیا جاتا اس کو یہ شوق ہی نہیں ملتا۔

☆جو بات آپ کے دل میں اتر گئی وہی آپ کا انجام ہے، اگر آپ کو موت آ جائے تو جس خیال میں آپ مریں وہی آپ کی عاقبت ہے۔

☆جو آدمی موت سے نہیں نکل سکتا وہ خدا سے کیسے نکل سکتا ہے۔

☆اپنی ہستی سے زیادہ اپنا نام نہ پھیلاؤ، نہیں تو پریشان ہو جاؤ گے۔

☆استعداد سے زیادہ کی تمنا ہلاکت ہے اور استعداد سے کم خواہش آسودگی ہے۔

☆☆☆

اوپس اور پونے پانچ کے درمیان ہوتا ہے۔ کھیل ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔ درمیان میں پانچ منٹ کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ گول آٹھ گز چوڑا ہوتا ہے۔ کھلاڑی نمبر 4 کا مقام بہت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ اس کو نہ صرف مدافعت کرنا ہوتی ہے بلکہ گول کیپر کے فرائض بھی سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ جب کوئی گول ہوتا ہے تو ٹیمیں میدان میں اپنی جگہ بدل لیتی ہیں۔ کھیل میں دو ہیجائر ہوتے ہیں لیکن بڑے مقابلوں میں ایک ریفری بھی ہوتا ہے تاکہ اگر ہیجائروں میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو وہ فیصلہ کرے۔

پاکستان میں کھیل: گلگت اور سکردو ایجنسیوں کے لوگ کھیل کود کے بہت شوقین ہیں۔ وہاں پولو کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ تقریباً ہر گاؤں میں کھیل کا میدان ہوتا ہے اور چوگان بڑے جوش و خروش، جذبے اور ولولے سے کھیلا جاتا ہے۔ کھیل کے دوران بینڈ بجایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کبھی ان علاقوں میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اپنی ننھی منی بلیوں سے چوگان کھیل رہے ہوں گے۔ جب یہ ذرا بڑے ہوتے ہیں تو ٹٹوؤں پر کھیلتے ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل نوعمری میں ہی بہترین کھلاڑی اور سوار بن جاتے ہیں۔ ہر سال نومبر کے پہلے ہفتے میں گلگت میں سالانہ جشن منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر پولو کے زبردست مقابلے ہوتے ہیں جن میں ہر علاقے کی ٹیم حصہ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ ناردرن سکاؤٹ اور گلگت سکاؤٹ کی ٹیمیں بھی کھیل میں حصہ لیتی ہیں۔

نومبر میں اس کھیل کو دیکھنے کے لیے دور دراز سے لوگ آتے ہیں حتیٰ کہ تمام شائقین کو ہوائی جہاز کے ذریعے روٹین پروازوں میں گلگت لے جانا پی آئی اے کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے پی آئی اے عموماً اضافی پروازیں کراتی ہے۔ بے شمار سیاح کھیل دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کو کافی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

شمالی علاقوں کے علاوہ پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ حال ہی میں لاہور نیشنل چیمپئن شپ کے لیے مقابلے ہوئے تھے جس میں کراچی اور ملک کے دیگر حصوں کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ خیال ہے کہ جلد ہی پاکستان کی پولو ٹیمیں فرانس اور امریکہ کا دورہ کریں گی۔

ایک سے ایک

انجم انصار

ڈرائنگ روم ویسا کا ویسا ہی تھا، سوائے ٹیلی فون کے اضافے کے، یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے سامنے ہی کوئی فون بھی آ گیا۔ سلمان بھائی بجلی کی سرعت سے لپکے مگر بھابی نے ڈاج دے کر ریسیور لپک کر اٹھا لیا۔

ٹیلی فون کے کرشمے جو لوگوں کی اصلیت ظاہر کرنے کا سبب بن جاتا ہے

اب کیا کہیں اور کس سے کہیں، بعض دفعہ تو صورتحال عجیب سی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ بات تو طے ہے کہ اس میں سارا قصور محکمہ ٹیلی فون کا ہے کہ ان چند ماہ میں کراچی کے شہریوں کو اس قدر ٹیلی فون بانٹے کہ جیسے ریوڑیاں بٹ رہی ہوں، وہ لوگ جو درخواستیں دے کر کب کے بھولے بیٹھے تھے، ان کے ہاں تک فون

www.urdukorner.com

سنہری باتیں

☆غم چاہے کتنا ہی سنگین ہو نیند سے پہلے تک ہے۔

☆کائنات کا کوئی غم ایسا نہیں ہے جو آدمی برداشت نہ کر سکے۔

☆مرنے کے بعد زندہ ہونے کی خوشی صرف اسی شخص کو ہو سکتی ہے جو اس زندگی میں کوئی کام کر رہا ہو۔ جو اس زندگی میں کوئی کام کر رہا ہو تو اسے مرنے کا خوف نہیں ہوتا۔

☆جوانی سولہ سال کی عمر کا نام نہیں، ایک انداز فکر کا نام ہے، ایک انداز زندگی کا نام ہے، ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص سولہ سال میں بوڑھا ہو اور ایک شخص ساٹھ سال میں جوان ہو۔

☆سانس کی موت سے پہلے بہت سی موتیں ہو چکی ہوتی ہیں، ہم سانس کو موت سمجھتے ہیں حالانکہ سانس تو اعلان ہے ان تمام موتوں کا جو آپ مر رہے ہیں۔

☆جس انسان کی آنکھ میں آنسو ہیں وہ انسان اللہ سے بچ نہیں سکتا، انسان کا اللہ سے قریب ترین رشتہ آنسوؤں کا ہے۔

☆دور کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو قریب نہ آ سکے۔

☆جب آپ اپنے ماضی کو حال پر فوقیت دیتے ہیں تو آپ مذہبی آدمی بن جاتے ہیں، جب مستقبل کو فوقیت دیتے ہیں تو پھر سائنسی آدمی ہو جاتے ہیں۔ سائنس ماضی سے نجات پاتی ہے جبکہ مذہب ماضی کی طرف رجوع کرتا ہے۔

☆☆☆

لگا دیئے گئے حالانکہ اس مستعدی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لوگ پہلے ہی پیٹ بھر کے چھچھورے تھے، اب حلق بھر کے ہو گئے اور اس کا ذمہ دار صرف محکمہ ٹیلی فون ہے۔

"اب بڑی چچی کے ہاں، خوب خوش گپیوں میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔ کھانا بھی بے حد لذیذ تھا کہ ہلکی سی ٹرن سن کر، چچی یوں اچھل کر بھاگیں کہ ہم سمجھے یقیناً کسی بچھو نے انہیں کاٹ لیا ہے۔ یوں بھی فرشی نشست پر کھانا کھایا جا رہا تھا۔ برسات کے بعد کیڑے مکوڑے اور مکھیاں تو ڈیکوریشن کی طرح گھر میں بھی نظر آ ہی رہی تھیں۔ چچی کے پیچھے چچا بھی ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر جس بدحواسی سے کمرے میں بھاگے تو ہمیں پورا یقین آ گیا کہ وہ شاید چچی کے مرہم لگانے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر ہم بھی دم سادھے زبردستی نوالہ چباتے رہے مگر چند ہی منٹوں میں دونوں کی ہنسی کی آواز آئی تو ہم بھی ششدر سے اس کمرے میں پہنچ گئے۔

"ہاں بھابی، اس وقت تو کھانا کھا رہے ہیں۔ آؤ تم بھی کھا لو۔" بڑے جیٹھ کی منجھلی لڑکی تو قورمے کی خوشبو سونگھ کر ہمارے ہاں آ گئی ہیں۔" انہوں نے ہمارا تذکرہ کرتے ہوئے فون پر چہک کر کہا۔

"لاؤ، مجھے دو، میں بات کروں گا۔" چچا نے فون چچی سے جھپٹ کر کہا۔ "ہاں بھئی فرید کو بلاؤ، دفتر کے علاوہ بات ہی نہیں ہوتی، اب تمہارے ہاں بھی فون لگ گیا ہے، ہمارے ہاں بھی۔ کم از کم ملاقات تو ہوتی رہنا چاہیے۔" چچا قصداً ہنس رہے تھے۔

"اللہ، آپ یہ پوچھیں ناں! کہ اب دوبارہ کب فون کریں گے، بلی اور شازیہ کل رات کی طرح روئیں گی، اگر ان کی بات گڑیا اور منی سے نہیں ہوئی۔" چچی نے ٹھوکا دے کر چچا سے کہا۔

"ہاں فرید، آم کھاؤ گے، آ جاؤ، سستی کی کیا بات ہے، دو گھر چھوڑ کر تو تمہارا گھر ہے خود آ جاؤ، ورنہ بچے کو بھیج دو، دے دیں گے۔ اچھا چلو اماں

سے بات کرو، ہاں فون بند مت کرنا۔ آپا بیگم بھی بات کریں گی۔" ابھی چچا کی بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کا بچہ آم مانگنے بھی آ گیا اور ہم یہ مناظر دیکھ کر، کلس ہی تو گئے۔ کیسا کھانا، اور کیسا ٹھہرنا فوراً ہی گھر آ گئے۔

سلمان بھائی کے ہاں جاتے ہوئے، یہ خیال تھا کہ ان کے ہاں یہ چھچھوری حرکتیں دیکھنے کو نہیں ملیں گی، مگر ابھی بیٹھے دس منٹ نہیں ہوئے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ بھابی کسی نہ کسی صورت، ہمیں اپنے ڈرائنگ روم سے لے کر جانا چاہتی ہیں۔

شاید نیا صوفہ لیا ہے یا پردے تبدیل کیے ہیں جس کا تذکرہ کرنے کے بجائے وہ ہمیں یکدم شاک پہنچانا چاہتی ہیں۔ کافی دیر تک ہم ان کی مکارانہ چالوں پر پانی پھیرتے رہے کہ ڈرائنگ روم میں قدم رکھ کر نہیں دیا، مگر چلتے وقت نہ جانے کیسے وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے جانے میں کامیاب ہو گئیں کہ اندر جا کر ان کی اس کامیاب کوشش پر خود ہی داد دے دی (کہ ہمیں شکست دے دی تھی) ڈرائنگ روم ویسا کا ویسا ہی تھا، سوائے ٹیلی فون کے اضافے کے، یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے سامنے ہی کوئی فون بھی آ گیا۔ سلمان بھائی بجلی کی سرعت سے لپکے مگر بھابی نے ڈاج دے کر ریسیور لپک کر اُٹھا لیا۔

"ہیلو، میں زرین بول رہی ہوں......" لہجہ ان کا خوامخواہ ٹھنک رہا تھا (یہ چالیس سال کی عورتیں، سولہ سال کی کیسے بنتی ہیں۔ آج اس کا عملی مظاہرہ ہم خود دیکھ رہے تھے)

"اللہ نہیں، ایمان سے...... سچ مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اب وہ صوفے پر قلوپطرہ سٹائل میں لیٹ چکی تھیں۔

"خوامخواہ ہی میں [illegible] ہوں، میں نہیں مان سکتی۔" ان کے مبہم جوابات، بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ بات کس موضوع پر ہو رہی ہے۔

"بائی گاڈ، ان کا تو نام بھی مت لینا، ورنہ میں نہیں یا وہ نہیں۔"

"کیا کہا، ٹھیک ہے او کے، جان، دل خوش کر دیا تم نے۔ تم پر واری نہیں جائیں گے تو کس پر۔" وہ ہوائی کس، اُچھالتی ہوئی، اترائیں۔ "چلو سلمان سے بات کر لو۔"

"کس کا ہے ٹیلی فون؟" نند ہونے کے ناطے میری ساری ہی تیوریاں ماتھے پر آ موجود ہوئیں۔

"ہاں، ہاں، کس کا ہے یہ ٹیلی فون؟" سلمان بھائی بھی صورتحال سے پریشان ہو گئے۔

"لیں، آپ خود بات کر لیں۔" بھابی نے ریسیور سلمان بھائی کو پکڑا دیا۔ انہوں نے کانوں سے لگایا، استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

اور وہ ہنس پڑیں۔

"اس میں تو کوئی نہیں بول رہا۔" سلمان بھائی بڑبڑائے۔

"بس ایسے ہی ٹیون بجی تھی، میں نے اٹھایا تو کوئی تھا ہی نہیں، ایک ہفتہ ہو گیا فون لگے ہوئے، ابھی تک دو تین فون کالز کے سوا کسی کا فون نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ چلو، خود ہی اپنا دل خوش کر لیا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"مگر یہ تصوراتی باتیں کس سے کر رہی تھیں؟" میں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی بھابی سے کہہ رہی تھی کہ اگر دعوت میں مجھے بلانا چاہتی ہو تو چھوٹی بھابی کو انوائٹ مت کرنا، اور وہ میری یہ بات مان گئی تھیں۔"

تب گھر آتے ہوئے میں نے سوچا! یہ بھابی تو چچی سے بھی زیادہ چھچھوری نکلیں!

......☆......☆......

گواہوں میں برابری

ڈاکٹر ذاکر نائیک

ڈاکٹر ذاکر نائیک نامور سکالر اور محقق ہیں۔ انکا شمار ایسے محققین میں ہوتا ہے جنہیں دلیل اور علمی شہادتوں پر مبنی تقاریر اور خطابات کے باعث غیر مسلموں میں بھی بے حد شہرت حاصل ہے۔ وہ غیر مسلموں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کے حوالے سے پائے جانے والے تمام سوالات کا مدلل جواب دیکر اسلامی تعلیمات کی درستگی اور دین اسلام کی عظمت اور بلندی ثابت کرنے کا مشن لیے ہوئے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں بھی وہ غیر مسلموں بالخصوص امریکی اور مغربی میڈیا کے اس پراپیگنڈا کا بھرپور جواب دے رہے ہیں جو وہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق کے حوالے سے مسلمانوں پر عائد کرتے ہیں۔

سوال: گواہی کے لیے دو عورتیں ایک مرد کے برابر کیوں ہیں؟

جواب 1: دو خواتین بطور گواہ ہمیشہ ایک مرد کے برابر نہیں ہوتیں۔

قرآن پاک میں تین آیات ایسی ہیں جن میں گواہوں کا ذکر ہے مگر مرد اور عورت کی تخصیص کے بغیر.....

الف: وراثت کی تقسیم کے لیے وصیت کرتے وقت دو عادل انسانوں کی بطور گواہان ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 106 میں قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''اے ایمان والو تمہارے آپس میں اشخاص کا گواہ ہونا مناسب ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وصیت کرنے کا وقت ہو۔ وہ دو اشخاص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں خواہ تم میں سے ہوں یا غیر لوگوں میں سے دو اشخاص ہوں اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو اور تمہیں موت آ جائے۔'' (القرآن: 106:5)

طلاق کے معاملے میں بھی عدل وانصاف کرنے والے دو اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے:

''اور آپس میں سے دو عادل اشخاص کو گواہ کر لو اور اللہ کی رضامندی کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔'' (القرآن 2:65)

پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا معاملہ ہو تو چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے:

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں 80 کوڑے لگاؤ اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہ فاسق لوگ ہیں۔'' (4:24)

2- دو عورتوں کا ایک مرد کے برابر ہونا صرف اس گواہی سے متعلق ہے جس میں کوئی مالی لین دین ہو۔ یہ سچ نہیں ہے کہ ہمیشہ دو عورتیں گواہی کے لیے ایک مرد کے برابر تصور ہوتی ہیں۔ ایسا چند مخصوص معاملات میں ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں پانچ آیات ایسی ہیں جن میں گواہوں کا ذکر ہے۔ ان میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں دی گئی۔ قرآن پاک میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں گواہی کے لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر بتایا گیا ہے۔ یہ سورۃ البقرہ کی آیت 282 ہے۔ یہ قرآن پاک کی طویل ترین سورہ ہے جس میں مالی معاملات زیر بحث آئے ہیں۔

ارشاد ہوا:

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقررہ پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے۔ کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ پس اسے بھی لکھ دینا چاہیے اور جس کے ذمے حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں۔ ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوا دے اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو تا کہ ایک کو کوئی الجھاوا ہو یا وہ غلامی کرے تو دوسری یاد دلا دے۔'' (القرآن 282:2)

اس آیت میں صرف مالی معاملات کے بارے میں بات ہوئی ہے۔ ایسے معاملات میں فریقین میں تحریری معاہدہ کر لیا جائے اور دو گواہوں کو شامل کر لیا جائے، ترجیحاً دونوں مرد ہوں تو بہتر ہے۔ اگر دو مرد نہ ملیں تو دو عورتیں اور ایک مرد گواہ بنا لو۔

مثال کے طور پر کوئی شخص کسی بیماری کی وجہ سے آپریشن کرانے جا رہا ہے۔ علاج کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے وہ ترجیحاً دو سند یافتہ معالجین اور سرجنوں سے رجوع کرے گا۔ اگر دو نہ ملیں تو وہ ایک سرجن اور دو عام معالجین سے رائے لے گا جو صرف ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں گے۔

اسی طرح مالی معاملات اور لین دین میں دو مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلام مردوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے بال بچوں کے لیے کما کر لاتے ہیں۔ گھر کی مالی ذمہ داری چونکہ مرد کی ہوتی ہے اس لیے ان سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مالی معاملات میں تجربہ کار ہوں گے۔ دوسری صورت میں گواہی کے لیے ایک مرد اور دو عورتیں ہوں گی تا کہ ایک عورت کو الجھاوا ہو جائے تو وہ غلطی کرے اور دوسری اسے یاد کرا دے۔

قرآن پاک میں عربی کا لفظ ''تضل'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے الجھاوا، غلطی کرنا۔ بہت سے مترجمین نے اس کا ترجمہ ''بھول جانا'' کیا ہے جو غلط ہے۔ پس صرف مالی معاملات میں دو خواتین

www.urdukorner.com

گواہوں کی ضرورت ہوگی جو ایک مرد گواہ کے برابر تصور ہوں گی۔

3- قتل کے کیس میں بھی دو خواتین گواہ ایک مرد گواہ کے برابر نہیں

تاہم کچھ علماء یہ رائے دیتے ہیں کہ قتل کے کیس میں زنانہ گواہی کا بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں عورت مرد کی نسبت زیادہ ڈری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی جذباتی حالت کی وجہ سے الجھاوے کا شکار ہو سکتی ہے لیکن کچھ فقہاء کے خیال میں قتل کے معاملات میں بھی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہو سکتی ہے۔ دوسرے تمام معاملات میں ان کے خیال میں ایک خاتون گواہ ایک مرد گواہ کے برابر تصور ہوگی۔

4- قرآن پاک میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ ایک عورت گواہ ایک مرد گواہ کے برابر ہے۔

کچھ علماء ایسے ہیں جن کے خیال میں دو خواتین گواہوں کا ایک مرد گواہ کے برابر ہونا تمام معاملات میں قانوناً درست سمجھا جائے۔ مگر اس سے اتفاق اس لیے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن پاک میں سورۃ النور کی آیت 6 میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ایک خاتون گواہ ایک مرد گواہ کے برابر ہے:

''جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور ان کا کوئی گواہ بجز خود ان کی ذات کے نہ ہو تو ایسے لوگوں میں سے ہر ایک کا ثبوت یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں۔'' (القرآن 6:24)

5- حضرت عائشہؓ کی واحد گواہی کافی ہے والی اس حدیث کو مان لیا جائے

حضرت عائشہؓ جو آنحضورﷺ کی محبوب زوجہ تھیں، انہوں نے 2220 احادیث بیان فرمائی ہیں۔ صرف ان کی واحد گواہی پر ان احادیث کو مستند سمجھا جاتا ہے۔

بہت سے فقہاء کے خیال میں چاند کے نظر آجانے کے بارے میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ روزہ اسلام کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے جس کے چاند کے نظر آنے کے بارے میں ایک عورت کی گواہی کافی سمجھی جا رہی ہے اور تمام مسلمان اس کی گواہی کو درست مانتے ہیں۔ فقہاء کی رائے میں رمضان کا آغاز ہونے پر نظر آنے والے چاند کی گواہی کے لیے ایک عورت کافی ہے جبکہ رمضان کے اختتام پر عید الفطر کے لیے نظر آنے والے چاند کی گواہی کے لیے دو عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گواہ مرد ہوں یا عورتیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

6- بعض معاملات میں خواتین گواہوں کو ترجیح دی جاتی ہے

بعض معاملات میں صرف خواتین گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مردوں کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی۔ مثال کے طور پر خواتین کے مسائل سے نمٹنے کے لیے، جیسے مرگ پر عورتوں کو غسل دینے کے لیے گواہ عورت ہونی چاہیے۔

مالی معاملات میں جہاں مردوں اور عورتوں کی گواہی کے لیے تعداد کا فرق ہے یہ اس لیے نہیں کہ اسلام میں مرد و زن میں کوئی عدم مساوات کا تصور ہے بلکہ یہ صرف اس لیے ہے کہ مرد اور عورت دونوں کی فطرت مختلف ہے، اسلامی معاشرے میں دونوں کا کردار مختلف ہے۔

''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں''

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی گھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

husain.8@hotmail.com

عالمانہ باتیں

☆''آپ (حضرت محمدﷺ) تمام مخلوق کے لیے رحمت مجسم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔'' (القرآن)

☆عجائبات دہر میں سب سے بڑا عجوبہ انسانی آنکھ ہے۔

☆ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

☆انسان کس حد تک فاعل مختار ہے اور کس حد تک واقعات کا کھلونا ہے۔ تدبیر کہاں چلتی ہے اور تقدیر کہاں تک دخل دیتی ہے۔ یہ سب بھید ہیں اور ہمیشہ بھید ہی رہیں گے۔

☆بچوں کو ماں باپ سے صرف صورت شکل ہی نہیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی صفات بھی وراثت میں ملتی ہیں۔ ماحول کا بھی ایک حد تک اثر ہوتا ہے۔

☆وکیل کو انسانی فطرت سے واقف ہونا چاہیے۔ اس میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ انسان کی سیرت کو اس کی صورت سے پہچان لے۔ میں نے شیکسپیئر کے قیافے کا بہت غور سے مطالعہ کیا مگر مجھے یہ ڈھب نہ آیا کہ ان لوگوں میں سے جو لندن کی سڑکوں پر پھرتے تھے شیکسپیئر کو چھانٹ لوں۔ (گاندھی)

☆جب ہم مٹھی بھر تھے تو دنیا مسلمانوں کی مٹھی میں تھی۔ آج ہم ڈیڑھ ارب ہیں اور عربوں سمیت دنیا کے قدموں میں ہیں تو ایسا کیسے ہو گیا؟ ممکن کیسے ہوا؟ (حسن نثار)

www.urdukorner.com

☆ہمارے تاجر کی پہچان کیا ہے؟ چور، جعلساز، جھوٹا، منافع خور، ذخیرہ اندوز......

☆ایسا شخص نئے سمندروں میں سفر نہیں کرسکتا جو ساحل کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو۔

☆ قائداعظمؒ کہا کرتے تھے کہ تعلیم کے بغیر اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور تعلیم ہی روشنی کو ابھار سکتی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ بچے کی تعلیم کی طرف بے حد توجہ دیں گی۔ (محترمہ فاطمہ جناحؒ)

☆تعلیم کا عام اور سستا ہونا ضروری ہے۔

☆سائنسی معرکہ ہو گیا...... ایک نیا سیارہ دریافت...... جس میں نہ پانی ہے نہ گیس نہ تیل......
(کہیں دور بین کا رُخ پاکستان کی طرف تو نہیں)
(کارٹون جنگ ڈاٹ کام)

☆☆☆

ہم الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں

بعض اوقات صداقت کی زبان بھی اتنی تلخ ہوتی ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ اگر کسی انسان کی ایک آنکھ کام نہ کرتی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے منہ پر ہی اسے کانا کہہ دیا جائے۔ ہر چند کہ یہ صداقت ہے لیکن یہ ایک بدتمیزی کا مظاہرہ ہے۔ صداقت کا غیرمحتاط اظہار بھی پریشانی کا باعث ہوسکتا ہے۔

ایک دفعہ ایک بادشاہ نے ایک دست شناس وستارہ شناس انسان کو بلایا، اس سے اپنا احوال پوچھا۔ منجم نے حساب لگایا۔ زائچہ بنایا اور بادشاہ کو اطلاع دی "جہاں پناہ! آپ کے سب عزیز آپ کے سامنے مرجائیں گے......" بادشاہ اتنی بری خبر پر بڑا پریشان ہوا۔ اسے غصہ آگیا کہ منجم نے کیا خبر دی ہے۔ اس نے منجم کو گرفتار کرا دیا۔ سلطنت میں منادی کرا دی گئی کہ کوئی اور منجم بادشاہ کے لیے حساب لگائے۔ ایک آدمی حاضر ہوا۔ اس نے بھی زائچہ بنایا، حساب لگایا اور کہا "جہاں پناہ! آپ کی عمر طویل ہے۔ آپ اپنے سب عزیزوں سے زیادہ عمر پائیں گے۔" بادشاہ خوش ہوگیا۔ بولا "مانگ کیا مانگتا ہے۔" منجم نے کہا "جہاں پناہ! بس میرے استاد کو رہا کردیں۔" سلطان نے وضاحت چاہی تو منجم نے کہا "گرفتار منجم میرا استاد ہے اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو میں نے بتایا لیکن وہ الفاظ کے انتخاب میں محتاط نہ ہو سکا۔ آپ اپنے عزیزوں سے زیادہ عمر پائیں یا آپ کے عزیز آپ سے پہلے مرجائیں بات ایک ہی ہے لیکن ادائیگی مختلف ہے۔" اور یہی چیز اہم ہے کہ ہم الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ بھی خاندان رکھتے ہیں۔ قصیدے کے الفاظ اور ہوتے ہیں اور مرثیے کے اور، تنقید کے اور، توصیف کے اور، رزمیہ اور عشقیہ اور، غزل کے الفاظ اور ہیں، مثنوی کے اور۔ کیا یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ شرافت کے الفاظ کون سے ہیں؟ بدمزاج ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا بدتمیز ہو جانا کیونکہ بدتمیز آدمی الفاظ کے غلط استعمال کا مجرم بھی ہے۔

الفاظ کے صحیح استعمال کی توفیق نعمت ہے۔ یہ نعمت بھی کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔ الفاظ سے ماحول کو خوشگوار بنانے کا کام لیا جائے تو بڑی بات ہے۔ خالی الفاظ نگلنے اور الفاظ اگلنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ الفاظ سے ماحول روشن کیا جائے۔ الفاظ سے دلوں کو خوش کیا جائے۔ الفاظ سے تعمیر ملت کے عظیم کام میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ الفاظ حقیقت ہیں۔ الفاظ امانت ہیں۔ الفاظ دولت ہیں۔ الفاظ طاقت ہیں۔

("واصف علی واصف" کی کتاب
حرف حرف حقیقت سے اقتباس)

☆☆☆

عالمی یوم حجاب

جکارتہ کے خوبصورت ... [illegible]

اردن کی شہزادی بسمہ بن طلال کے اعزاز میں انڈونیشیا کی ایک تنظیم "حجاب گرلز" نے اپنے خوبصورت حجاب کی نمائش منعقد کی تھی اور اس میں انٹرنیشنل مسلم وویمن یونین کے ایشیا ریجن کی نگران کی حیثیت سے ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی صدر وویمن اینڈ فیملی کمیشن کو مدعو کیا گیا۔ وہاں کی پراعتماد باحجاب بچیوں کے ساتھ گفتگو کے دوران ہی میں نے اپنی پاکستانی بچیوں کے لیے کچھ منصوبہ بندی کی تھی جس پر عملدرآمد کا موقع غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے زیراہتمام مری میں 15 تا 22 جولائی 2011ء کو ایک انٹرنیشنل یوتھ کیمپ کے انعقاد کی صورت میں ملا۔

نائن الیون کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاں اسلام کے خلاف کھل کر صف آرائی کی وہیں شعائر اسلام اور خاص طور پر حجاب کے خلاف ان کا تعصب بڑھتا گیا اور مسلم معاشرے میں حجاب کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ذرائع ابلاغ کافی خوفزدہ نظر آنے لگے۔ حجاب کے خلاف اس بڑھتی ہوئی مہم کے پیش نظر 2004ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں عالم اسلام کے ممتاز رہنما علامہ یوسف القرضاوی نے 4 ستمبر کو "عالمی یوم حجاب" منانے کا اعلان کیا۔ چونکہ ستمبر 2003ء میں ہیڈ اسکارف پر پابندی کا قانون اسمبلی میں پیش ہوا تھا اور اس بات پر مسلمانوں کے اندر بہت غم وغصہ پایا جارہا تھا اس لیے اس کے جواب میں عالمی یوم حجاب کا اعلان کیا گیا اور اس دن سے اسے پوری دنیا میں حجاب کے تحفظ کے عزم نو کے طور پر 4 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔

☆☆☆

عالم اسلام میں خواتین کے حوالے سے "عالمی حجاب ڈے" پہلا اسلامی ایونٹ ہے جو عالمی سطح پر تواتر سے ... [illegible] ہے۔ جب سے مسلمان خواتین نے یہ دن منانا شروع کیا ہے مغربی دنیا میں بھونچال سا آ گیا ہے اور یورپی یہود و نصاریٰ اس ایک نقطہ پر متحد ومتفق ہو گئے ہیں کہ مسلمان خواتین کو کسی بھی صورت حجاب پہننے سے روکنا ہے۔ اپنے اس گھناؤنے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے کالے قوانین بنانے شروع کر دیئے اور کئی ملکوں میں برقع پوش خواتین پر حملے کیے گئے اور پھر ان پر جرمانے بھی عائد کیے گئے۔ کہیں انہیں ملازمتوں سے نکال باہر کیا گیا اور کہیں ان پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ اپنی جان تک ہار گئیں۔

حقوق انسانی، حقوق نسواں جیسی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے ہی ہاتھوں ان تحریکوں کے گلے پر چھری پھیرنی شروع کر دی۔ فرانس، بیلجیم، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ و برطانیہ و دیگر یورپی ملکوں میں فرانس پہلا متعصب ملک ہے جس نے اسلام دشمنی میں اس قدر انتہا کر دی کہ مسلمان خواتین کے عام مقامات پر حجاب پہننے پر پابندی عائد کر دی اور جرمانے کی سزا کے ساتھ ساتھ سات یوم قید کی سزا بھی رکھ دی۔ اس کی تقلید میں بیلجیم نے بھی یہی متعصب رویہ اپنا لیا۔

شرم وحیاء عورت کا زیور ہے۔ بالخصوص مسلمان خواتین کے لیے جز وایمان ہے۔ اسلام عورتوں کو غیرمردوں سے اپنے اعضاء چھپانے کا حکم دیتا ہے۔ خود قرآن کریم میں اس حکم کو تاکیداً بیان کیا گیا ہے جبکہ مغربی عورت مرد کے سامنے عریاں ہے اور یہی عریانیت مغرب زدہ مرد، مسلمان عورتوں میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کالے قوانین کا سہارا لے رہا ہے۔ اس طرح وہ عالمی قوانین کی مذہبی آزادی، شخصی آزادی اور مسلم ثقافت کی شقوں کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ عالمی قانون تمام اقوام کو ان

www.urdukorner.com

کے مذاہب کی مکمل روح (تہذیب و ثقافت) کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے لیکن متعصب مغربی ممالک کے یہود و نصاریٰ ایک قانون کے تحت سموکنگ ماسک (Smoking Mask) کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لگانے سے بھی چہرے کی شناخت مٹ جاتی ہے لیکن وہ مسلم دشمنی اور اسلام کی عداوت میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ اس طرز پر مسلم خواتین کے حجاب پہننے سے اس قدر خوفزدہ ہیں گویا یہ حجاب بم بن کر پھٹ پڑے گا۔

(''اشاعت خصوصی'' جنگ ڈاٹ کام۔ پاک 4 ستمبر 2011ء سے اقتباس)

☆☆☆

ایک پہیلی

امیر خسرو کی ایک پہیلی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک گاؤں ایسا تھا جس کے مکینوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ رات بارش ہوئی اور ایک ہاتھی کا ادھر سے گزر ہوا۔ صبح گاؤں والوں نے ہاتھی کے پاؤں کے نشان دیکھے تو اس حوالے سے قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں کہ کون سا جانور تھا، جس کا رات کو ادھر سے گزر ہوا؟ میاں لال بجھکو بھی وہاں موجود تھے۔

امیر خسرو کی معروف پہیلی کے بول یوں ہیں:

لال بجھکو بوجھ گئے اور بوجھ نہ پاوا کوئی
پاؤں میں چکّی باندھ کر ہرنا کودا کوئی

☆☆☆

نمک

326 قبل مسیح میں سکندر اعظم اور راجہ پورس کے مابین دریائے جہلم کے کنارے ہونے والی جنگ کے بعد سکندر اعظم کے قافلے نے رات تھک ہار کر آرام کی غرض سے پڑاؤ ڈالا۔ صبح آنکھ کھلنے پر قافلے کے محافظ عجیب منظر دیکھتے ہیں کہ قافلے کے تمام گھوڑے گردونواح میں موجود پہاڑی پتھروں کو چاٹ رہے ہیں اور گھوڑوں کی اس انوکھی حرکت پر، قافلے کے ہم راہیوں کا تجسس، دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کانوں کے سلسلے کی دریافت کا باعث بنا۔ جس علاقے میں سکندر اعظم کے قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا آج وہ صوبہ پنجاب کے ضلع جہلم کا علاقہ کھیوڑہ ہے۔ اس جگہ کا نام لیتے ہی منہ کا ذائقہ نمکین ہو جاتا ہے۔ ہمارے کھانوں کا لازمی جزو نمک صرف ذائقے ہی کا ضامن نہیں بلکہ اس نعمت خداوندی سے انسانی صحت اور دیگر ضرورتوں کے علاوہ تزئین و آرائش کا کام بھی لیا جارہا ہے۔

(جنگ سنڈے میگزین سے)

☆☆☆

قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ

1- روما

مملکت روما (Roman Empire) تاریخ کی عظیم ترین اور طویل ترین مملکتوں میں سے ایک ہے۔ یہ مملکت کوئی ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ عظمت اور طویل عرصۂ حکومت کے لحاظ سے اہل روما (Romans) کا صرف مسلمانوں ہی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے جن کی حکومت کم و بیش اسی قدر طویل عرصے تک مہذب دنیا کے مختلف حصوں میں قائم رہی۔ مملکت روما اور مسلمانوں کی حکومت میں ایک تاریخی تسلسل یوں بھی نظر آتا ہے کیونکہ مملکت روما نے یونانی تہذیب کے زوال کے تہذیبی خلا کو پر کیا اور اسلام نے اس تہذیبی خلا کو پر کیا جو مملکت روما کے زوال سے پیدا ہوا تھا۔ دونوں آخر کار زوال پزیر ہوئیں اور زوال کے بعض اسباب مملکت روما اور مسلمانوں کے زوال کی تاریخ میں مشترک ہیں۔

3 [illegible]

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

(Constantine the Great) تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا دارالحکومت روما سے تبدیل کر کے بازنطیہ میں قائم کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد مملکت روما کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک حصے پر مغرب سے حکومت کی جاتی تھی اور دوسرے پر مشرق سے۔ اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ ہر طرف سے بیرونی حملے اور زیادہ شدت اختیار کر گئے۔ اٹلی کو بربر قبائل نے پامال کیا اور روم کی امنٹ سے اینٹ بجا دی۔ آخر کار 455ء میں آخری رومن بادشاہ رومولیس آکسٹس (Romulus Augustus) تخت سے دستبردار ہوا اور اس طرح مملکت روما تقریباً ختم ہوگئی۔

اقبال نے کہا تھا: ع

سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آئی

میں نے سواد رومتہ الکبریٰ کو دو بار دیکھا ہے اور مجھے دلی بہت یاد آتی تھی۔ دلی کسی زمانے میں میرا وطن تھا لیکن اب وہ تقابلی تاریخ (Comparative History) کے مطالعے میں میرے لیے ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ روما کے آثار قدیمہ کو دیکھ کر دلی اس طرح یاد آتی ہے کہ یہ دونوں شہر تاریخ کی نہایت عظیم مملکتوں کا مرکز رہ چکے ہیں۔ غالباً مشرق میں دلی سے بڑی مملکت کبھی قائم نہیں ہوئی اور مغرب میں روما سے بڑی مملکت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ان دونوں شہروں سے علم و فضل اور تہذیب تمدن کی کرنیں پھوٹیں جنہوں نے مشرق اور مغرب کو صدیوں تک منور کیا اور دونوں شہروں نے عظمت کا زوال بھی دیکھا اور اس طرح جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس وقت دلی اور روما کی تاریخ کا تقابل مقصود نہیں۔ میں صرف روما کا کچھ ذکر کروں گا۔ سواد رومتہ الکبریٰ میں میں نے جو کچھ دیکھا اس میں وہ پہلو زیادہ اہم ہے جس پر تاریخ میں طنطنہ ملتا ہے۔ میں نے وہ اکھاڑے بھی دیکھے جہاں رومن انسانوں کو انسانوں سے لڑواتے تھے اور اس طرح لڑواتے تھے کہ دو آدمی اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک ایک دوسرے کو قتل نہ کر دیں۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے ہیں جہاں انسانوں کو شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ میں نے وہ فورم بھی دیکھا ہے جہاں روما کے اہم سیاسی مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں اور عوام کے نمائندے ایسی مؤثر تقریریں کرتے تھے جو تاریخ اور ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں نے وہ مقام بھی دیکھا ہے جہاں جولیس سیزر کو قتل کیا گیا تھا اور سیزر نے دوستی اور دشمنی کی ساری المیہ داستان ایک جملے میں بیان کر دی تھی۔ بات یہ تھی کہ شہنشاہ جولیس سیزر پر قاتلانہ حملے کے وقت بہت سے لوگ وار کر رہے تھے لیکن جب سیزر کے دوست بروٹس (Brutus) کی تلوار نے بھی اس کے جسم کو زخمی کیا تو جسم کے مقابلے میں سیزر کے دل کو زیادہ تکلیف ہوئی اور اس نے کہا:

''بروٹس کیا تم بھی؟.....''

سیزر کے قتل کے بعد بروٹس نے ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے دلیل پیش کی تھی کہ اس نے سیزر کو کیوں قتل کیا تھا۔ بروٹس نے سیزر کو ایک مطلق العنان جاہ طلب حکمران قرار دیا تھا اور کہا تھا: ''میں سیزر سے کم محبت نہیں کرتا لیکن روم سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔''

عوام بے چارے بھولے عوام!! جو آج بھی اتنے بھولے ہیں جتنے آج سے دو ہزار سال قبل مملکت روما کے عروج کے زمانے میں تھے یا اس سے بھی بہت پہلے!!!

اہل روما کے کردار کی کئی جھلکیاں، شہنشاہی کا عروج و زوال، امراء کی سازش، دوستی، منافقت،

دھوکہ اور دشمنی، علمیت کے بجائے خطابت اور بلاغت کا اثر اور بے چارے عوام کا بھولپن۔ مملکت روما کے زوال کی داستان کے بیان میں ان پہلوؤں کی وضاحت ہو جائے گی۔

مملکت روما حضرت مسیح کی پیدائش سے ذرا پہلے قائم ہوئی اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت سے قبل زوال آمادہ ہو کر ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باقی رہ گئے جو صدیوں بعد تک قائم رہے۔ رومن امپائر ایک ایسی مملکت تھی جس کے عروج کے زمانے میں سارا جنوبی یورپ، شمالی افریقہ (مصر وغیرہ) اور مغربی ایشیا کا کچھ حصہ ایک شہنشاہ کے زیر نگیں آ گیا تھا جس کا دارالخلافہ روما تھا۔

لیکن اس قدر عظیم، وسیع، طاقتور اور پرشکوہ مملکت کو زوال کیسے آیا اور وہ کیسے مٹ گئی؟ سب سے پہلے میں ایک دلچسپ بات کا ذکر کروں گا جو مجھے مملکت روما کے زوال کے مطالعے میں نظر آئی۔ اہل روما خصوصاً اپنے زوال کے دور میں علم و حکمت میں کم دلچسپی رکھتے تھے اور سپہ گری، فنون لطیفہ، شاعری، خطابت، موسیقی، فن تعمیر اور کھیل تماشے کی طرف زیادہ راغب ہو گئے تھے۔ چنانچہ معلمی پیشہ جو یونانی تہذیب میں چند رفیع ترین پیشوں میں شمار کیا جاتا تھا، اب ایک حقیر پیشہ تصور کیا جانے لگا۔ جب علم ہی کی قدر کم ہو گئی تو معلمی کی قدر کیا رہتی لہٰذا اہل روما کے بہترین سپاہی، اعلیٰ افسر، شاعر، مقرر اور مختلف قسم کے ایکٹر اور کھلاڑی بن گئے اور تعلیم و تدریس کا کام غلاموں کے سپرد کر دیا گیا۔ جی ہاں! اس زمانے میں ہر کھاتے پیتے گھر میں غلام ہوتے تھے۔ ان میں اکثر غلام اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے تھے کیونکہ یہ کام بڑے لوگ نہیں کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام اکثر غلاموں کے سپرد تھا چنانچہ غلام ہی معلم ہوتے تھے اور شب و روز اپنے آقا کی خدمت کرنے کے ساتھ بچوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ غلاموں کو سزائیں دینا اور کوڑے مارنا عام تھا۔ اس لیے اکثر اوقات شاگرد کچھ دیر غلاموں سے پڑھتے تھے اور باقی وقت اکثر اپنے غلام استادوں کو کوڑے مارتے تھے۔ علم و حکمت کی اس توہین کے اثرات کیا ہوئے، مغربی مؤرخین گبن سے لے کر مائیکل گرانٹ اور جونز تک متفق ہیں کہ مملکت روما کے زوال میں ناقص نظام تعلیم، علوم سے بے اعتنائی اور شوق خطابت کو بہت دخل ہے۔ خالص ادبی تربیت اور شوق خطابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل روما علوم عقلیہ کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ کوئی بڑا فلسفی، سیاستدان، ماہر اقتصادیات یا سائنسدان پیدا نہ ہو سکا۔ شعر و ادب اور شوق خطابت کے علاوہ صرف ایک موضوع ایسا ہے جس پر اہل روما نے توجہ دی اور اس میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ موضوع قانون ہے۔ ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومن قوم میں عقل و فراست کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنے لیے فوری مسائل کا حل تلاش کر لیتے تھے لیکن قوموں کے زندہ رہنے کے لیے صرف فوری مسائل کا فوری حل تلاش کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ قوم کے اہل فکر کی نظر بہت دور بین ہونی چاہیے تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ آئندہ دس بیس یا پچاس برسوں میں کیا ہونے والا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یہ دور بینی تجربے، حقیقت پسندی اور ان علوم کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے جو فکر انسانی کا ماحصل ہیں اور تجربے اور عقل کا نچوڑ۔ شعر و ادب، موسیقی، خطابت وغیرہ روح انسانی کی غذا ہیں اس لیے ضروری ہیں لیکن اگر ان کی خاطر علوم عقلیہ کی طرف توجہ نہ دی جائے تو اس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ اہل روما نے ان عوامل میں توازن پیدا نہیں کیا اس لیے اتنی عظیم مملکت زوال آمادہ ہوئی اور پھر

www.urdukorner.com

ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

(ڈاکٹر آغا افتخار حسین کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

قدرت نے انسان کو بے حساب نعمتوں میں سے کوئی نعمت ایسی نہیں دی جس کے غلط استعمال سے انسان کو نقصان نہ پہنچ سکتا ہو۔ ہوا اور پانی کو لیجئے۔ یہ نعمتیں عموماً کسی کاوش کے بغیر انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں اور ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا لیکن ہوا یا پانی ضرورت سے زیادہ مقدار میں انسان کے جسم میں داخل ہو جائیں تو یہی نعمتیں موت کا سبب بن سکتی ہیں۔ انسان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ اور ماقبل تاریخ کے دور میں انسان نے قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان کے غلط استعمال سے نقصان بھی مثلاً انسان نے آگ کے فوائد بھی دیکھے اور نقصانات بھی۔ آج بھی دیکھیں کہ بجلی جو ہر انسان کو روشنی اور فرحت عطا کرتی ہے ذرا سی بداحتیاطی کی وجہ سے فوری موت کا سبب بن جاتی ہے۔

قدرت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت دین اور مذہب بھی ہے۔ بلامبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے کردار کو سنوارنے اور اسے مہذب زندگی کے آداب سکھانے اور ذہنی سکون عطا کرنے میں جتنا حصہ مذہب کا ہے کسی اور فکری عمل کا نہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ حضرت انسان نے مذہب جیسی نعمت کو بھی اکثر اپنی کج فہمی، تنگ نظری اور خودغرضی سے آلودہ کیا اور مذہب سے وہ کام لیا جو مذہب کا مقصد کبھی نہ ہو سکتا تھا یعنی مذہب کو استحصال، ظلم و تشدد، جلب منفعت، تاریک جوئی، رجعت پسندی، استعمار اور زرگری کے لیے استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات تو مذہب اور ریاست دونوں تباہ ہو گئے اور بعض اوقات مذہب کو عروج حاصل ہوا اور ریاست تباہ ہوگئی۔ مملکت روما کا زوال مؤخر الذکر تباہی کی ایک نہایت عبرتناک مثال ہے۔

گبن نے اپنی مشہور کتاب (Decline and Fall of the Roman Empire) میں مملکت روما کے زوال کے اسباب میں مسیحیت کی غلط تعبیر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اہل کلیسا پر جابجا ایسا لطیف طنز کیا ہے کہ بہت سے مذہبی راہنما اور مؤرخین گبن سے خفا رہے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

اس بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ مسیحیت (یا اس کی غلط تعبیر) کا عروج کس حد تک مملکت روما کے زوال کا سبب ہوا لیکن اس کی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں مملکت روما کے زوال کے بعد ایک ہزار سال تک یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا رہا اور اس تاریک دور میں مسیحیت کو آہستہ آہستہ اتنا عروج حاصل ہوا کہ پندرہویں صدی یا اس کے آس پاس پاپائے روم یورپ میں سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا اور یورپ کے بادشاہ ہر اہم مسئلے پر اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ پاپائے روم کے اقتدار اعلیٰ سے اہل کلیسا نے زرگری میں خوب فائدہ اٹھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عالمگیر مذہب کی طرح مسیحیت کے مبلغین اور دیگر اہل کلیسا میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی تھی جو اپنے عقل و فہم، منکسر المزاجی، زہد و تقویٰ اور خلوص کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔ انہوں نے نہ صرف انجیل مقدس کی تبلیغ کے ذریعے مملکت روما کے بت پرستوں کو خدا کی واحدانیت کی طرف دعوت دی بلکہ خود اپنی سادہ اور مقدس زندگی سے ایسی مثالیں پیش کیں کہ روما کی جاہل اور قدامت پرست قوم

مسیحیت کی طرف مائل ہوئی۔ اس ضمن میں ارباب کلیسا نے مملکت روما میں تقریباً وہی کردار ادا کیا جو صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اسلام کو مقبول بنانے میں ادا کیا تھا۔

لیکن بعض اہل کلیسا کی تعلیمات کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں زہد و تقویٰ کی دعوت سے زیادہ ایک قسم کے لالچ کی ترغیب کا عنصر زیادہ تھا یعنی لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ مسیحیت قبول کرنے سے ان کی بہت سی ایسی جسمانی خواہشات بھی پوری ہوں گی جن سے وہ محروم تھے اور یہ خواہشات اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا یعنی آخرت میں ضرور پوری ہوں گی۔ اس طرح حیات بعد ممات یا آخرت کا تصور ایک نئے انداز سے ابھرا۔ میں نے "نئے انداز" سے اس لیے کہا کہ موت کے بعد ایک اور زندگی کا تصور کسی نہ کسی شکل میں انسان کے ذہن میں صدیوں پہلے موجود تھا۔ ہندوستان میں آواگون کا نظریہ صدیوں سے موجود تھا۔ یونانی فلسفیوں نے بھی موت کے بعد زندگی کے امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مابعد الطبعیات کی روشنی میں اس کا جواز اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ روح اور جسم علیحدہ علیحدہ یا جواہر (Substances) ہیں۔ موت سے جسم تو بے حس و حرکت ہو کر مردہ ہو جاتا ہے، روح نکل جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جسم کو تو مرتے ہوئے سب دیکھتے ہیں، روح کی موت کس نے دیکھی ہے؟ ممکن ہے روح مرنے کے بعد زندہ رہتی ہو اور پھر دوسری زندگی اختیار کر لیتی ہو۔

موت کے بعد زندگی کے بارے میں قدم ہندوؤں کے تصورات نظریۂ آواگون کی شکل میں اور یونانی فلسفیوں کے افکار روح کی ازلی اور ابدی حیات کے بارے میں موجود تھے اور اہل روما میں مقبول بھی تھے لیکن ان کی مزید تائید نہ یہودی مذہب میں ملتی تھی اور نہ خود رومن مفکرین ہی نے اس تصور کو تقویت دی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون یعنی عہد نامہ عتیق (توریت) میں آخرت کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ قدیم سیزر شہنشاہوں کے دور میں اہل قلم میں بھی موت کے بعد زندگی کا تصور مقبول نہیں ہوا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ مملکت روما کے بھولے عوام میں سے اکثر مفلس تھے اور بعض اوقات اپنی زندگی سے تنگ آ جاتے تھے تو انہیں قدیم یونانی فلسفیوں کے ان اقوال کو سن کر ذرا سکون ملتا تھا جن میں اس زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد ایک دوسری زندگی کے امکان کا اشارہ کیا گیا تھا چنانچہ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے:

"بھولے عوام کو ایک روحانی مسرت کی بشارت دینا ہی کافی نہ ہوتا کیونکہ اس قسم کی مسرت ان لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہوتی جو جسمانی خواہشات بھی رکھتے تھے۔"

ارباب کلیسا میں سے بیشتر کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ اہل روما مسیحی مذہب اختیار کر کے رہبانیت کی طرف مائل ہو گئے۔ جب انہیں یہ باور کرایا گیا کہ اصل زندگی تو موت یا ظہور مسیح موعود کے بعد شروع ہوگی تو ان کی توجہ موجودہ زندگی سے ہٹ کر آخرت یا عاقبت پر مرکوز ہوگئی۔ وہ روزمرہ زندگی میں کاہل اور بےعمل ہو گئے۔ انہوں نے دوسری دنیا میں مسرت حاصل کرنے کے لیے اس دنیا کو اپنے لیے دارالحزن بنا لیا۔ انہوں نے خدا کی عبادت کو یاد رکھا لیکن انسانیت کی خدمت کو بھول گئے یا اسلام کی اصطلاح میں حقوق اللہ کی طرف توجہ کی اور حقوق العباد کو فراموش کر دیا۔ اس طرح ایک پوری قوم آہستہ آہستہ ناکارہ ہوگئی۔

تاریخ کے سیر حاصل تجزیے کے باوجود یقین سے کہنا مشکل ہے کہ کسی قوم کے عروج و زوال کے

www.urdukorner.com

اسباب کیا تھے۔ اس میں پہلی دشواری تو یہی ہے کہ تاریخ ماضی کا مطالعہ ہے اور اگر ماضی کے کسے ایسے ور کا مطالعہ کیا جائے جسے گزرے ہوئے ہزار سال ے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہو تو اس مطالعے سے ئج اخذ کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مسائل ے مضمرات اور ان کے حل کے عواقب کا احاطہ رنے کے لیے علمی بصیرت کی ضرورت تھی جس سے ملکت روما کے بیشتر دانشور محروم تھے۔ مملکت کو فکر کی صحیح بنیادیں حاصل نہ ہو سکیں اور اس طرح پانچویں صدی عیسوی میں عظیم مملکت روما مغرب میں تباہ ہو گئی......!

☆☆☆

سوچتا رہتا ہوں

آدمی اگر بے حسی، بے شرمی، بے حیائی اور ڈھٹائی کی ذرہ بکتر زیب تن کرے تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ کوئی شرمندگی، ندامت، خجالت، تاسف، پچھتاوا، احساس زیاں اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتا جبکہ حساس آدمی کے لیے زندگی کسی امتحان سے کم نہیں۔ مثلاً لوگ یورپ اور امریکہ وغیرہ ہنسنے کھیلنے کے لیے جاتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے واپس آ جاتے ہیں...... میں جب بھی جاتا ہوں، وہاں پہنچ کر جلتا، سڑتا، کڑھتا رہتا ہوں اور واپس آ کر ہفتوں سوچتا رہتا ہوں کہ ہم جو ہر اچھائی کے ٹھیکیدار ہیں۔ ”کفار مغرب“ کے مقابلے پر اس قدر گرے ہوئے اور گئے گزرے کیوں ہیں؟

وہاں گندگی دکھائی نہیں دیتی، یہاں صفائی نظر نہیں آتی۔ وہاں نظم و ضبط اپنی انتہا پر، یہاں بے سمت بھگدڑ زدہ ہجوم اور ریوڑ۔

(”چوراہا“ حسن نثار کا کالم
جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

قائد

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی قیادت باپ سے بیٹے، بیٹی، بھائی، بہن، بھتیجوں اور بھانجوں میں یوں تقسیم کی جاتی ہے جیسے خاندانی جاگیر سے رشتہ داروں کو حصہ۔ ہمارے بیشتر مسائل کا سبب یہی نظام ہے جس کے تحت نااہل، کرپٹ خاندان سیاست اور حکومت پر قابض رہتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کے سربراہان تاحیات ”قائد“ کے خطابات سے پکارے جاتے ہیں۔

☆☆☆

تلاش

مرد بیوی میں ماں تلاش کرتا ہے۔ ماں جو شفقت، محبت اور ایثار کی علامت ہے۔ وہ بیوی میں بہن بھی ڈھونڈتا ہے، جس کو چڑائے، چھیڑے، ستائے اور جو اس سے پھر بھی بے لوث محبت کرے۔ مرد بیوی میں دوست تلاش کرتا ہے جس سے وہ اپنے مسائل شیئر (Share) کرے، اپنے دکھ کہے، جس کو اپنی خوشیوں میں شریک کر کے راحت محسوس کرے۔ جس سے وہ گفتنی، ناگفتنی سب کہے۔ سب سے اور...... کبھی وہ بیوی کو زرخرید لونڈی بھی دیکھنا چاہتا ہے جو بلا چوں و چرا حکم مانے، ہر زیادتی سہے اور اُف نہ کرے۔ اس کی آنکھ کا اشارہ بھی پہچانے...... اور عورت...... کتنی آسانی سے، کیسی خوبی سے یہ سارے روپ بدل لیتی ہے......

☆☆☆

جو لوگ سیاسی اصول پسندی، نظریے سے وفاداری اور عمومی اخلاقیات کی پاسداری کی بات کرتے ہیں اب انہیں چاہیے کہ کہیں بھی واعظ یا لیکچرر کی ملازمت پکڑ لیں یا تبلیغ پر نکل جائیں۔ کتابی سچائیوں کو کاروبار سیاست میں گھسیڑنے کی کوشش نہ کریں۔ خود کو اس کنفیوژن سے نکالیں کہ سیاست

دنیا کے کسی بھی کاروبار سے مختلف شے ہے۔ ان بیچاروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دنیا کا کاروبار منافع کے لیے کیا جاتا ہے۔ گھاٹے کی ہٹی پر آخر کوئی کب تک بیٹھ سکتا ہے۔

سیاست نہ صرف کاروبار ہے بلکہ فائن آرٹ کا کاروبار ہے۔ اسی لیے تو اسے ناممکنات کو ممکن بنانے کا فن کہا جاتا ہے۔ سیاست کو آپ مذہبی، سیکولر (Secular)، دائیں یا بائیں کے خانوں میں رکھ کر خود کو تسلی دے سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت نہیں بدل سکتے کہ سیاست بذات خود ایک مذہب ہے۔ جادوئی مذہب جس میں اتنی گنجائش ہے کہ سیاہ سفید ہو سکتا ہے۔ بینگن کسی بھی وقت کریلا بن سکتا ہے اور شیر بلی میں بدل سکتا ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے ایک دن جو مسلم لیگی پنجاب کے یونینسٹ وزیراعلیٰ خضر حیات کو ٹوڈے بچہ ہائے ہائے کہہ رہے تھے اگلے دن وہی مسلم لیگی کارکن جناح خضر بھائی بھائی کے نعرے لگا رہے تھے۔

جو ذوالفقار علی بھٹو ایوب خاں کی کنونشن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے انہی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے جلسے میں ایوب کتا ہائے ہائے کے نعرے لگ رہے تھے۔ جس خان عبدالقیوم خان کو بھٹو اپنے جلسوں میں ڈبل بیرل خاں اور جس ممتاز دولتانہ کو چوہا کہہ کر پکارتے تھے وہی قیوم خاں بھٹو کے وزیرداخلہ اور دولتانہ لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر تعینات کیے گئے۔ جو جماعت اسلامی ولی خاں اور ان کے حامیوں کو ملک دشمن سمجھتی تھی وہی جماعت اسلامی بھٹو کے خلاف ہی پی این اے کے اتحاد ولی خاں کے حامیوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسی پی این اے میں شامل جمعیت علمائے اسلام انیس سو تراسی کی ایم آر ڈی تحریک میں پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ گرفتاریاں بھی دے رہی تھی اور پھر وہی جمعیت علمائے اسلام بینظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کو غیرشرعی قرار دے رہی تھی اور پھر انہی کی پارٹی کے ساتھ شریک اقتدار بھی رہی۔

جن شریف برادران نے ضیاء الحق کو روحانی باپ قرار دیا تھا اور جنہوں نے انیس سو اٹھاسی کی انتخابی مہم میں امریکی صدر فورڈ کے ساتھ بیگم بھٹو کے رقص کی تصاویر کے پمفلٹ ہوائی جہاز سے پورے لاہور میں گروائے تھے انہی شریف برادران کی آنکھیں بھٹو کی بیٹی کی موت پر روتے روتے سرخ ہو گئیں اور ان سے بڑا جمہوریت نواز فوجی آمریت کا دشمن آج پورے پاکستان میں نظر نہیں آتا۔

الطاف حسین نے مہاجر حقوق حاصل کرنے کے لیے اور ملک سے روایتی سیاست کے خاتمے کے نعرے پر جس تحریک کی بنیاد رکھی وہ بعد میں متحدہ قومی موومنٹ بن گئی۔ بینظیر ہوں کہ نواز شریف کہ پرویز مشرف کہ جام صادق کہ ارباب رحیم کہ قائم علی شاہ سب کے ساتھ شریک اقتدار ہی رہے۔

چنانچہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ بھولے بھالے دانشور اس بات کو لے کر کیوں بیٹھ گئے کہ لو جی مسلم لیگ (ق) کو ایجنسیوں کی بغل بچہ قاتل لیگ کہنے والے زرداری نے بھٹو کو چوہدری ظہور الٰہی کا قاتل سمجھنے والے بھٹو کی سزائے موت پر دستخط کرنے والے قلم کو سنبھال کر رکھنے والے اور ضیاء سے مشرف تک ہر آمر کا ساتھ دینے والے چوہدری برادران سے اتحاد کیوں کر لیا؟

ان پتلیوں کو تنقید کی نہیں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ یہ آرٹسٹ ہیں آرٹسٹ! ان کی قدر کیجیے اور اس الزام کو دھویئے کہ پاکستانی لوگ ہمیشہ اہل فن کی ناقدری کرتے ہیں۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ جینے کا ہنر جانتے ہیں۔

www.urdukorner.com

(وسعت اللہ خاں کا کالم بی بی سی اردو ڈاٹ کام یکم مئی 2011ء)

☆☆☆

ایفل ٹاور

1980ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ میں نے اس کی دھوم دھام کا حال پڑھا تھا اور مجھے پیرس دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پنتھ دو کاج کا مضمون ہو گا۔ نمائش کی ایک خاص کشش ایفل مینار تھا جو خاص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ بلند تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ چیزیں بھی تھیں لیکن یہ مینار سب سے بڑھ کر تھا کیونکہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا۔

میں نے پیرس کے نہاتاتی ریستوران کا نام سنا تھا۔ میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا اور سات دن ٹھہرا۔ میں نے پیرس کا سفر اور وہاں کی سیر دونوں میں بہت کم خرچ میں کام چلایا۔ میں شہر کا ایک نقشہ اور نمائش کی گائیڈ لے کر پیدل پھرا کرتا تھا۔ ان کے ذریعے سے انسان تمام بڑی سڑکوں پر اور خاص دلچسپ جگہوں پر جا سکتا تھا۔

مجھے نمائش کے متعلق سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ بڑی عظیم الشان تھی اور وہاں مختلف قسم کی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ایفل ٹاور مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا۔ پہلی منزل پر ایک ریستوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لیے کہ میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے، میں نے سات شلنگ دوپہر کے کھانے پر ضائع کیے۔

پیرس کے پرانے گرجے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان کی رفعت اور شوکت اور ان کا سکون جس نے وہ دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتا۔ نوتردام کی حیرت انگیز عمارت اور سنگ تراشی کے خوبصورت نمونے جن سے اس کی اندرونی آرائش کی گئی ہے ان چیزوں کی تصویر دل سے نہیں مٹ سکتی۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑوں خرچ کر کے یہ گرجے بنوائے ہیں ان کے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہو گی۔

میں نے پیرس کی تراش خراش اور وہاں کے لہو لعب کے بہت سے قصے پڑھے تھے۔ یہ چیزیں ہر سڑک پر نظر آتی تھیں لیکن گرجے ان مناظر سے الگ تھلگ دوسری ہی شان سے کھڑے تھے۔ جہاں انسان ان میں سے کسی گرجے میں داخل ہوا وہ بھول جاتا تھا کہ باہر اتنا شور و شغب ہے۔ اس کا انداز بدل جاتا اور جب وہ کسی شخص کے پاس سے گزرتا تھا جو کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہو تو اس کی نقل و حرکت سنجیدگی اور عقیدت سے معمور ہو جاتی تھی۔ مجھے جو احساس اس وقت تھا وہ اب اور گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یہ تعظیم اور عبادت محض ضعیف الاعتقادی نہیں تھی اور یہ لوگ جو کنواری بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے محض سنگ مرمر کی پرستش نہیں کر رہے تھے ان کے دل میں سچی عقیدت کا جوش تھا اور وہ پتھر کو نہیں بلکہ ذات الٰہی کو پوجتے تھے جن کا جلوہ انہیں اس میں نظر آتا تھا۔ مجھے یہ خیال کہ اس پرستش سے وہ خدا کی عظمت و جلال کو گھٹا نہیں رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔

میں چند الفاظ ایفل مینار کے متعلق بھی کہوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اس سے کیا کام لیا جاتا ہے مگر اس زمانے میں اس کی تعریف بھی بہت کی جاتی تھی اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی مذمت کرنے والوں میں ٹالسائی پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل ٹاور انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے۔ وہ تمہارا کو کو دنیا کا سب سے

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

بڑا نشہ سمجھتا تھا کیونکہ تمباکو پینے والوں سے اس کے نزدیک ایسے جرم سرزد ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی شرابیوں کو کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کو بالکل دیوانہ کر دیتی ہے مگر تمباکو سے اس کا تخیل دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے اور پادر ہوا عمارتیں بنانے لگتا ہے۔ ایفل مینار اس کے خیال میں ایسا ہی تخلیقی کارنامہ ہے جو انسان تمباکو کے نشے میں کر دکھاتا ہے۔ اس مینار میں آرٹ کی کوئی خوبی نہیں۔ اس سے نمائش کی خوبصورتی میں کوئی مدد نہیں ملی۔ لوگ اسے جوق در جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اس پر چڑھتے تھے کیونکہ وہ ایک نئی چیز تھی اور اونچائی میں بینظیر۔ یہ نمائش کا کھلونا تھا۔ جب تک ہم میں بچپن ہے ہم کھلونوں کو دیکھ کر پھسل جاتے ہیں اور یہ مینار اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھاوے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی ایفل مینار کا مقصد کہا جا سکتا ہے۔

("آپ بیتی۔ تلاش حق" مہاتما گاندھی سے اقتباس)

☆☆☆

قابل فخر شناخت

ہمیشہ مادر وطن سے پیار کرو جتنا کر سکو کیونکہ مادر وطن ہماری تمام ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے۔ غذا، چھت، محبت، پیسہ، شہد، ہماری زندگیوں میں رنگینیاں، ہمارے بچوں کے لیے تفریح، پھلوں میں ذائقے، دلوں کو لبھانے والا حسن، اچھے دوست، خوبصورت نظارے، جنہیں ہم ہر طرف دیکھ سکتے ہیں۔ گھومنے کے لیے ایسی بے شمار جگہیں جہاں ہم جسمانی تلاشی دیئے بغیر جا سکتے ہیں۔ وہ عزت جو ہمیں ملتی ہے اور بزرگوں کی دعائیں جو ہمیں نصیب ہوتی ہیں۔ اپنے پیاروں کی نیک خواہشات، خوبصورت پھولوں اور پھلوں سے بھرے پیڑ، موسموں کی بدلتی ہوئی ہوائیں، ہرے بھرے میدان، سمندر، صحرا، پہاڑ اور وہ تمام مسکراہٹیں جو ہر روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ احساس ملکیت جو مادر وطن ہمیں عطا کرتی ہے۔ یہ احساس کہ ہم سب یکجا ہیں اور خاندانی روایات عظیم تہذیب، قابل فخر شناخت، رومانی بارشوں کے موسم، سحر انگیز سورج، قوس قزح، دلکش برف باریاں، خوبصورت جھیلیں، روح کو تازگی عطا کرتی بہار کی ہوائیں، رنگ برنگے پرندے، نظروں میں رنگ بھرتی تتلیاں، یہ سب چیزیں ہمیں سب کو اپنا سمجھنے اور سب سے محبت کرنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔

("سویرے سویرے" نذیر ناجی کے کالم جنگ ملتان سے اقتباس)

☆☆☆

ایسی عیاشی

آج پاکستان میں مسئلہ حل ہو نہ ہو لیکن کوئی بھی سڑک پر ٹائر جلا سکتا ہے۔ دھرنا دے سکتا ہے۔ سرکاری املاک پر پتھراؤ کر سکتا ہے۔ ریلی نکال سکتا ہے اور بھٹے پہ کھڑے ہو کر جہاں چاہے تقریر کر سکتا ہے۔

ذرا سرکاری حکام کی تحریری اجازت کے بغیر ایسی عیاشی منامہ، ہوانا، ہنوئی، بیجنگ، ماسکو، اشک آباد یا مسقط وغیرہ میں تو فرمائیے۔ کھال میں بھوسہ نہ بھروا دیا جائے تو بات ہی کیا ہے؟

(بی بی سی ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

ٹیکنالوجی

امریکی معیشت بنیادی طور پر ٹیکنالوجی میں تیز ترین ترقی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوئی ہے کیونکہ پیداوار میں جدید ترین مشینری کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی وجہ سے لیبر (Labour) کی [illegible]

بیروزگاری بڑھتی ہے اور لوگوں کی قوت خرید میں کمی ہوتی ہے۔ (ڈاکٹر قیس)

☆☆☆

تقریب رونمائی

میرے مشاہدے اور تجربے کی حد تک قلمکاروں کے اعزاز میں تقریبات صرف دو صورتوں میں منعقد ہوتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ قلمکار صاحب حیثیت ہو اور دوسری صورت یہ کہ وہ انتقال فرما جائے۔ صاحب حیثیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا بااثر ہو کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب یا دیوان کے بارے میں دو چار ایسی ادیب نما شخصیتیں فراہم کر سکے جو سرعام یہ اعلان کریں کہ ایسی کتاب اس سے پہلے دنیائے ادب میں نمودار نہیں ہوئی۔ پھر کسی انجمن کے عہدیداروں سے مل کر تقریب رونمائی منعقد کرا سکے اور اتنا صاحب مال ہو کہ وہ ایسی تقریب پر اٹھنے والے اخراجات اپنے دائیں ہاتھ سے اس طرح ادا کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ تقریبات رونمائی زمانہ حال کا چسکا ہے۔ قیام پاکستان کے بہت بعد تک ایسی تقریبات کا سراغ نہیں ملتا۔ دراصل ہر انسان میں خودنمائی کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور ہر ایک کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔

معاشرے نے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہے کہ ہر شخص کو کم از کم دو مواقع ایسے دیئے جائیں جب وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔ ایک موقع تو انسان کی شادی کا ہوتا ہے جب وہ بارات کا دولہا ہوتا ہے اور دوسرا...... جب اس کا جنازہ اٹھتا ہے یعنی ایک مرنے سے پہلے، دوسرا مرنے کے بعد۔ انتقال پر [illegible] جو "تقریبات" ہوتی ہیں ان میں بھی مرکزی موضوع سخن، مرنے والے کی ذات گرامی ہی ہوتی ہے۔

بات ہو رہی تھی ذوق نمود کی۔ اب کچھ لوگوں میں نمود و نمائش کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں محض ایک تقریب سے مطمئن نہیں ہو پاتے بلکہ بار بار نگاہوں کا مرکز بننا چاہتے ہیں۔ شریعت نے ایسے افراد کے لیے چار مواقع کی گنجائش رکھی ہے لیکن عدل کی شرط کے ساتھ۔ جب عدل کو بھی جنگ و جدل کا سامنا ہو تو سہل ترین نسخہ یہ ہے کہ انسان ایک کتاب لکھے یا (لکھوائے) اور اس کی تقریب رونمائی کی آڑ میں خودنمائی کا اہتمام کرے۔ بعض لوگوں کے ہاں کتاب کی اشاعت سے زیادہ تقریب رونمائی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب کی اشاعت مؤخر اور تقریب رونمائی مقدم ہو جاتی ہے۔ آپ میں سے جن خواتین و حضرات کو تقریر کا ملکہ حاصل ہے اگر ان سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ کسی کتاب کو دیکھے بغیر اس پر تقریر کریں تو وہ کیا کہیں گے؟

ان گنہگار آنکھوں کو ایک ایسی ہی تقریب دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ تقریب مری کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہونا تھی۔ ہم مری سے کچھ دور کالج آف آرمی ایجوکیشن میں تعینات تھے۔ بہت دن پہلے سے یہ حال تھا کہ جب بھی مری آنا ہوتا، مصنف مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ملتے اور یاد کرواتے کہ تقریب رونمائی فلاں دن ہو رہی ہے، ضرور تشریف لائیے گا۔ موسم گرما میں مال روڈ پر خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ مصنف نے نہ جانے کتنے ہزار افراد کو شرکت کی دعوت دی ہوگی۔ ان کی محنت رنگ لائی۔ وقت مقررہ پر ہم مری پہنچے تو ٹاؤن ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ صدارت ایک وفاقی وزیر نے کرنا تھی اور آزاد کشمیر کی ایک اہم شخصیت

www.urdukorner.com

مہمان خصوصی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ سامعین سے بھرے ہوئے ہال میں ادب کے شیدائی کتنے تھے اور وفاقی وزیر اور کشمیر کی شخصیت سے درخواستوں پر دستخطوں کے طالب کتنے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹاؤن ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن مصنف بڑی بے قراری کے عالم میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ جب کافی دیر تک تقریب شروع نہ ہوئی تو ہم صورتحال جاننے کے لیے نیچے آئے اور ان سے ان کے اضطراب کا سبب پوچھا۔ انہوں نے سڑک پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

''سر! دعا کیجئے۔ کتاب ابھی تک چھپ کر نہیں آئی۔ پبلشر نے وعدہ تو کیا تھا کہ وقت پر کتابیں لے کر پہنچ جائے گا۔ جانے کہاں مر گیا ہے؟'' اب معلوم نہیں کہ یہ صاحب سادہ دل تھے کہ پبلشر کے وعدے پر اعتبار کر بیٹھے یا تقریب رونمائی کا شوق ان کے ہاں فروزاں تھا۔

اب ہوا یہ کہ صاحب صدر بھی تشریف لے آئے۔ مہمان خصوصی بھی پہنچ گئے۔ سامعین بھی موجود تھے اور مقررین بھی زور خطابت دکھانے کے لیے بے چین۔ گویا سارے لوازمات پورے تھے اب محض ایک چھوٹی سی کتاب نہ ہونے سے تو تقریب رونمائی رُک نہیں سکتی تھی۔ ہم مبہوت ہو کر ان مقررین کو سن رہے تھے جو کتاب پڑھے بغیر نہیں، دیکھے بغیر ہی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ اس سے پہلے یہ تو دیکھا اور سنا تھا کہ لوگ کتاب کا دیباچہ یا فلیپ پڑھ کر ہی کتاب پر تبصرہ لکھ مارتے ہیں لیکن کتاب دیکھے بغیر اس پر اچھی خاصی تقریر کر ڈالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر مقررین کہہ کیا رہے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے ایک تقریر سے اقتباس:

''معزز سامعین! اگرچہ میں نے کتاب نہیں دیکھی لیکن میں مصنف کے قلم کی کاٹ سے بھی آگاہ ہوں اور ان کے خیالات کی روانی سے بھی واقف۔ وہ جب لکھتے ہیں تو دریاؤں کی روانی شرمندہ ہو جاتی ہے اور ہواؤں کی سرسراہٹ رُک جاتی ہے۔ پہاڑوں کی بلندیاں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور زمین کی وسعتیں ان کے احاطۂ قلم میں آ کر سمٹ جاتی ہیں۔''

ابھی چند روز پہلے ہمیں ایک ایسی تقریب میں شرکت کے لیے بااصرار بلایا گیا جو ایک دو نہیں بلکہ پورے پانچ ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں بہ یک وقت منعقد ہو رہی تھی۔ ایسی تقریبات چونکہ عام طور پر دیر سے شروع ہوتی ہیں اس لیے ہم ازراہ احتیاط ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچے لیکن وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ لوگ ہم سے بھی زیادہ محتاط ہیں۔ تین سو نشستوں کے ہال میں صرف تین افراد تھے، ایک مصنف، ایک صاحب صدر اور ایک سٹیج سیکرٹری۔ ان کے آنے کی ترتیب ہمیں معلوم نہیں۔ ویسے اس دن خیال آیا کہ کسی سے تنہائی میں راز کی باتیں کرنی ہوں تو بہترین جگہ کسی ادبی انجمن کے زیراہتمام ہونے والی تقریب ہی ہے جہاں انسان مقررہ وقت پر پہنچ جائے تو خلوت کے دو تین گھنٹے بڑی آسانی سے میسر آ سکتے ہیں۔ ہم جس تقریب کا ذکر کر رہے ہیں وقت مقررہ سے دو گھنٹے بعد اس کا یہ حال تھا کہ جن کے اعزاز میں تقریب ہو رہی تھی ان کے واقف کاروں، ادبی انجمن کے عہدیداروں اور وڈیو فلم بنانے والے کیمرہ مینوں سمیت کل افراد ہال میں لگی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی تعداد سے بھی کم تھے اور ظاہر ہے کہ تقریب کے آغاز کے آثار دور دور تک ناپید تھے۔ اس سے زیادہ صبر ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہم مقررین کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہوئے بغیر ہی واپس آ گئے۔ دوسرے دن بجائے اس کے کہ دو گھنٹے صبر کی داد ملتی، اُلٹی شکایات سننے کو ملیں کہ

www.urdukorner.com

آپ جائے واردات سے فرار کیوں ہو گئے تھے۔ بس آپ گئے ہیں تو ہال بھر گیا اور اتنی زبردست تقریریں ہوئیں کہ...... اس دن کے بعد سے ادبی تقریبات میں جانا ہم نے اور بھی کم کر دیا ہے۔ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ منتظمین کو پتہ چل گیا کہ اصل سامعین ہمارے جانے کے بعد آئیں گے تو کہیں وہ ہمیں اُٹھا ہی نہ دیں۔

تو سامعین کرام! بات یہاں سے چلی تھی کہ میں اس تقریب کے منتظمین کا قطعاً شکر گزار نہیں ہوں۔ اس لیے کہ ایک الجھن ہے جو دور نہیں ہو پا رہی۔ میں نے کہا کہ قلمکاروں کے اعزاز میں تقریب صرف دو ہی صورتوں میں منعقد ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ مصنف صاحب حیثیت ہو اور دوسری صورت یہ کہ قلمکار انتقال فرما جائے۔ بحیثیت قوم ہمارا وطیرہ یہی ہے کہ سچے قلمکاروں کی قدر ہمیں ان کے مرنے کے بعد ہی آتی ہے۔ زندگی میں ہم ان کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں آپ خود اس کے گواہ ہیں۔ بقول غالب

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملی داد مگر روز جزا ہے تو سہی

(''جنٹل مین سبحان اللہ'' کرنل اشفاق حسین کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

حسرت کی زندگی

مولانا حسرت موہانی کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ تھی۔ وہ فقر و استغنا کی زندہ تصویر تھے۔ دنیاوی لحاظ سے وہ بڑی مختصر تمنائیں رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اپنا خرچ اتنا محدود کر رکھا تھا کہ صرف پانچ روپے ماہوار میں اپنا کام چلا لیتے تھے۔

حسرت نے روپے پیسے کی کبھی پروا نہیں کی بلکہ اس سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''اردو پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تشریف لائے تھے...... سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لیے پیش کیا گیا تو بولے کہ یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں اور دراصل میں دہلی جا رہا ہوں۔ پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں اُتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں۔ پھر کرایہ کیسا اور ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں؟ طعام و قیام تو آپ کے ہاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے مزے کی رد و قدح ہوتی رہی اور علی گڑھ سے اپنی اُلفت کا اظہار کرتے رہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ لکھنؤ ریڈیو سٹیشن پر پیش آیا۔ ایک پروگرام کے خاتمے پر حسرت نے ریڈیو والوں کے شدید اصرار پر صرف تین آنے پیسے لینے منظور کئے اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اتنی بڑی رقم لے کر ہم کیا کریں گے؟''

حالانکہ اس پروگرام کے لیے وہ کان پور سے آئے تھے لیکن انہوں نے کہا کہ میں گھر سے کان پور سٹیشن تک پیدل آیا ہوں۔ ریل میں خفیہ پولیس والوں کی بدولت برف کے ڈبے میں مفت سفر کیا ہے۔ لکھنؤ سٹیشن سے ریڈیو سٹیشن تک سرکاری موٹر میں آیا ہوں۔ یہی موٹر سٹیشن تک لے جائے گی پھر روپے کس کام کے لوں۔ ایسا ہی اصرار ہے تو احتیاطاً واپسی سفر کے لیے لکھنؤ سے کان پور تک تیسرے درجے کا کرایہ تین آنے دے دو۔

دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کی رکنیت کے زمانے میں بھی حسرت کے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب دوسرے ممبران شاندار ہوٹلوں اور بنگلوں میں ٹھہرتے تھے، وہ سیکرٹریٹ کے کنارے ایک قدیم مسجد کے حجرے میں قیام فرماتے تھے یا گلی

www.urdukorner.com

قاسم جان میں دفتر ''الامان'' کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے پچھتر روپے یومیہ بھتہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس پر احتجاج کیا تھا کہ ممبروں کے لیے اتنی بڑی رقم یومیہ بھتہ لینا ہندوستان کے غریب اور فاقہ کش عوام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

(''حسرت موہانی'' ڈاکٹر احمد لاری کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

مجسمہ آزادی ایک سال کے لیے بند

نیویارک کا مشہور لینڈ مارک سٹیچو آف لبرٹی (مجسمہ آزادی) کو مرمت کے لیے ایک سال کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کے وزیرداخلہ کین سلازار کا کہنا ہے کہ 305 فٹ بلند تانبے کے اس مجسمے کی مرمت پر ساڑھے ستائیس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔

نیشنل پارک سروس کا کہنا ہے کہ اس 125 سالہ پرانے مجسمے میں نئی لفٹ اور نئی سیڑھیاں لگائی جائیں گی تاہم اس کی مرمت کے دوران لبرٹی آئی لینڈ عوام کے لیے کھلا رہے گا۔

اس مجسمے کو 1886ء میں فرانس نے امریکہ کو تحفے میں دیا تھا۔ ہر سال لبرٹی آئی لینڈ پر پینتیس لاکھ لوگ آتے ہیں تاہم مجسمے کے اوپر جانا ممنوع ہے۔

ستمبر گیارہ کے حملے کے بعد کچھ سال تک سکیورٹی وجوہات کے باعث سیاح مجسمے کے اوپر نہیں جا سکتے تھے تاہم 2001ء کے کچھ سال بعد سیاحوں کو ابزرویٹری پر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

حکام کے مطابق مجسمے میں پرانی سہولیات سیاحوں کے لیے نہیں بلکہ مجسمے ہی کے لیے خطرناک ہیں۔

کین سلازر کا کہنا ہے ''دو سال قبل جب ہم نے سیاحوں کو مجسمے کے اوپر جانے کی اجازت دی تو ہم نے تنبیہہ کی تھی کہ ہم مجسمے کے اندرون کو سیاحوں کے لیے زیادہ محفوظ اور پرآرام بنائیں گے اور آج جب ہم یہ مجسمہ بند کر رہے ہیں تو ہم اس انیسویں صدی کی سہولیات کو اکیسویں صدی کی سطح پر لائیں گے۔''

(بی بی سی ڈاٹ کام پر رپورٹ)

☆☆☆

ایک دن عید اور ایک دن روزہ

ترچی قوم کی ایک آدھ خوشی کو بھی چند لوگ غارت کر دیں تو اس کا ذکر کیے بغیر کیسے خاموش رہا جا سکتا ہے۔ ہمارا گھرانہ اٹک کے آر پار تقسیم ہے۔ والدہ اور چھوٹے بھائی اپنے بچوں سمیت میرے ساتھ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ بڑے بھائی، بہنیں، چچا، ماموں وغیرہ سب مردان، نوشہرہ اور مہمند ایجنسی میں رہائش پذیر ہیں۔ مقامی مولویوں کے حکم پر ہر سال وہ ہم سے ایک دن پہلے روزہ رکھتے اور عید مناتے ہیں۔ عید سے قبل کے دو روز میرے پشاور میں گزرے اور مزید ایک روز ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن رات کو وہاں چاند دیکھنے کی مبینہ شہادتیں موصول ہوئیں اور مسجد قاسم علی خاں نے اگلے روز عید منانے کا اعلان کیا تو میں اپنے روزے کو بچانے کے لیے رات گئے واپس اسلام آباد آ گیا۔ یوں جس دن میرے سگے بھائی بہنوں کی عید تھی، اسی دن میرا، میری والدہ کا، اہلیہ کا اور یہاں پر مقیم بھائی اور بھابی کا روزہ تھا۔ یہ صرف میرا معاملہ نہیں اسی طرح کے ہزاروں گھرانے ہر عید پر اسی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ملک کے چند مولوی اور بالخصوص دو مفتی صاحبان ہر سال ہماری عید کی خوشی کا یہی حشر کر دیتے ہیں۔ پشاور، چارسدہ اور مردان کے بعض مولوی صاحبان نے ہر سال چاند ایک روز قبل دیکھنے کی جبکہ مرکزی روت ہلال کمیٹی نے ان کی

www.urdukorner.com

شہادت کو قبول نہ کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے یہ مسلکی جنگ ہے، اپنی اپنی دکانداری کا معاملہ ہے یا پھر ان مخصوص ایام میں ٹی وی پر آنے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا شوق ہے لیکن بہر حال اب ہم جیسوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی یا پھر خیبر پختونخوا کے ان مولوی صاحبان کے پاس مینڈیٹ تھا (مرکزی رویت ہلال کمیٹی یا پھر کمیٹی کے پاس قانونی اور خیبر پختونخوا کے بعض مولویوں کے پاس غیر قانونی مگر عملی) اس لیے ہم جیسے خاموش رہے۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی اور خیبر پختونخوا کے یہ مولوی صاحبان رویت ہلال کا یہ تنازعہ حل نہیں کر سکتے۔ ہم نے ساتھ سال انتظار کیا لیکن یہ عید ایک کر سکے اور نہ روزے کو۔ اس لیے خدارا ہمیں ان دونوں سے نجات دلا دی جائے۔

سیدھی سی بات ہے اگر پوری عرب دنیا، افغانستان اور یورپ و امریکہ کے مسلمان سعودی عرب کے اعلان کے ساتھ عید منا سکتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو مکہ مدینہ کے ساتھ منسلک کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ تجویز قبول نہیں تو پھر مرکزی رویت ہلال کمیٹی ختم کر کے مقامی رویت ہلال کمیٹیوں پر پابندی عائد کی جائے۔ محکمہ موسمیات اور فلکی ماہرین سائنسی بنیادوں پر فیصلہ کریں اور وزارت مذہبی امور اس کا اعلان کرے۔ ہمیں نہ خیبر پختونخوا کے ان مولوی صاحبان سے کسی خیر کی توقع ہے اور نہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی سے۔ ان دونوں نے ہمارے روزے اور عید کو بے مزہ کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا۔ اب کوئی تیسرا آئے اور ہمارے روزے اور عید کا فیصلہ کرے۔ ہمیں ایک دن عید اور ایک دن روزہ چاہیے۔ وہ کوئی بھی کسی بھی طریقے سے لے آئے۔

(''جرگہ'' سلیم صافی کے کالم سے اقتباس)

☆☆☆

ناعاقبت اندیش حکمران

ہمارے مغل بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے محل، مسجدیں، مقبرے تعمیر ہوئے جن کی شان و شوکت کی دنیا معترف ہے لیکن خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔ کیا ہمارے اس سنہری دور میں کوئی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی؟ یا عوام کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئی سکیم مرتب ہوئی؟ کوئی ایسا عالم بھی پیدا ہوا جس کے افکار نے دنیا کو متاثر کیا ہو؟

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہدایت کی کہ لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے لحاظ سے گفتگو کرو۔ اسی طرح حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار کہا کہ علوم کے بعض مقامات عام آدمیوں کو نہیں سمجھائے جا سکتے لیکن تاریخ میں ہوا کہ ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے کوشش کی کہ لوگ ان کے غلط یا صحیح احکامات کے مطابق عمل کریں۔ اس میں تو وہ بہت حد تک کامیاب ہو گئے لیکن انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ لوگ ان کے احکامات کے مطابق سوچیں اور فکر کریں۔ اس کے نتائج خطرناک ہو گئے۔ فکر کو جس قدر دبایا گیا وہ بے چین ہو کر ابھری اور شدت کے ساتھ ابھری۔ اہل فکر کو قید کیا گیا، سولی پر چڑھایا گیا لیکن ان کی فکر زندہ رہی کیونکہ فکر کو نہ قید کیا جا سکتا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا جا سکتا ہے۔

(''ناتمام'' ہارون الرشید کے کالم سے ماخوذ)

☆☆☆

چوٹ

عمر رواں کا جہاز چلا جاتا ہے۔ دنیا گزرگاہ عام ہے۔ راگ و رنگ، حسن جمال، عیش و نشاط کے یہاں جمگھٹ ہیں۔ دیکھنا کہیں ان کے مزوں میں آ کر کود نہ پڑنا ورنہ ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہسپتالوں تک لے جانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

لیبیا

شمالی افریقہ کا ایک اسلامی ملک

سید وقار عظیم جعفری

قرہبی لوگ بھی اختلاف کرتے تو معلوم ہونے کی صورت میں سخت سزائیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ کرنل معمر القذافی نے کرپشن، بے ایمانی، ناانصافی اور عوام دشمنی کو جڑ سے اکھاڑ دیا لیکن لوگ دب دبے اور خوفزدہ صورت میں جہاں موقع ملتا اس کا ذکر کبھی کبھی کرتے تھے۔ آخر کار ملک کے اندر یہ لاوا بھی پکتا رہا۔

لیبیا کی تاریخ اور موجودہ حالات کے حوالے سے تحقیقاتی مضمون

دنیا میں بڑی طاقتوں، بڑے ملکوں اور بڑے لوگوں نے ہمیشہ اپنے سے کمزور لوگوں پر صدیوں حکومت بھی کی اور صدیوں سے ان پر ظلم و جبر کئے رکھا۔ یہی دنیا کی تاریخ کا سچ ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا تھا اور آج بھی دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور شاید جب تک ملک و قوم اور لوگ کمزور ہوں گے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ خداوند کریم نے تو اپنی پوری زمین انسانوں کے لیے دنیا جہاں کی نعمتیں سجا کر تخلیق دی تھی لیکن انسانوں نے انسانیت کو قتل و غارت، غلامی اور کشت و خون، بھوک اور افلاس دی۔ یہ کون تھے اور کیا تھے؟ یہ سب طاقتور تھے؟ یہاں سے ہی تاریخ انسانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر انسانیت نے اپنے آپ کو تبدیل نہ کیا تو شاید یوم قیامت سے پہلے بھی ان پر قیامت آ جائے گی۔ اسی طرح انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن بڑی طاقتوں نے اس کو غلام بنا لیا۔ اس تسلسل میں بیتے ہوئے پہلی جنگ عظیم اور دوسری

www.urdukorner.com

جنگ عظیم برپا ہوئی۔ دونوں ہی غلام بنانے کے لیے لڑی گئیں۔ آخر بچی کھچی قومیں دوسری جنگ عظیم تک مکمل غلامی اور تسلط پر مبنی پروگرام پر اختتام پذیر ہوئیں۔ اسی تباہی و بربادی کے منظرنامے میں امریکہ و یورپ کی تباہی، براعظم ایشیا اور عرب و افریقہ کو صدیوں بعد آزادی نصیب ہوئی۔ یونہی تاریخ کے جبر کے بعد حوصلہ مند قوموں کو آزادی ملی اور پھر کچھ قوموں پر معلوم نہیں کس ادا کی پسندیدگی پر قدرت کا دنیا کا سب سے بڑا سونے کی شکل کا سیال تیل نکل آیا جو کہ پوری دنیا کی موجودہ ضرورت ہے جس کے بغیر نہ ہی موجودہ وقت میں زندگی اور نہ ہی گاڑی اور نہ ہی ایجاد کردہ کسی مشینری کا پہیہ چل سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں آج ایک نوآزاد مملکت جو کہ یکم ستمبر 69ء میں چند فوجی افسران نے (جو کہ چھوٹے بڑے رینک کے تھے) اپنے عوام اور ملک کی غربت اور افلاس کو دیکھ کر انقلاب برپا کیا اور صدیوں سے قائم کردہ غلامی کا نشان (king system) بادشاہی نظام توڑ دیا اور اقتدار سنبھال لیا۔ یہ مضمون براعظم شمالی افریقہ کے ایک ملک لیبیا کا ہے اور وہاں انقلاب کا بانی ایک چھوٹی سی عمر کا ایک نوجوان ''محمد معمر'' جو کہ اس وقت میجر کے عہدے کا افسر تھا اور جس کے خانہ بدوش قبیلے کا نام ''القذافی'' تھا اس نے اپنے تین چار دوستوں میجر عبدالسلام (جالود) اور میجر محمد مسعود اور دیگر سے مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار سنبھال لیا اور بادشاہی نظام کے اختتام کا اعلان کر دیا اور سامراجی تسلط رکھنے والے ملکوں کی افواج اور لوگوں کو اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ لیبیا میں انقلاب سے پہلے ترکی اور اٹلی نے باری باری حکومت کی اور استعماری قوتوں نے اس کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ بعدازاں قبائلی لیڈر اسلام اور ملک کی محبت سے سرشار اور ایک مرد عظیم عمر مختار نے غیر ملکی قوتوں سے جنگ لڑی جو کہ ایک گوریلا جنگ تھی اور اس جنگ میں شہادت پائی۔ عمر مختار لیبیا کے عوام کے سب سے بڑے ہیرو تھے اور بعدازاں استعماری قوتوں کی سازش سے شاہ ادریس کو حکومت پر بٹھایا گیا اور اپنے مقاصد حاصل کیے گئے۔

بعدازاں یکم ستمبر 69ء کو کچھ فوجی افسران (جو کہ جوان تھے) نے لیبیا میں انقلاب برپا کیا اور حکومت سنبھال لی اور ملک کو نئے اور جوان جذبے سے ترقی کی منزل پر گامزن کیا۔ موجودہ حالات میں اس وقت گو کہ فوجی انقلاب 42 سال بعد متنازعہ ہو گیا ہے پھر بھی مخالفت اور حمایت کے باوجود غیر جانبدارانہ سوچ کے مطابق لیبیا کے عوام کی قسمت کی تبدیلی اور تعمیر اور ترقی فوجی انقلاب کے بعد ہی ہوئی۔ لیبیا جو کہ رقبے کے لحاظ سے ایک بڑا ملک اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا افریقی ملک ہے میں اس وقت تقریباً ساڑھے 6 ملین آبادی موجود ہے۔ پاکستان سے بڑا رقبے کے لحاظ سے اور آبادی کے لحاظ سے آدھے لاہور کے برابر ہے۔ لوگوں کی زبان عربی ہے اور دوسری زبانیں اٹالین اور ترکی بھی سمجھی جاتی ہیں۔ تیل برآمد کرنے والے بڑے ملکوں میں یہ ملک افریقہ اور عرب میں اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی پوری ایک پٹی بلکہ آدھے سے زیادہ ملک کے شہر سمندر کے کنارے آباد ہیں۔ دوسرا حصہ صحراؤں، ریتوں اور پہاڑوں کا ہے۔ قدرت بھی اس ملک کی خوبصورتی پر کافی مہربان ہے۔ کچھ گرم علاقے ہیں اور کچھ سرد۔ پہاڑوں اور سمندر کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا نہایت مناسب اور صحت مند ہے۔ دارالحکومت، صوبہ، شہر طرابلس (ٹریپولی) میں بالکل اٹالین اور ترکی رہن سہن اور پرانی تعمیر و ترقی ہے۔ لوگ زیادہ جدت پسند اور پڑھے لکھے نہیں۔ یہ سمندر کے

کنارے بندرگاہ کے قریب آباد ہیں۔ یہاں ہی حکومت کے ادارے اور فوجی ہیڈ کوارٹر ہے۔ اسی پٹی پر تقریباً 250 کلومیٹر پر کرنل معمر القذافی کا آبائی علاقہ مصراتہ اور اس کے قریب سیرت ہے۔ شنید ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ کرنل قذافی کا خاندان بھی دوسرے غیر ترقی یافتہ علاقے کی طرح ''خانہ بدوش'' زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت یہاں بے انتہا غربت تھی بلکہ یہ علاقے ترقی سے ناآشنا تھے لیکن اب وہ حالات نہیں رہے۔ لیبیا کا دوسرا بڑا صوبہ بن غازی ہے۔ یہ بھی بندرگاہ اور سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ دوسرے صوبے کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ کھلا اور کشادہ شہر ہے۔ دارالحکومت طرابلس سے یہاں کی زندگی اور لوگ مختلف ہیں۔ یہاں سے صحرا کی طرف نکلنے والے راستے پر اجرابیا کفرہ اور سباء ہے اور پہاڑوں اور سمندر کے ساتھ پٹی پر صوبہ بن غازی کے شہر عبیدہ، درنہ، لبروق اور طبروق کے شہر آباد ہیں۔ یہ سب سمندر کے کنارے پر ہیں۔ سمندر کی پٹی پر اس صوبہ کا آخری شہر طبروق ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ، مہمان نواز اور خوبصورت قد و قامت کے لوگ ہیں اور مسلمانوں سے محبت یہاں کے لوگوں کو وراثت میں ملی ہے۔ اسی طرح لیبیا کا تیسرا بڑا صوبہ سباء ہے جو کہ ایک بڑے صحرا پر مشتمل ہے۔ اس کے شہروں میں عبیدہ، کفرہ، غایت اور دیگر شہر شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ اصل افریقن ہیں اور اسی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ حکومت نے ان کے لیے دیگر ترقی یافتہ علاقوں کی طرح ائیرپورٹ، گھر، سڑکیں، ہسپتال، مساجد اور سکول بنوائے ہیں۔ گو کہ یہ تمام علاقہ صحرائے اعظم کہلاتا ہے لیکن اس پر خوبصورت آبادیاں بنا کر جنگل میں منگل بنا دیا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ سادہ اور ایماندار ہیں۔ آخر الذکر دونوں ہی صوبوں کے لوگوں میں ریاکاری اور مکاری نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ سباء کے لوگ مجموعی طور پر سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں لیکن اب ان دونوں صوبوں کے لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تو تمام صورتحال وہاں کے لوگوں کی زندگی گزارنے کے طریقے کی ہے۔ اب مضمون کی طرف آتے ہیں۔ سابقہ کرنل قذافی کے دور حکومت میں کیا کریڈٹ ہے اور کیا ڈس کریڈٹ ہے۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے تصویر کا ایک رخ نہیں بلکہ دونوں طرف کی تصویر پیش کرنا اشد ضروری ہے گو کہ کرنل معمر القذافی ایک سخت ترین حاکم تھے، اس کا نظام حکومت ایک ظالمانہ جکڑاؤ تھا، مخالفین پر ازحد جبر کیا گیا، سیاسی سوچ کو بالکل ختم کر دیا گیا حالانکہ انقلاب سے پہلے بھی بہت سے لوگ حکومت سے الگ تھلگ اپنی خانہ بدوش زندگی اور عیش و عشرت، قہوہ خانوں کی زندگی میں مست تھے اور غریب بھی کبھی کبھی کلبوں میں عیش کر لیا کرتے تھے۔ لیبیا کے لوگوں کے گھروں میں مصری عورتوں سے شادیوں اور رشتہ داریوں کے ناطے قہوہ خانہ اور شراب کا رواج عام تھا۔ انقلابی حکومت نے افریقیوں سے یہ عیاشی بھی چھین لی جس کی وجہ کرپٹ اور بے ایمانوں کے محدود طبقے میں قذافی کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ پھر زائد دولت اور کالا دھن بھی چھین لیا گیا۔ اپنے ساتھ انقلاب لانے والے کچھ لوگوں پر غداری یا کسی بھی جرم کو ناقابل برداشت قرار دے کر یا تو قتل کر دیا گیا یا ہمیشہ کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس طرح کرنل قذافی کو اور اس کے حواریوں کو بہت سے میدانوں میں اکیلے جنگ کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اپنے قریبی لوگ بھی بعض اوقات اختلاف کرتے یا دبے لفظوں میں کوئی بات کرتے تو معلوم ہونے کی صورت میں سخت سزائیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ کرنل معمر

www.urdukorner.com

القذافی نے کرپشن، بے ایمانی، ناانصافی اور عوام دشمنی کو جڑ سے اکھاڑ دیا لیکن لوگ دبے دبے اور خوفزدہ صورت میں جہاں موقع ملتا اکثر ظلم اور جبر کا ذکر کبھی کبھی کرتے تھے۔ ملک کے اندر حکومت مخالف جذبات کا یہ لاوا پکتا رہا۔ 42 سال بعد یہ تمام مخالف قوتیں اکٹھی ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا جس کو تمام دنیا آج دیکھ رہی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے کرنل معمر القذافی کے اقدامات جو کہ عوام کے لیے کئے گئے ان کا ذکر کروں گا:

1- کرنل معمر القذافی نے شہنشاہ شاہ ادریس کی حکومت کا تختہ الٹ کر شہنشاہی نظام جو کہ سامراجی قوتوں کا نافذ کردہ تھا، اسے جڑ سے اکھاڑ دیا۔ اس شہنشاہی نظام کی خرابیوں سے اپنی قوم کو محفوظ کیا۔ حکومتی سسٹم کو نئے سرے سے جداگانہ طرز پر تیار کیا۔

2- ملک کو تیل کی دولت سے مالا مال کیا۔ قومی دولت کو سوشلزم کے اقتصادی جکڑاؤ میں رکھ کر بینک سسٹم کو محفوظ کر دیا۔ کسی غیر ملکی بینک کو ملک میں کام کرنے کی اجازت نہ دی۔

3- قومی دولت کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا۔

4- علاج معالجہ اور صحت اور تعلیم کو مفت کیا۔ قومی دولت کو نئے شہروں کی آبادکاری پر خرچ کیا، پسماندہ رہائشی طرز زندگی کو تبدیل کر کے نئے طریقہ آبادکاری کو رائج کیا۔ جمود یافتہ اور سادھی افریقن زندگی گزارنے والے اپنے شہریوں کو زندگی کی سہولتوں سے آراستہ نئے شہروں میں آباد کیا۔ شہروں کو نقشوں سے مزین کیا۔

5 - لوگوں کیلئے روزگار کا بندوبست کیا۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز مثلاً سبزی، گوشت، آٹا، دودھ، چینی، کپڑا، چائے وغیرہ لوگوں کو سستے داموں مہیا کیا جاتا اور اس کی فراوانی وغیرہ پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ ان چیزوں کی فراوانی بھی ہوتی اور ریٹ بھی نہ بڑھنے دیئے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ تمام کاروبار کو گورنمنٹ کی تحویل میں لے کر ہر شہری کو گورنمنٹ کا ملازم بنایا گیا۔

6- قذافی حکومت نے ہر شہری کو نیا مکان بنا کر دیا اور پرانے اور خستہ حال مکان چھوڑنے کا حکم دیا۔

7- عوام دشمن قوتوں، ناجائز ذریعہ سے دولت حاصل کرنے والوں، امیروں، لٹیروں کو سختی سے کچل دیا۔ معمر القذافی کی تحریر کردہ گرین بک کے مطابق ملک میں نظام نافذ کر دیا گیا۔ اس کے قدآدم پوسٹر پورے ملک میں لگا دیئے گئے۔

8- ہر محلہ، ہر شہر میں سکول، ہسپتال اور مسجدوں کا جال بچھا دیا گیا۔ تقریباً ملتے جلتے ایک جیسے ڈیزائن سے ان کی تعمیر کی گئی۔

9- کرنل معمر القذافی نے دنیا میں لیبیا کے عوام کو خوشحالی دی اور اپنے ملک اور افریقی اقوام کی سربلندی کے لیے بھرپور کام کیا۔ یاسر عرفات سے اختلاف سے پہلے فلسطین کی آزادی کے لیے اس کو بھرپور رقوم دیں۔ یہاں تک کہ سادہ چیک دیئے۔

10- لیبیا میں فوجی تربیت لازمی عورت ہو یا مرد کا قانون نافذ کیا۔ انصاف کے لیے قاضی مقرر کئے۔ عدالتوں سے سب کے لیے انصاف کا اصول اور طریقہ بالکل سادہ تھا۔

11- ملک کے تمام ٹیکسی ڈرائیور صرف ملکی تھے جو کہ حکومت کے تنخواہ دار جاسوسی نظام کیساتھ منسلک تھے اور ساتھ ساتھ فوجی تربیت یافتہ تھے۔ ان کے بھی نوجوان فوجی انقلابیوں سے بھرپور تعاون کی وجہ سے انقلابی حکومت 42 سال تک اقتدار میں رہ

سکی۔ ہر محلہ ہر شہر میں حکومت کی مدد کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں جو کہ سرکاری ملازم بھی تھے۔ عوام کی خدمت بھی کرتے تھے۔ ان کا حکم انصاف پر مبنی اپنے اپنے علاقے میں چلتا تھا جن کو مقامی زبان میں (طبنۂ الشعبیہ) کہا جاتا تھا۔

12- قذافی حکومت نے ملک میں تعلیم کے لیے سرکاری سکولوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا۔ ملک کی 2 بڑی یونیورسٹیوں کو مجھے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ الفتح یونیورسٹی طرابلس اور الفرناج یونیورسٹی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ امن و امان والے اس ملک میں اکثر چند بار چھوٹی موٹی بغاوتیں ہوئیں لیکن القذافی حکومت نے ان پر کنٹرول کر لیا۔ اب پس منظر میں دیکھا جائے تو شاہ ادریس کے دور کا ایک سابقہ مراعات یافتہ طبقہ وہاں موجود تھا جو کہ اس سابقہ نظام کے وفادار تھے۔ کچھ موجودہ نظام کی سختی اور آمرانہ سسٹم کے مخالف لوگ بھی تھے۔ کرنل القذافی اور ان کے مراعات یافتہ لوگ بشری تقاضے بھی رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے بھی بہت سی غلطیاں ہوئیں۔ جن میں مخالفین کو جیلوں میں بند کرنا بھی ہے اور قتل کرنا بھی۔ کچھ بیرون ملک بھاگ گئے۔ کچھ ملک میں رہ گئے۔ ان کی اپنی مخالف حکومت پر بڑی گہری نظر تھی کیونکہ وہ سب ایلیٹ کلاس اور پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ اس موقع کی تلاش میں تھے جب معمر القذافی اور اس کے حواریوں کی طاقت اور اعتماد کمزور ہو۔ پھر ان کے بیرون ملک بھی رابطے موجود تھے۔ اس طرح جب معمر القذافی جو کہ اب کافی بوڑھے ہو چکے تھے کی حکومت پر گرفت کمزور ہوئی تو ان قوتوں نے جو خفیہ طور پر اپنی ایک فورس تشکیل دی ہوئی تھی وہ اور باہر کے ملکوں کے لوگ اور قذافی حکومت میں شامل ایک مخصوص طبقہ (جو کہ بڑی تعداد میں ہیں) سب نے مل کر قذافی حکومت پر بھرپور وار کیا کیونکہ اب اتنے طویل مرحلے کے بعد معمر القذافی کے کافی چاہنے والے اس کو چھوڑ چکے تھے۔ اب صرف ایک مخصوص لوگوں کا طبقہ ہی اس کی حمایت میں رہ گیا تھا۔

اس لیے ان سب فورسز کے سامنے اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور موجودہ پورے ملک پر باغی فوج کا قبضہ ہو گیا ماسوائے سیرت کے۔ پھر سامراجی قوتوں اور موجودہ NATO نے بھی باغی فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔

جنگ اور انجام

کرنل معمر القذافی اپنی قوم اور اسلامی دنیا کو جگانے کے لیے تقریباً 20 سے 25 سال تک اسرائیل اور یہود و نصاریٰ کو برا بھلا کہتا رہا۔ بڑی طاقتیں یہ تمام عوامل دیکھ رہی تھیں۔ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ اسرائیل و یہود و انصار کی مخالفت کرنے والا یہ افریقی اسلامی ملک اس طرح ترقی کرتا رہے۔ اس کے لوگ خوشحال ہوں۔ وہ طاقتیں بھی اس ملک کے اور قذافی کے عوامل پر گہری نظر رکھے ہوئے تھیں۔ درمیان میں امریکہ کا حملہ اور قذافی کی جوابی کارروائی کا واقعہ بھی پیش آیا۔ پھر کرنل معمر القذافی کی بیرون اور اندرون ملک مخالفوں کے ساتھ رویہ پر بھی ان کی نظر تھی۔ ساتھ ساتھ شمالی افریقہ کے غریب ملکوں کے اس خطے پر تیل کی دولت والا یہ ملک ان طاقتوں کو پہلے بھی کھٹکتا تھا جس کے دوران یہ طاقتیں کبھی اقتصادی پابندیاں لگاتی اور کبھی ہٹاتی رہیں۔ اس 25 سال کے طویل عرصہ میں معمر القذافی اور اس کے حواری ڈٹے رہے لیکن جب معمر القذافی نے حالات دیکھے اور اپنے آپ کو کمزور پایا تو پھر اس نے ان طاقتوں کے ساتھ حالات نرم کرنے کی کوشش کی جس میں تباہ ہونے والے طیارے کا معاملہ بھی ہے اور اس کے معاوضہ والا واقعہ بھی تھا۔ آج جب یہ چھوٹا سا ملک لیبیا تباہی

www.urdukorner.com

کے دہانے پر کھڑا کر دیا گیا ہے تو عالمی طاقتوں کے خوف سے کسی افریقی یا اسلامی ملک نے وہاں کے لوگوں کی اس مصیبت کی گھڑی میں کسی بھی طرح سے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ سوائے نائجیریا، وینزویلا اور گنی بساؤ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کے۔ وہ بھی صرف معمر القذافی کی حمایت کے سوا کیونکہ کرنل معمر القذافی ان ملکوں کی مالی مدد کرتا تھا اور افریقن یونین کا چیئرمین بھی تھا لیکن لیبیا کے عوام کے بے گناہ قتل پر تمام دنیا خاموش اور بے حس ہے۔ خاص طور پر کرنل قذافی کو قتل کرنے کے لیے NATO بھی مخالف فورس کی مدد کی آڑ میں بمباری کر رہی ہے جن میں بے گناہ لوگوں کی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ دیگرے قتل عام کے بعد یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کرنل معمر القذافی کی مخالف فوج کے ملکی لوگ بھی NATO کی اس کارروائی کی حمایت نہیں کرتے لیکن نظام کی تبدیلی اور کرنل قذافی کے قتل کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بات قرین ثبوت ہے کہ جب تک کرنل قذافی زندہ ہے اور گرفتار نہیں ہوتا قذافی مخالف فوج اور NATO کے لیے خطرہ ہے اور اپنی مرضی کا نظام لانے کے لیے ان کو مشکلات کا سامنا ہے۔

موجودہ حالات اور اس بغاوت کا انجام بالآخر

جیسا کہ موجودہ وقت میں سیرت اور مصراتہ میں بنی ولید کے شہر پر قبضے کے لیے گھمسان کی جنگ جاری ہے مصراتہ اور سیرت کے قبضے کے بعد ہی موجودہ باغی فوج کے پورے ملک میں کنٹرول کا اعلان ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ کرنل معمر القذافی کا اعلان ہے جنگ اور آخری سانس تک جنگ لیکن دنیا حیران ہے کہ عالمی طاقتوں اور موجودہ باغی افواج سے وہ یہ جنگ کب تک لڑ سکیں گے۔ موجودہ وقت میں معمر القذافی کے پاس تقریباً 30 سے 40 ہزار وفادار سابقہ فوج کے لوگ موجود ہیں لیکن باغی افواج کے زمینی دباؤ کے ساتھ ساتھ اگر NATO کی مشترکہ اتحادی افواج نے دوبارہ مسلسل بمباری شروع کر دی تو کیا قذافی اور قذافی کی حمایت کرنے والی فوج ان سب طاقتوں کے سامنے ٹھہر سکے گی۔ تجزیہ نگار کے خیال میں ہرگز نہیں کیونکہ باغی افواج اور NATO کا مقصد اب صرف پورے لیبیا پر قبضہ کے بعد کرنل معمر القذافی اور اس کے بیٹوں کی زندہ یا مردہ گرفتاری ہے کیونکہ اب وہ قذافی اور اس کے بیٹوں کا انجام صدام حسین کی طرح کا کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ اگر قذافی اور اس کے بیٹے اس جنگ میں مارے جاتے ہیں تو پھر ان دونوں ملکی اور غیر ملکی اتحادیوں کو سکون قلب حاصل ہو سکتا ہے اور کرنل قذافی اور اس کے بیٹوں کی گرفتاری کی صورت میں کنگرو کورٹ کا اپنی مرضی کا فیصلہ لے کر اس کو سزائے موت کے انجام تک پہنچانا ان ملکی اور غیر ملکی اتحادیوں کا آخری فیصلہ ہے کرنل قذافی کا بمباری میں مارا جانا یا کرنل معمر القذافی کی پھانسی۔ اگر کرنل قذافی ملک کے اندر ہی ہے اور وینزویلا، گنی بساؤ یا کسی ملک میں فرار نہیں ہو گیا تو اس جنگ کا انجام معمر القذافی کی جنگ میں موت یا عدالت سے اپنی مرضی کی پھانسی ہے۔ معمر القذافی کا بچ جانا اور کسی ملک میں نکل جانا اب کافی مشکل نظر آ رہا ہے۔

موجودہ وقت میں لیبیا اب آزاد ہو گیا ہے۔ اب موجودہ حکومت محمد عبد الجلیل اور محمد جبرائیل کی قیادت میں ہو گی۔ اس کو امریکہ اور یورپ کی سرپرستی کی وجہ سے چند ملکوں کو چھوڑ کر باقی پوری دنیا جلد تسلیم کر لے گی۔

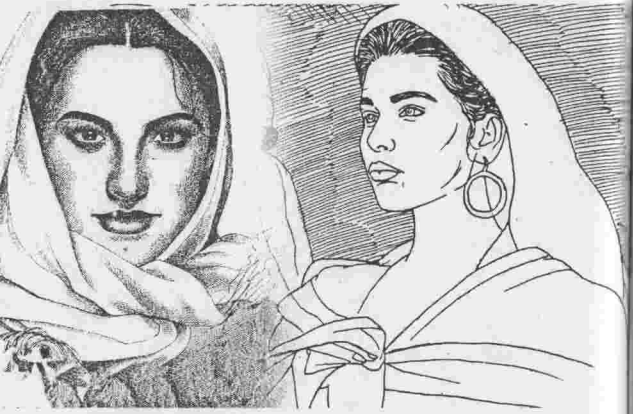

آزردل

تسنیم کوثر چیمہ

"اسلام قبول کرنے کے بعد حجاب پہننا شروع کر دیا تھا۔ وہ عبایا پہن کر بڑے سلیقے سے اسکارف اوڑھتی، بہت باقاعدگی سے نماز پڑھتی اور فارغ وقت میں اسلامی کتب پڑھتی تاکہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔"

ایک ہندو لڑکی کی کہانی، حق کی تلاش اس کو بے چین کیسے رکھتی!

جب مجھے انڈیانا یونیورسٹی میں کمرہ الاٹ ہوا اور چابی مل گئی تو میں اپنا سامان لے کر ڈورم میں پہنچ گئی۔ کمرے کا تالا کھولا تو وہاں دو بیڈ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور سٹوڈنٹ بھی رہے گی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ والا بیڈ لے لیا اور اپنا پرس بستر پر پھینک کر الماری کا جائزہ لینے لگی۔ دو الماریاں ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے اپنا اٹیچی اور چھوٹا بیگ الماری میں رکھ دیا اور تھکاوٹ دور کرنے ذرا دیر کو بیڈ پر لیٹی۔ بستر پر گرتے ہی وقت کا اندازہ نہ ہوا اور میں گرتے ہی گہری نیند سو گئی۔ میں گہری نیند میں تھی کہ اچانک شور سے میری آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے ساتھ والے بیڈ پر ایک دوسری سٹوڈنٹ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ دروازہ پھر کھلا اور میری نئی روم میٹ اندر آ گئی۔ اس نے مجھے جاگتے دیکھا تو خوشدلی سے مسکرائی۔

"نمستے میں پوجا ہوں۔" اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعارف کروا دیا۔ سلیولیس بلاؤز اور سبز ساڑھی میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا

www.urdukorner.com

جیسے سبز پتوں کے درمیان شبنم میں دھلا ہوا کوئی گلاب کا پھول۔ ملائم اور دمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر بہار کی نئی کھلی ہوئی کلیوں کی لطافت اور نزاکت کا احساس ہوا۔ کندھے پر کوچ COACH کا بیگ اور DELESEY ڈیلسی کے فرانسیسی سوٹ کیس، اس کے اندر آتے ہی CHANNEL-5 شینل فائیو کی مہک چاروں طرف پھیل گئی۔ نازک اور لمبی گردن میں بہت نازک سا نیکلس۔ ہر چیز مہنگے برانڈ کی اور اس سے امارت ٹپک رہی تھی۔ میں اس کے کپڑوں اور نمستے سے اندازہ تو لگا ہی چکی تھی کہ وہ ہندوستانی ہے۔ لحہ بھر کو مجھے کوفت سی ہوئی۔ میں تو کسی امریکن روم میٹ کی توقع کر رہی تھی۔

دراصل اتنا عرصہ امریکہ میں گزار کر مجھے امریکی لڑکیوں کے ساتھ گھلنا ملنا بہت آسان لگتا تھا۔ مجھے انکے ساتھ کبھی کوئی پرابلم نہیں ہوئی تھی۔ سکول کالج اور یونیورسٹی میں امریکی لڑکیوں کے ساتھ دوستی کے تجربات بہت اچھے رہے تھے۔ وہ جو باہر سے نظر آتیں اندر سے بالکل ویسے ہی ملتیں مگر یہ کسی غیر مسلم ہندو سٹوڈنٹ کے ساتھ سال بھر گزارنا تو بہت مشکل ہوگا۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ میرا وقت کیسے کٹے گا۔ اپنے ذہن سے یہ باتیں جھٹک کر میں مروت میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور سامان لانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

''پوجا یہ تم اتنا سامان رکھو گی کہاں؟ الماریاں تو بہت چھوٹی ہیں۔''

''بس تم دیکھتی جاؤ میں کیسے سب کچھ آرگنائز کرتی ہوں۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا شولڈر بیگ بستر پر رکھا اور اگلے دو گھنٹے میں بہت سلیقے قرینے سے اپنے کپڑے ہینگروں پر ٹانگ دیئے۔ باقی ترتیب سے الماری میں رکھ کر اس نے اپنے چھوٹے سوٹ کیس بڑے سوٹ کیس کے اندر ڈال کر ان کو الماری کے کونے میں کھڑا کر دیا۔ اس نے بھگوان کی مورتی نکال کر اپنے سٹڈی ٹیبل پر رکھ کر اس کے سامنے کچھ اور ڈیکوریشن کر دی۔ میں نے اس کی سٹڈی ٹیبل پر کچھ کاغذ کے بھگوان بھی دیکھے مگر میں کچھ بولی نہیں۔

مذہب اور سیاست پر میں نہ کبھی بحث کرتی ہوں نہ سنتی ہوں۔ یہ دونوں ایشوز بڑے نازک ہوتے ہیں اور ان دونوں معاملات میں لوگ بہت حساس اور جذباتی ہو جاتے ہیں لہٰذا جہاں کہیں بھی یہ دونوں موضوع چھڑ جائیں میں معذرت کر کے کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے اُٹھ جاتی ہوں۔ پوجا کے ساتھ میرا وقت کیسے کٹے گا؟ وہ تو خاصی باتونی تھی مگر اس کی باتوں سے ذہانت اور متانت ٹپکتی تھی۔ اس کا سامان سمٹا دیکھ کر مجھے بھی اپنا سامان سیٹ کرنا پڑا اور پھر فارغ ہو کر ہم دونوں اپنا اپنا MEAL CARD لے کر ڈائننگ ہال میں چل دیں۔ میں نے صرف سلاد پر گزارا کیا اور پوجا نے اُبلی ہوئی سبزی اور بریڈ لے لی۔

کھانے کے دوران اس سے تفصیلی تعارف ہوا۔ وہ بمبئی سے اپنے خرچ پر ایم بی اے کرنے آئی ہے، اس کی ممی جیولری ڈیزائنر ہیں اور پاپا کا بمبئی میں ڈائمنڈ جیولری کا بزنس ہے۔ صرف ایک بھائی ہے جو لندن میں ڈائمنڈ سٹور چلاتا ہے۔ فیملی کے سبھی لوگ بزنس کرتے ہیں۔ اسکے ممی پاپا کا شمار بہت ٹاپ کے بزنس مینوں میں ہوتا ہے۔

اب میری باری اپنا تعارف کروانے کی تھی۔ میں نے مختصر سا تعارف کروا دیا کہ میرا تعلق بہت پڑھے لکھے مذہبی گھرانے سے ہے اور میں مسلمان ہوں اور یہاں کمیونیکیشن کی سٹوڈنٹ ہوں اور یہاں انٹرنیشنل سسٹم آف ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کروں گی۔ میرے پاس پورے سال کا اسکالرشپ ہے۔

پوجا نے میرے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر جب خوشی کا اظہار کیا تو میں حیرت سے دنگ رہ گئی۔ میرا خیال تھا وہ ہندوستانی ہونے کے باعث بہت متعصب ہوگی مگر اس نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

''تم سے پہلے بھی میری دو سب سے اچھی فرینڈز مسلمان ہیں، اب اس میں تمہارا اضافہ ہو گیا ہے، مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

مجھے برائے نام سلاد کھاتے دیکھ کر وہ فکر مند ہو گئی۔

''مجھے یہ تو اچھی طرح سے پتہ ہے کہ تم یہاں MEAT والی کوئی ڈش نہیں کھاؤ گی کیونکہ یہ تمہارے لیے حرام ہے مگر خانہ پری کیلئے کچھ تو اور کھا لو تا کہ اتنی لمبی رات گزر سکے۔''

اس کے ہمدردانہ مشورے پر میں نے کافی کے ساتھ کیک کھا لیا۔ سارا دن میں ایڈمیشن آفس اور ڈورم کی کاغذی کارروائی میں مصروف رہی تھی۔ کھانے پینے کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

جب میں پوجا کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آئی تو ہمارا فون بج رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''تم سن لو میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔''

میں نے فون اٹھایا تو بھیا کا لاس اینجلس سے فون تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی ہمارے لینڈ لائن کے فون کی سروس شروع ہوئی تھی اور میرے بھائی نے کیلیفورنیا سے فون کر کے میرا نمبر بھی پتہ کروا لیا تھا۔ میں نے ایک ہی سانس میں بھیا کو ساری رپورٹ دے دی کہ میری روم میٹ ایک ہندو ہے۔ بہت امیر خاندان کی ہے۔ بمبئی سے ایم بی اے کرنے آئی ہے۔

''وہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ مجھے صرف تمہیں تاکید کرنی تھی کہ قبلہ کا رُخ معلوم کر کے نماز باقاعدگی سے پڑھنا اور روز تھوڑی تھوڑی تلاوت بھی جاری رکھنا۔'' وہ بالکل ڈیڈی کے لہجے میں بول رہا تھا۔

بھیا کا فون رکھ کر یاد آیا کہ لاس اینجلس سے چلتے وقت انہوں نے مجھے جائے نماز اور عبداللہ یوسف علی کی ٹرانسلیشن والا انگلش کا قرآن پاک بھی دیا تھا۔ میں نے اپنے سامان سے دونوں چیزیں نکال کر باہر رکھیں اور وضو کرنے چل دی۔

یوں پوجا سے میری دوستی کی ابتدا ہوئی۔

پوجا اور میں دن بھر اپنی اپنی کلاسز اٹینڈ کرتیں۔ شام کو میں جلدی فارغ ہوتی تو جلدی کمرے میں آ کر صفائی کر دیتی اور اگر وہ مجھ سے پہلے آتی تو کمرے میں پہنچ کر سب کام کر چکی ہوتی۔ صبح ہم دونوں ہی اپنا بستر بے ترتیب چھوڑ کر اس پر اُتارے ہوئے کپڑے پھیلا کر افراتفری میں بھاگ جاتیں۔ ڈیپارٹمنٹ سے واپسی پر ہم سب کچھ سمیٹ دیتیں۔ رات کا کھانا ہم دونوں ڈائننگ ہال میں اکٹھے ہی کھانے جاتیں۔ جہاں سے اس نے بہت سے انڈین سٹوڈنٹس سے مجھے متعارف کروایا البتہ کمرے میں واپس آ کر ہم خاموشی سے اپنی اپنی سٹڈی کرتیں۔ درمیان میں وہ کبھی کبھار مختصر سی بات کر کے خاموش ہو جاتی۔ ویک اینڈ پر اپنی اپنی لانڈری کرتے ہفتے بھر کی شاپنگ کرتے اور ٹرم پیپر لکھتے دو دن گزر جاتے۔ اس کے ممی پاپا کے انڈیا سے فون باقاعدگی سے آتے اور میرے دونوں بھائی کیلیفورنیا اور اوہائیو سے فون کر کے مجھ سے پورے ہفتے کی رپورٹ لیتے اور آخر میں وہی تاکید ہوتی کہ نماز باقاعدگی سے پڑھا کرو اور تھوڑا تھوڑا قرآن پاک بھی۔

میں نماز تو پڑھ لیتی مگر اوقات میں پابندی اور باقاعدگی نہ آ سکی۔ پوجا اپنے مذہبی طور طریقے سے

www.urdukorner.com

چلتی اور کبھی کبھار میرے ہاتھ پر پرشاد رکھ دیتی جو میں اس کی نظر بچا کر غائب کر دیتی۔ پوچا جب بھی مجھے نماز پڑھتے دیکھتی تو خاموشی سے دیکھے چلی جاتی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کو میرے نماز پڑھنے سے دلچسپی کیوں ہے۔ جب میں دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اُٹھاتی تو وہ مجھ سے درخواست کرتی۔

''میرے ممی پاپا کی صحت، ان کے بزنس اور میری کامیابی کی ضرور دعا کرنا۔''

مجھے یہ تو پتہ نہیں تھا کہ میں کسی غیر مسلم کے لیے دعا کر سکتی ہوں یا نہیں مگر اس کے اصرار پر میں اسکے والدین اور خود اس کی کامیابی کے لیے دعا کر دیتی۔ اس بارے میں میں بھیا کو فون کر کے پوچھنا چاہتی تھی مگر فون پر پوچھنا یاد ہی نہ رہتا۔ مجھے بھیا نے یہ تو بتایا تھا کہ ہم غیر مسلموں کو سلام کر کے ان پر سلامتی نہیں بھیج سکتے اس لیے صرف ہیلو ہائے سے میرا کام چل جاتا تھا مگر دعا کرنے کے بارے میں میری معلومات بالکل زیرو تھیں۔

اکتوبر میں سردی شدت پکڑ گئی اور نومبر میں برفباری شروع ہو گئی۔ برفباری میں کئی کئی دن تک بریک نہ آتی۔ یونیورسٹی کی ساری عمارتیں برف کے ڈھیر میں دھنسنے لگیں۔ جیسے جیسے کرسمس قریب آ رہا تھا ہر طرف برف کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ فٹ پاتھ اور سڑکیں ساتھ ساتھ صاف کر دی جاتیں تاکہ آنے جانے میں دقت نہ ہو اور خود ہمیں بھی گرم کپڑوں کا پہاڑ لاد کر باہر نکلنا پڑتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن برف کا طوفان آ جاتا۔ اس سے وقتی طور پر ہر چیز متاثر ہوتی مگر جلد ہی صورتحال پر قابو پا کر سب کچھ نارمل کر دیا جاتا۔

وہ اوائل دسمبر کی شام تھی۔ میں پانچ بجے آئی۔ ایس ٹی سے نکلی تو گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں سنو بوٹس سمیت گھٹنوں گھٹنوں برف میں دھنستی دھنساتی اپنے ڈورم تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے پوجا کے زور زور سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ خدا خیر کرے، پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟

میں بھاگ کر اندر گھسی تو پوجا کو دھاڑیں مار کر روتے پایا۔ ''پوجا بولو تو سہی کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا کہ کہیں بخار تو نہیں مگر اس کا جسم ٹھنڈا تھا۔ ''میرے پیٹ میں بہت درد ہے مجھے جلدی سے ہیلتھ سنٹر لے چلو۔'' درد سے تڑپتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیئے۔ درد کی شدت سے اس کے گلابی ہونٹ بالکل نیلے ہو رہے تھے۔

میں نے فون اٹھا کر 911 پر کال کی (پورے امریکہ میں 911 ایمرجنسی کی صورت میں ملایا جاتا ہے)۔ اگلے دس منٹ میں بلومنگٹن BLOOMINGTON پولیس ڈیپارٹمنٹ کی چار پانچ گاڑیاں بمعہ ایمبولینس کے آ گئیں۔ پولیس کا ایمرجنسی سٹاف ہمارے کمرے میں سٹریچر لے کر آ گیا۔

میں پوجا کے ساتھ پولیس کی ایمبولینس میں بیٹھ کر ہیلتھ سنٹر چلی گئی۔ پوجا کا سٹریچر لے کر ایمرجنسی سٹاف لمبی سی گیلری میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نرس بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔

''جنہیں پوجا نے بلایا ہے جلدی سے اس سے بات کر لو۔ ایمرجنسی میں اس کی سرجری ہونے والی ہے۔ اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو اس کی اپنڈے سائیٹس پھٹ جاتی پھر اس کا بچنا مشکل تھا۔''

میں گیلری میں نرس کے پیچھے بھاگتی ہوئی ای آر E.R پہنچی تو پوجا کو ہاسپٹل کا گاؤن پہنا کر اس کی کلائی میں آئی ڈی کی بریسلیٹ پہنا کر انہوں

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

نے اس کو آپریشن کے لیے بالکل تیار کر دیا تھا۔ پوجا کی ساڑھی اور جیولری جو وہ پہنے ہوئے تھی وہ انہوں نے میرے حوالے کر دی۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ پوچھتی پوجا نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔

''جلدی سے آیات شفا پڑھ کر مجھ پر دم کر دو تاکہ میری سرجری ٹھیک ہو جائے۔''

ایک ہندو لڑکی کا ہماری دعاؤں پر اتنا اعتقاد اور یقین دیکھ کر میں جذباتی ہو گئی۔

''یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ جلدی سے کرو۔ وہ مجھے آپریشن تھیٹر لے جانے والے تھے۔ میں نے تم سے بات کرنے کی چند منٹ کی مہلت مانگی ہے۔''

میں نے روتے روتے درود شریف پڑھا اور آیات شفا پڑھ کر اس پر پھونک ماردی۔ دو ڈاکٹرز نے اس کا اسٹریچر باہر نکالا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ دعائیں کرتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو گر تے جا رہے تھے۔

''آپ پوجا کی سرجری تک ویٹنگ لاؤنج میں انتظار کر سکتی ہیں۔'' ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھے تسلی دینے کے لیے میرے شانوں پر پیار سے تھپکی دی۔

''نہیں۔ میں دو گھنٹے بعد آ جاؤں گی مجھے کچھ ضروری کام ہے۔''

پوجا کو آپریشن تھیٹر پہنچا کر میں ہیلتھ سنٹر سے نکل آئی اور واپس ہاسٹل پہنچتے پہنچتے میں راستہ بھر اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتی رہی۔ واپس آ کر میں نے نماز پڑھی اور اس کی صحت کی دعائیں کر کے میں ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے پہنچی تو پوجا کا ایک جاننے والا لڑکا رمیش جو ہمارے انسٹرکشنل سسٹم آف ٹیکنالوجی میں فوٹو جرنلزم کی کلاسز لے رہا تھا میری ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ رام اوتار بھی تھا جو پوجا کے ساتھ ایم بی اے کر رہا تھا۔

''سنا ہے پوجا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ کیسی ہے؟'' رمیش بہت فکرمند تھا۔

''اس وقت ایمرجنسی میں اس کی سرجری ہو رہی ہے۔ میں اس کیساتھ ہی گئی تھی۔ ابھی میں صرف کھانا کھانے آئی ہوں۔ واپس وہیں جا رہی ہوں۔''

ہیلتھ سنٹر واپسی پر رام اوتار اور رمیش میرے ساتھ آ گئے۔ ہمارے پہنچنے تک پوجا کی سرجری ہو چکی تھی۔ اس کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ابھی ANESTHESIA کا اثر باقی تھا۔ وہ گہری بیہوشی میں تھی۔ رام اوتار اور رمیش واپس چلے گئے اور وہ رات میں نے پوجا کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر گزاری۔ میں وقتاً فوقتاً دعائیں پڑھ کر اس پر پھونکیں مارتی رہی۔ تیسرے دن پوجا کو چھٹی مل گئی اور میں اس کو واپس ڈورم لے آئی۔

''میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ یہ جو میں زندہ بچی ہوں تو صرف تمہاری دعاؤں کی وجہ سے۔ تمہاری کتاب میں بہت تاثیر ہے۔ اس کی میں بچپن سے ہی قائل ہوں۔ بچپن میں ایک دفعہ پہلے بھی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ ہم لوگ کرمیاں گزار نے شملہ گئے تھے۔ وہاں مجھے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ میرے پھیپھڑے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ بچنے کی امید نہیں تھی۔ تو ہمارے گھر کے ساتھ والے گھر میں ایک آنٹی مسز شبیر حسین رہتی تھیں۔ وہ بہت نیک خاتون تھیں۔ بڑا نورانی چہرہ تھا۔ پانچوں وقت نماز پڑھتی تھیں اور ہر جمعۃ المبارک کو روزہ رکھتی تھیں۔ وہ میرا حال پوچھنے آئیں تو میری ممی نے ان سے میرے لیے دعا کروائی اور مجھ پر دم کروایا۔

اور دیکھو اس دعا اور دم کی وجہ سے میرے ساتھ اتنا بڑا معجزہ ہوا کہ میں ان کی دعاؤں سے زندہ بچ

گئی اور روبصحت ہو کر گھر آ گئی۔ میرے ڈاکٹرز حیران تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر یہ صرف میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ اوپر والے کے کلام کی برکت سے ہوا۔ تب سے لے کر آج تک میں جب بھی بیمار یا پریشان ہوتی ہوں تو کسی مسلم سے ہی دعا کرواتی ہوں۔''

''مجھے سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے قرآن پاک پر اور ہماری دعاؤں پر تمہارا اتنا اعتقاد اور یقین ہے۔''

''ارے نہیں۔ یہ میں تمہیں خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی بلکہ یہ سب کچھ میں محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اسلام سے بہت عقیدت ہے۔''

پوجا کا ایمان اور یقین دیکھ کر میں جذباتی ہو گئی۔

پوجا نے اپنے ممی پاپا کو میرے بارے میں تفصیل سے جب بتایا کہ کس طرح میں نے ایمرجنسی میں پہنچا کر اس کی سرجری کروائی اور اس کے لیے دعائیں کرتی رہی تو اس کے ممی پاپا نے مجھے بمبئی سے بہت لمبا فون کر کے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ میرے شکر گزار تھے کہ میں نے پوجا کو بروقت ہاسپٹل پہنچا کر اس کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ شاید وہ میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تبھی انہوں نے مجھے سونے کا ایک سیٹ بطور گفٹ بھیجا جو میں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں جیولری نہیں پہنتی تو اگلی بار انہوں نے مجھے انڈیا سے اپنی بہن کے ہاتھ ڈائمنڈ کے ٹاپس بھیج دیئے۔

سوکھی دھرتی پر پیار کی چند بوندیں گرتے ہی کونپلیں پھوٹنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پھول سر اُٹھا کر مہکنے لگے۔

پوجا میرے اور قریب ہو گئی۔ وہ اکثر مجھے چھیڑتی تھی ''تمہارے پیار اور خلوص نے مجھے خرید لیا ہے اب بیچ مت دینا۔'' میں نے کہا ''ہیروں کے سوداگر کی بیٹی ہو خریدنے بیچنے کی بات تم کرو گی ہی کیونکہ یہ تو تمہاری رگوں میں خون کی جگہ دوڑ رہا ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ چلو میں تمہیں ایک شعر سناتی ہوں جو میرے جذبات کی عکاسی کر دے گا۔''

ملتا کون جہاں میں جو ہم کو خریدتا
ہم بک گئے خلوص خریدار دیکھ کر

اس کے آگے میں لاجواب ہو گئی۔

اس کے بعد رمضان المبارک جو ہاسٹل میں شروع ہوا تو میں نے اسلامک سنٹر کے ٹائم ٹیبل کے مطابق سحری اور افطاری کا انتظام کر لیا اور اپنے کمرے میں ہی سحری اور افطاری کرنے لگی۔ پوجا کو پتہ نہیں وقت کا کیسے اندازہ ہو جاتا۔ وہ عین فجر اور شام کو مغرب کی نماز کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاتی۔

''تم سب اپنوں کے لیے دعائیں تو کرتی ہو میں چاہتی ہوں تم میرے ممی پاپا، میرے بھائی اور میرے لیے بھی خصوصی دعائیں کیا کرو۔ مجھے پتہ ہے جو روزہ رکھتا ہے تو اس کی دعا اوپر والا ضرور قبول کرتا ہے۔''

''پوجا اس کے لیے میری ایک شرط ہے کہ تم اگر اوپر والا کہنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کہا کرو تو مجھے بہت اچھا لگے گا اور میرے دل سے دعا نکلے گی۔''

میری دعاؤں کی خاطر وہ میری ہر شرط ماننے کو تیار تھی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے جو بات کی وہ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کی۔ رمضان المبارک میں میں امام کعبہ کی آواز میں تلاوت کی کیسٹ لگا کر سنتی تو پوجا سحر زدہ سی بیٹھ کر سنتی رہتی۔ کیسٹ ختم ہو

www.urdukorner.com

جاتی تو وہ اکثر اصرار کرتی کہ REWIND کر کے مجھے دوبارہ سناؤ۔

رمضان المبارک کے دوران اس نے میرے ساتھ مل کر تقریباً سارا قرآن پاک سن لیا۔ آخری عشرے میں میں جب طاق راتوں کو جاگ کر نفل پڑھتی تو وہ چپ چاپ کچھ نوٹ کرتی رہتی۔

وہ رمضان کی ستائیسویں تھی۔ میں رات بھر جاگتی رہی تھی۔ صبح میں انسٹی ٹیوٹ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''تم رات بھر جاگتی رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر کوئی تھکن نہیں۔ تم اتنی فریش کیسے رہتی ہو۔ میں تو آٹھ گھنٹے نہ سوؤں تو مرنے والی ہو جاتی ہوں۔''

''پوجا یہ سب رمضان المبارک کے مہینے کی برکت ہے اور کچھ نہیں۔''

اسلام کے بارے میں وہ مجھ سے اتنے سوال کرتی جن کا اکثر میرے پاس جواب نہ ہوتا تھا۔ میں اکثر باتیں گول کر جاتی۔

دراصل اسلام کے بارے میں میری معلومات بہت محدود تھیں۔ پوجا کے سوالوں کے جواب میں اکثر میرا دل چاہتا کہ میرا اسلام کے بارے میں علم اتنا زیادہ ہوتا کہ میں اس کو صحیح جواب دے کر مطمئن کر سکوں۔ اس لیے میں نے ڈیڈی کو تاکید کی کہ وہ مجھے اسلامی لٹریچر بھیجیں۔

اور پھر جو کوئی بھی پاکستان سے آیا مجھے اسلامی کتب پہنچتی رہیں۔ میرا فائنل سمسٹر تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اب بھی آنر رول کے ساتھ گریجوایٹ ہونا چاہتی تھی۔ میں دن رات محنت کر رہی تھی۔ پوجا نے مجھے پاگلوں کی طرح پڑھتے دیکھا تو کہنے لگی:

''تم کس آنر رول کی بات کر رہی ہو۔ تم مسلمان گھر میں پیدا ہوئی، تمہارے کان میں اذان دی گئی، یہ آنر تمہارے لیے کیا کم ہے؟ قرآن پاک ایک WAY OF LIFE ہے اس کے مطابق چلو گی تو سب کچھ ہی مل جائے گا، دین کے اس آنر رول کے آگے یہ دنیاوی آنر رول کیا اہمیت رکھتا ہے؟ مسلمان گھر میں پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آنر رول تو دے ہی دیا ہے اور کیا چاہتی ہو؟''

ایک ہندو لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرے فائنل ختم ہونے والے تھے۔ جیسے جیسے میرے جانے کے دن قریب آ رہے تھے پوجا کی بے چینی بڑھنے لگی۔

''میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں۔ یہ تمہارے اور میرے درمیان کانفیڈنشل رہے گی۔'' وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''پوجا پہیلیاں نہ بجھواؤ اب کہہ ڈالو جو کہنا چاہتی ہو۔ میں تو کمیونیکیشن کی سٹوڈنٹ ہوں اور اس کی تعریف یہی ہے کہ ITS AN ART OF UNDERSTANDING AND BEING UNDERSTOOD۔ ابھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو تو میں سمجھ جاتی ہوں پھر ایسی کیا بات ہے جو تم کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہیں پا رہی۔''

''جب تم کمرے میں نہیں ہوتی تو میں تمہاری اسلامی لٹریچر پڑھتی رہتی ہوں۔ تمہیں میں نے کبھی علم نہیں ہونے دیا۔ میں نے تمہارے قرآن پاک کی عبداللہ یوسف علی کی انگلش ٹرانسلیشن جب سے پڑھ کر ختم کی ہے میرے اندر اسلام قبول کرنے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں مگر اس میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ میرے اس فیصلے کی بہت مخالفت ہو گی اور مجھے بہت کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ تم مشورہ دو میں کیا کروں؟''

وہ سخت پریشان تھی اور میں حیرت سے

ساکت۔ میرے پاس اس مسئلے کا بظاہر کوئی حل نہیں تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ تم واپس انڈیا جانے کا خیال چھوڑ دو اور میرے ساتھ نیویارک چلو وہاں چل کر کوئی ملازمت ڈھونڈو اور اسلام قبول کر کے کسی مسلمان سے شادی کر لینا۔''

''مجھ سے کون شادی کرے گا؟''

''جب تم اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئی اور تم نے کلمہ پڑھ کر اپنا اسلامی نام رکھ لیا تو کوئی بھی اچھا مسلمان تم سے شادی کرنے کو اپنے لیے آنر سمجھے گا۔''

''اگر واقعی ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو گا مگر میرے ممی پاپا، بھائی اور دوسرے رشتہ دار مجھے چھوڑ دیں گے۔ ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی تو نہیں رہتیں۔ آخر ان سب کو پتہ تو چل ہی جائے گا۔'' وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

''تم اللہ تعالیٰ کی خوشی چاہتی ہو یا ممی پاپا اور لوگوں کی۔'' وہ میرے سوال پر بوکھلا گئی۔

ابھی اس کے ذہن پر یہی باتیں سوار تھیں کہ ایک عجیب سا واقعہ پیش آ گیا۔

میں ڈیپارٹمنٹ سے کمرے میں لوٹی تو پوجا سو چکی تھی۔ جمعۃ المبارک کا دن گزرنے ہی سستی آنے لگتی ہے۔ ہفتہ اتوار کو یونیورسٹی جانے کی افراتفری نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا صبح ہفتہ ہی تو ہے، رات دیر تک پڑھ لیتی ہوں۔ اڑھائی بجے رات کو میں لیمپ آف کرنے اٹھی تو میری نظر پوجا کی سٹڈی ٹیبل پر پڑی۔ وہاں سے بھگوان کی مورتی اور اس سے متعلقہ سبھی کچھ غائب تھا اور اس کی جگہ میرے اسمائے حسنہ والی انگلش کی کتاب اور اس کے ساتھ ہی (عبداللہ یوسف علی والا انگلش کی ٹرانسلیشن کے ساتھ) میرا قرآن پاک پڑا ہوا تھا۔ یہ قرآن پاک تو میں فجر کی نماز کے بعد پڑھ کر اپنی ٹیبل پر رکھ گئی تھی۔ پوجا کی ٹیبل پر کیسے پہنچ گیا۔ شاید بے دھیانی میں صفائی کرتے پوجا نے میری بجائے اپنی ٹیبل پر رکھ دیا ہو گا۔ میں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی اور میں لائٹ آف کر کے سو گئی۔ صبح پانچ بجے پوجا نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا تو میں ڈر گئی۔

پوجا اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''اٹھو میری بات دھیان سے سنو، میں نے ایک بڑا عجیب سا خواب دیکھا ہے۔'' بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے کیوں جگایا ہے۔ میں تو بہت لیٹ سوئی تھی۔ خیر بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی اندھیرے کمرے میں گم ہوں اور باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہوں کہ اچانک کسی نے لائٹ آن کر دی۔ چاروں طرف روشنی پھیل گئی اور سب طرف دیواروں پر عربی لکھی ہوئی تھی۔ وہ ہر طرف پھیلتی گئی اور روشنی بڑھتی گئی حتیٰ کہ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی مجھے بہت ڈر لگا اور اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ کیا عجیب سا خواب ہے پتہ نہیں اس کی تعبیر کیا ہو گی۔'' وہ بہت خوفزدہ تھی۔ حیرت اور پریشانی سے اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس پر خواب کا ردعمل بہت شدید ہوا۔

''پوجا میں بتاتی ہوں اس خواب کی تعبیر یہی ہو گی کہ تم مسلمان ہو جاؤ گی۔ بس اب تم اپنی پڑھائی ختم کر کے کوئی ملازمت ڈھونڈ لو اور کسی مسلمان سے شادی کر کے یہیں سیٹل ہو جاؤ۔ انڈیا واپس جانے کا خیال چھوڑ دو۔''

www.urdukorner.com

موت کی راکھ...!!

مہاتما بدھ کے پاس ایک عورت اپنے بچے کی لاش لائی اور کہا بھگوان! سنا ہے تم مردوں میں جان ڈال سکتے ہو تو پھر میرے بچے کو زندہ کردو۔

گوتم بدھ نے کہا!

تمہارے مردہ بچے میں جان ڈال تو سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گاؤں کے ہر گھر میں جاؤ اور اس گھر کے چولہے کی راکھ لے آؤ جس گھر میں کبھی موت نہ ہوئی ہو۔ وہ راکھ تمہارے اور بچے کے جسم کو جیسے ہی لگائی جائے گی وہ زندہ ہو جائے گا۔

لیکن اس عورت کو کوئی ایسا گھر نہ ملا جو اس سے آزاد رہا ہو۔ یہ مصیبت ہر ایک نے اٹھائی ہے اور ہر ایک کو اٹھانی پڑے گی۔

اور وہ عورت چپکے سے اپنے بچے کی لاش کو کریا کرم کے لیے اٹھا لائی۔

(الیس۔ امتیاز احمد۔ کراچی)

''تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کرسکتی ہو؟''

''میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔'' میری یقین دہانی پر وہ مطمئن ہوگئی۔ انڈیا سے ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ممی پاپا کا فون آتا رہتا تھا۔ اس نے ان سے اپنے خواب کا ذکر کیا اور نہ امریکہ سیٹل ہونے کا۔

میرے اپنے دو بھائیوں کے علاوہ اور بہت سے رشتہ دار امریکہ میں تھے۔ ان کی بھاگ دوڑ سے پوجا کو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پی ایچ ڈی سکالر۔

میں انڈیانا یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نیویارک آ گئی اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ پوجا ابھی بلومنگٹن میں ہی تھی۔ اس سے ہر روز رات کو بڑی لمبی گپ شپ ہوتی۔ میرے آنے کے بعد وہ کمرے میں بالکل اکیلی تھی اور اکثر ڈرتی رہتی تھی۔

''تم یہاں کمرے میں نماز اور قرآن پاک پڑھا کرتی تھی تو مجھے عجیب سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ جب سے تم گئی ہو مجھے کمرے میں بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اکیلی ہوتی ہوں پھر بھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو میری ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔''

''پوجا یہ سب تمہارا وہم ہے بس تم جلدی سے فارغ ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

ڈیڑھ ماہ بعد وہ فائنل ایگزام دے کر نیویارک آ گئی اور آتے ہی اس کو مین ہٹن میں ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت ملتے ہی وہ سب سے پہلے میرے ساتھ اسلامک سنٹر گئی اور مولانا مطیع الرحمٰن جو انہی دنوں پندرہ سال رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں کام کر کے نیویارک آ گئے تھے اور ہماری مسجد کے امام تھے ان سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگئی۔ اس کا اسلامی نام پاکیزہ رکھا گیا۔ اس نے قاری صاحب سے عربی میں قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ کوئینز کالج میں اسلام کے کچھ کورسز میں پارٹ ٹائم داخلہ بھی لے لیا۔ اب اگلا مرحلہ اس کی کسی پاکستانی سے شادی کا تھا۔

میں ابھی پوجا کے لیے رشتہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ مجھے ڈیڈی نے میری اپنی شادی کے لیے پاکستان بلا لیا۔ میں اپنے چچازاد سے شادی کر کے واپس امریکہ آ گئی جہاں میرے ڈاکٹر شوہر کو سپیشلائزیشن کرنا تھی۔ ان دنوں امریکہ کو میڈیکل گریجوایٹس کی بہت ضرورت تھی۔ یہاں سے ٹکٹ اور گرین کارڈ بھیج کر ڈاکٹروں کو بلایا جاتا تھا۔

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

میرے میاں کے اور بھی بہت سے کلاس فیلوز ریذیڈنسی کرنے امریکہ آ گئے۔ ڈاکٹر عمران نے پوجا کو میرے گھر ہی دیکھ کر پسند کر لیا اور پروپوز کر دیا اور یوں میں نے اور ممتاز نے بھاگ دوڑ کر کے تیاری کر لی اور پوجا کی شادی ڈاکٹر عمران سے کر دی۔ میری رہائش کوئینز میں تھی اور پوجا اور عمران کی مین ہیٹن میں۔ ہر ویک اینڈ ان کے ساتھ گزرتا۔ میرا بیٹا پیدا ہوا تو پوجا کے ہاں بیٹی خدیجہ پیدا ہوئی۔ پوجا نے اپنے ممی پاپا کو اپنی شادی کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے مصلحتاً اپنے اسلام قبول کرنے کی بات گول کر دی۔ اس کے ممی پاپا کو صرف یہی پتہ چلا کہ پوجا کو کسی پاکستانی ڈاکٹر سے محبت ہو گئی تھی اور اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی ہے۔

خلاف توقع اس کے ممی پاپا نے کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ بڑی فراخدلی سے یہ خبر سن کر خوشی کا اظہار کیا اور اس کو ڈھیر سارے تحائف، جیولری، کپڑے اور کچھ کیش بھی بھیجا جو اس نے ڈاؤن دے کر نیو روشیل NEW ROCHELLE میں اپنا پرائیویٹ ہاؤس لے لیا۔ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد حجاب پہننا شروع کر دیا تھا۔ وہ عبایا پہن کر بڑے سلیقے سے اسکارف اوڑھتی، بہت باقاعدگی سے نماز پڑھتی اور فارغ وقت میں اسلامی کتب پڑھتی تاکہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔

پاکیزہ کی شوخی اب سنجیدگی سے بدل گئی۔

میرے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے تین ماہ بعد وہ بھی ایک پیارے سے بیٹے محمد کی ماں بن گئی۔ میں اکثر اس کو اعتماد میں لے کر پوچھتی۔

"پاکیزہ تم خوش تو ہو ناں؟ عمران بہت اچھا انسان ہے وہ تمہیں خوش تو رکھتا ہوگا۔"

"ہاں میں بہت خوش ہوں۔ میں زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتی تھی وہ کر رہی ہوں اور آگے بھی کرتی رہوں گی۔ میری زندگی میں کوئی پچھتاوا یا ندامت نہیں ہے۔" اس کے چہرے پر سکون اور طمانیت تھی اور باتوں میں سچائی۔

بچوں کو اچھی تربیت دینے کی خاطر اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ دونوں بچوں کو اسلامی سکول داخل کروا دیا۔ چھ سال لگا کر اس نے دونوں بچوں کو قرآن پاک حفظ کروایا اور بیٹی کو حجاب اور سکارف پہنانا شروع کر دیا۔ پاکیزہ جتنی اچھی مسلمان بنی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو لوگ پڑھ لکھ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں وہ بہت بہترین مسلمان بنتے ہیں اور جو مسلمان گھروں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اکثر برائے نام ہی مسلمان ہوتے ہیں۔ پاکیزہ مجھ سے بہت بہتر مسلمان ہے۔ اس کا اسلام کے بارے میں مطالعہ اور معلومات بہت زیادہ ہیں۔

پچھلے سال وہ حج کر کے آئی تو میں اس کو مبارکباد دینے گئی۔ اس کے چہرے پر نور کی برسات تھی اور آنکھوں میں ایمان کی روشنی اور اسلام کی چمک تھی۔ مجھے بڑا رشک آیا۔ میں تو آنر رول کے ساتھ یونیورسٹی سے گریجوایٹ ہو گئی تھی مگر میرے مقابلے میں جو اسلام قبول کر کے اور اتنی بہترین مسلمان بن کر پاکیزہ کو اللہ تعالیٰ نے آنر رول دیا اس کے سامنے تو میری ڈگریاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پوجا ایم بی اے میں تو آنر رول نہیں لے سکی تھی مگر اس کو اسلام کے دائرے میں داخل کر کے اللہ تعالیٰ نے جو آنر رول HONOUR ROLL دیا تھا وہ بہت کم خوش نصیبوں کو ملتا ہے۔

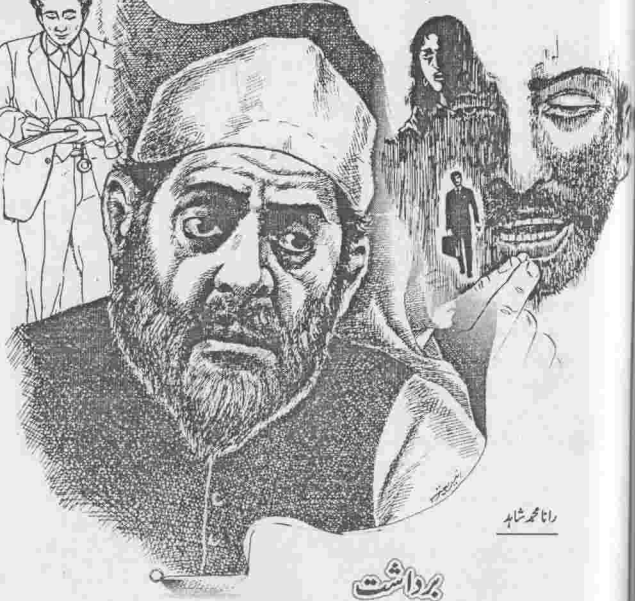

رانا محمد شاہد

برداشت

"تو کیا آپ کے بھائی کا ذہنی توازن....." میں نے کہا تو عنایت بھائی فوراً بولے: "تو کیا ہوا، وہ میرے ساتھ رہے گا..... میں اس کا یہاں علاج کراؤں گا۔" عنایت بھائی کے لہجے میں اپنے بچھڑے بھائی سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کا عزم بھی تھا۔

ایک شخص کی کتھا جو غیروں کے ستم سہتا رہا لیکن اپنوں کا ظلم سہہ نہ سکا!

میں چاچا غلام رسول کی اخبارات کی ایجنسی پر کھڑا ملازمت کے اشتہارات دیکھ رہا تھا کہ شاید میری قسمت کا دروازہ کھل جائے اور مجھے کہیں اچھی جگہ ملازمت مل جائے کہ اسی لمحے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"عنایت بھائی آپ....." میں نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "جی فہیم میاں! مایوس نہیں ہوتے....." انہوں نے شاید میرا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ "اللہ کے ہاں دیر ہے،

www.urdukorner.com

اندھیر نہیں۔ انشاء اللہ! تمہیں جلد ہی کسی اچھی جگہ نوکری مل جائے گی۔" پھر وہ میرے ساتھ ہی اخبار پڑھنے لگے۔

میں انجینئرنگ کے بعد فارغ بیٹھا تھا۔ انجینئر بنے بھی 10 ماہ گزر چکے تھے مگر کسی اچھی جگہ ملازمت نہیں ملی تھی۔ عنایت بھائی ہمارے محلے ہی میں رہتے تھے۔ مجھ سے 30 سال بڑے تھے۔ مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی کہتے۔ بے حد نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ اس دنیا میں تنہا تھے۔ ان کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ماں باپ عزیز رشتے دار سبھی قیام پاکستان کے وقت جالندھر سے ہجرت کرتے ہوئے راستے میں مارے گئے۔ وہ صرف اس صورت میں بچ گئے کہ اپنے رشتہ داروں اور مسلمانوں کی لاشوں کے نیچے دب گئے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اپنا پورا خاندان قیام پاکستان کے وقت گنوانے کے باوجود کبھی لب پہ حرف شکایت نہ لاتے حالانکہ انہیں بعد میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کبھی کسی دکان پر ملازمت کرنا پڑی اور کبھی کچہریوں کے پاس ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھتے رہے۔ کہہ سکتے تھے کہ اپنوں کی اتنی زیادہ قربانیوں کے بعد مجھے کیا ملا؟ لیکن عنایت بھائی بڑے فخر سے کہتے کہ ان کا خاندان پاکستان کی محبت میں قربان ہو گیا اور پھر پاکستان پہنچنے کے بعد انہیں ناقابل یقین خوشی اس وقت ہوئی جب انہیں ان کا سگا بھائی مل گیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی مسلم لیگ کے ایک جلوس میں شرکت کرتے ہوئے فائرنگ ہوئی۔ کچھ افراد زخمی ہوئے۔ افراتفری پھیل گئی اور پھر ان کا بھائی ان سے بچھڑ گیا جس کا آج تک پتا نہ چلا۔

مجھے بھی وہ اپنا بھائی ہی سمجھتے تھے البتہ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے بچھڑے بھائی کو مل لیں۔ میں بھی کچھ عرصہ ان کے بھائی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کے بھائی کی ظاہری پہچان یہ تھی کہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے تیر نما داغ تھا جو ہجرت کے وقت تلوار یا خنجر وغیرہ کی نوک سے لگا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ یہ نشان مضبوط ہو گیا۔

چونکہ عنایت بھائی نے اپنا سارا خاندان اس وطن کے لیے قربان کر دیا تھا اس لیے وطن سے محبت ان کے خون میں شامل تھی۔ صرف زبانی دعوے نہ تھے۔ پاکستان کے خلاف بات سنتے تو سختی سے روک دیتے اور کہتے کہ آج جو مسائل ہمیں نظر آ رہے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ ہم اس کا الزام فوراً اپنے ملک پر تھوپ دیتے ہیں۔ دنیا کے کس ملک میں مسائل نہیں ہیں لیکن وہ لوگ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور ملکی سطح پر سوچتے اور کام کرتے ہیں اسی لیے وہ ہم سے ہر لحاظ سے آگے ہیں۔ ہمیں بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ذاتی مفادات کو چھوڑ کر اجتماعی مفادات پر سوچنا اور کام کرنا ہو گا۔ پھر ہم بھی دنیا میں اپنی برتری ثابت کر سکیں گے۔

عنایت بھائی کی یہ باتیں مایوس لوگوں کے لیے امید افزا تھیں۔ محلے کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ خصوصاً میری عمر کے نوجوان تقسیم پاکستان کے واقعات سننے کے لیے روزانہ شام کو ان کی چوپال کا رُخ کرتے تھے۔ ان کی باتوں نے انہیں محلے کی ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا تھا۔

مجھے عنایت بھائی سے خاص انس تھا۔ اتنے عرصے تک نوکری نہ ملنے کی وجہ سے میں بہت دلبرداشتہ تھا۔ حتیٰ کہ اکثر جذبات میں آ کر اپنی ڈگریوں کو آگ لگانے کا بھی سوچا۔ میرے پریشان کن دو[illegible] بھائی [illegible] باتوں

نے مجھے ایک نیا عزم اور حوصلہ بخشا۔ مجھے مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کی روشنی عطا کی۔ عنایت بھائی کہا کرتے تھے وہ شخص بڑا بد بخت ہے جو اپنے مالک حقیقی کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ میری رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ انسان کو کسی حال میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کسی دانا کا قول ہے: ہر چیز جب ظاہر ہوتی ہے تو چھوٹی ہوتی ہے پھر بڑی ہو جاتی ہے سوائے مصیبت کے۔ کیونکہ وہ بڑی ظاہر ہوتی ہے جو چھوٹی ہو جاتی ہے۔ بہر حال مصیبت یا پریشانی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو وہ اللہ کی رحمت سے چھوٹی ہی ہو گی۔ اس لیے انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔

ایک شام میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میں نے کھڑکی سے دیکھا عنایت بھائی گلی میں محلے کے لوگوں سے گلے مل رہے تھے اور خلاف توقع ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے حد خوش ہیں۔ میں بھی گلی میں آ کر عنایت بھائی سے ملا اور خوشی کی وجہ دریافت کی تو وہ بولے: "بہت زیادہ خوشی ملی ہے فہیم میاں!"

"کیا خوشی ملی ہے؟" میرا تجسس نمایاں تھا۔ عنایت بھائی چند لمحے خاموش رہے پھر بولے: "میرا بچھڑا بھائی مل گیا ہے۔"

"کیا واقعی...... مگر کیسے؟" میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

"وہ لاہور کے علاقے والٹن سے مل گیا ہے۔ میرے ابا کے دوست تھے۔ ان کا بیٹا میرا بھی دوست تھا۔ یہ لوگ لاہور کے ایک پوش علاقے میں رہتے تھے۔ ایک دن وہ کسی آدمی کے ساتھ پاگل خانے گیا [illegible] فوراً مجھے [illegible] اطلاع دی کہ تمہارا

اقوال زریں

☆ بغیر جرات اظہار کے سچائی ممکن نہیں اور سچائی کے بغیر نیکی کا تصور محال ہے۔

☆ بعض انسانی حقوق اتنے بنیادی ہوتے ہیں کہ ان پر پابندی لگائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☆ نظریات کی صداقت کو انکے نتائج سے ہی پہچانتے ہیں۔ اگر عملی پہلو سے ایک نظریہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا تو وہ صداقت سے عاری ہوتا ہے۔

☆ بادشاہ ایک بازار کی طرح ہوتا ہے جہاں تاجر وہی سامان لے کر آتا ہے جس کی وہاں مانگ ہو۔ انسانی ذہن ایک بہت بڑا جنرل سٹور ہے جہاں ہر نوع کا سامان وافر ملتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آپ کو کیا چاہیے، خلوص، پیار یا منافقت۔ جو مانگیں حاضر ہے۔ راہنما کی طلب صادق ہونی چاہیے۔ اوپر والے منافقت اختیار کریں تو رعایا کو کس باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ اظہار خلوص کرتی رہے۔

☆ معاشرے اور شرعی قوانین یا فقہ کی مثال جسم اور لباس کی سی ہے۔ زندہ جسم ارتقا پذیر ہوتا ہے اس کی ضرورت اور موسم کے مطابق لباس بھی تغیر پذیر ہے۔ اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ لباس کی فٹنگ کے مطابق انسانی جسم کو نہیں کاٹا جا سکتا۔ جو لباس کبھی نہیں بدلتا ہے وہ کفن ہے۔ وہ صرف مردہ جسم پر ہی فٹ آتا ہے۔ زندہ جسم وقت کے ساتھ پرانا لباس بدل دے گا۔ اگر جسم کو زیادہ مضبوط جیکٹ پہنا دی جائے تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

☆☆☆

www.urdukorner.com

بھائی تو یہاں ہے...... بہت کمزور ہو گیا ہے۔''

''تو کیا آپ کے بھائی کا ذہنی توازن......'' میں نے کہا تو عنایت بھائی فوراً بولے: ''تو کیا ہوا، وہ میرے ساتھ رہے گا...... میں اس کا یہاں علاج کراؤں گا۔'' عنایت بھائی کے لہجے میں اپنے بچھڑے بھائی سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کا عزم بھی تھا۔

''لیکن ایک بات بتایئے کہ آپ کے ابا کے دوست کے بیٹے نے آپ کے بھائی کو پہچانا کیسے؟'' میرا تجسس نمایاں تھا۔

''یہ تل دیکھ رہے ہو......'' عنایت بھائی نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا جہاں پر سیاہ رنگ کا تل نمایاں تھا۔ ''ایسا ہی تل میرے بھائی کی گردن پر بھی تھا۔ پھر بچپن میں اس کی تھوڑی کے نیچے گہرا زخم آیا تھا جو نشان چھوڑ گیا۔ یہ نشانیاں کنفرم ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا بھائی مجھے مل گیا ہے۔''

عنایت بھائی کی خوشی دیدنی تھی، کیوں نہ ہوتی...... برسوں بعد ملنے والے خون کی خوشی ہی ایسی ہوتی ہے۔ اگلے دن عنایت بھائی لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں اور محلے والے انہیں الوداع کہنے ریلوے سٹیشن تک آئے۔

اس کے بعد کافی دیر تک عنایت بھائی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ میں بھی اپنی ملازمت کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ بیروزگاری چیز ہی ایسی ہے کہ پھر کسی اور چیز کی خبر نہیں رہتی۔ معاشی پریشانی ہو تو پھر کون یاد رہتا ہے۔ خیر جب تین ہفتے گزر گئے اور عنایت بھائی کا کچھ پتا نہ چلا تو میں نے ایک اتوار اپنے محلے کے ایک بزرگ جو اکثر عنایت بھائی کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، سے پوچھا: ''انکل عنایت بھائی سے کوئی رابطہ ہوا...... اب وہ کیسے ہیں؟...... ان کا بھائی کیسا ہے؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھ ڈالے۔ ظاہر ہے یہ میری بے چینی تھی۔

''بس بیٹا! عنایت بھائی کا پوچھ کر کیا کرو گے......'' ان کے چہرے پر گہری پریشانی دیکھ کر میں بھی رنجیدہ ہو گیا۔

''مگر انکل بتایئے تو سہی وہ کیسے ہیں...... اور اب کہاں ہیں؟''

''بیٹا عنایت بھائی پاگل ہو گئے ہیں۔'' بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''مگر...... کیسے؟...... وہ تو...... ان کا تو بھائی پاگل...... پھر وہ کیسے؟'' میں بے ربط بولتا گیا۔

''اصل میں یہاں سے جانے کے بعد عنایت بھائی تین دن تک اپنے بھائی کے ساتھ رہے۔ چوتھے دن وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مارکیٹ گئے تاکہ کچھ تفریح ہو جائے اور اس گھٹن زدہ ماحول سے کچھ دیر کے لیے آزادی ملے۔ مارکیٹ کے مین چوراہے سے وہ سڑک کراس کر رہے تھے کہ ایک گاڑی میں سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی جس کی زد میں عنایت بھائی کے بچھڑے بھائی اور تین مزید افراد آ گئے۔ عنایت بھائی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ اب...... اپنے بھائی کی جگہ پاگل خانے میں......''

اتنا کہنے کے بعد بزرگ کی آواز بھرا گئی، شدت غم سے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

اور...... میری کیفیت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ایک لمحے کو میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں گھر آ گیا۔ خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔ عنایت بھائی تو بڑے حوصلے والے تھے۔ اپنا سارا خاندان گنوا کر بھی ہمت اور استقامت کا کوہ گراں بنے رہے...... ہاں شاید مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون برداشت نہ کر سکے۔

رسول میمن

پارس ہاتھ

...ا تو بالکل ناامید ہو گیا۔ اس نے اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ دنیا میں اس کو بیزاری محسوس ہونے لگی۔ وہ ہر چیز سے تنگ آ گیا۔ وہ پانی کے لیے اتنا رویا تھا کہ اگر وہ اپنے آنسوؤں کو جمع کر کے ایک معصوم بچے کے منہ میں ڈال دیتا تو بچہ بس یہی الفاظ دہراتا کہ ''امی مجھے اور کچھ نہیں چاہیے میری پیاس بجھ گئی۔''

...ایک شخص کی کہانی جو پوری بستی کی اُمیدوں کا محور تھا، سندھی ادب سے انتخاب

...داتو گزشتہ دو دن سے پیاسا تھا۔

اس نے پانی ...جھا تو کیا، دیکھا تک نہیں تھا' یہ ...ب کچھ کوہستان میں گزشتہ برس سے بارش نہ پڑنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھیلوں میں جمع کیا ہوا پانی ختم ہو چکا تھا۔ ہر ایک کی آنکھیں آسمان میں جمی ہوئی تھیں۔

''ابھی بارش پڑنے والی ہے......'' ہر ایک کے لبوں پر بس ایک ہی جملہ تھا۔ صرف ایک دوسرے کو دلداری دینے کے لیے۔ چھوٹے بچوں کی آہ و بکا کو کم کرنے

www.urdukorner.com

کے لیے۔ ہر ایک نے آنکھیں اوپر اٹھا کر، آسمان کی طرف پکار کر خدا سے اپنا حق مانگا۔

”او خدایا! ان بادلوں کو حکم دے کہ یہ ہماری پیاس بجھائیں...... او خدایا حکم کر...... لیکن بادل نہیں برسے۔ آسمان کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کی گردنیں تھک گئیں اور انہوں نے ناامید ہو کر آنکھوں کو نیچے جھکا دیا۔

کوہستان میں دور دور تک کسی سانس لیتی ہوئی چیز کا نام و نشان تک نہ تھا، سوائے اس قبیلے کے، جو خود وہاں سے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ دوسرے سبھی کوہستانی آہستہ آہستہ وہاں سے اُٹھ گئے تھے، اور یہ لوگ ابھی تھوڑی سی آس لگائے آسمان کو تک رہے تھے۔

داتو کا خاندان بھی اس قبیلے میں سے ایک تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بچوں کے اندر دھنسے ہوئے پیٹ اور بے آواز گلوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے من ہی من میں یہ بات ٹھان لی کہ وہ کہیں نہ کہیں سے اپنے بچوں کے لیے روٹی اور پانی ڈھونڈ کر ضرور لائے گا۔ یہ سوچ کر وہ دور نیلے آکاش کے نیچے گم ہو گیا۔ لوگوں کو اس سے کئی امیدیں وابستہ تھیں کیونکہ وہ قبیلے والوں کا روحانی پیشوا تھا، اور ان کو یقین تھا کہ خدا داتو کو خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔

اور آج داتو دو دن سے کوہستان کی بلندیوں اور پستیوں میں بھٹک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے خدا سے اپنے کیے ہوئے گناہوں کی معافی مانگی۔ اس کے قہر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ وہی پیاس، وہی خون آشام کے دانتوں کی طرح ابھرے ہوئے پہاڑ۔ نظر کی حد تک پھیلے ہوئے ریگستانی ہواؤں کے گرم جھونکے۔ داتو نے تیز ہوا میں پھڑ پھڑاتی ہوئی اپنی چادر کے کونے کو گردن میں لپیٹ کر قابو کیا اور نیم کھلی آنکھوں سے کسی بیوہ کی طرح سکتے میں کھڑے ہوئے پہاڑوں کو دیکھا۔ کوہستانی ہواؤں کی تیزی کے زیر اثر اس کے سر اور داڑھی کے بال ادھر ادھر، بھوک سے تڑپتے ہوئے بچے کی طرح لرز رہے تھے۔ داتو جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے گناہوں کا صلہ ہے، جس کے ردعمل میں خدا کا قہر نازل ہوا۔ داتو کو کوہستانی زندگی سے پیار تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ ان بلند پہاڑوں سے دور زندگی کی ایک سانس بھی گزاری جائے اور یہی سبب تھا کہ آج اس کے ہاتھ خدا کے سامنے بلند تھے۔ اس کے لبوں پر رنج والم کے نغمے تھے اور اس کی آنکھوں میں کوہستانی گرم ہواؤں کی پیاس بجھانے کے لیے آنسو۔

داتو کو امید تھی کہ خدا ایک نہ ایک دن اس کی دعائیں ضرور قبول کرے گا۔ ایک نہ ایک دن آسمان سے گرنے والا پانی ان پہاڑیوں سے ندی اور نالوں کی صورت میں ضرور بہے گا۔ یہ کوہستان بادلوں کی بوندوں سے ضرور نہائے گا اور اس نے تصور ہی تصور میں بادلوں کی گرج سنی۔ اندھیرے میں بجلی کا گرج کے ساتھ چمکتا ہوا شعلہ اور اس شعلے کی روشنی میں اس نے کروڑوں کی تعداد میں برستی ہوئی برسات کی بوندوں کو دیکھا جو بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گرتی چھوٹی چھوٹی نسوں کی صورت میں رینگ رہی تھیں۔ اس تصور نے داتو کے من میں ہلچل پیدا کر دی ایسا ضرور ہو گا...... پانی دھرتی کی پیاس ضرور بجھائے گا۔

یہ سوچ کر داتو کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن اس کی ساری امیدیں اس کی دعاؤں کی طرح کھوکھلی تھیں۔ داتو ایک بلند پہاڑ پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھوں کو اوپر بلند کر کے گھٹنوں کو نیچے جھکا دیا۔ داتو اپنے وجود کو قدرت کے ترازو میں پانی کی چند بوندوں کے عوض تولنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”یا میری لاش میں جنگلی پرندوں کی چونچیں ہوں گی یا [illegible]

www.urdukorner.com

ندیاں بہیں گی۔“

اس کے اندر کے بھرے ہوئے جوش سے اس کے ناک اور منہ کی چمڑی لرز رہی تھی اور اس کی آنکھیں زور سے بند تھیں۔ ہاتھ آکاش کی طرف بلند تھے۔

اچانک دور سے سفید بادلوں کی چوٹیاں بلند ہونے لگیں جو آتشی پہاڑ کے دھوئیں کی طرح آگے بڑھ کر آسمان پر قبضہ کرنے لگیں۔ داتو نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے من کے ایک کونے میں خوشی نے سر اٹھایا لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کو دبا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ خوشی کے اس بھرپور احساس کا میری دعاؤں پر کچھ اثر نہ پڑے اور ایک بار پھر وہ آنکھیں بند کر کے دعا مانگتا رہا۔ آہستہ آہستہ خوشی اس کے جوش پر غالب آ گئی، اس کے دل نے چاہا کہ وہ آنکھیں کھول کر خوب قہقہے مارے اور ان اُبھرتے ہوئے بادلوں سے دل لبھائے، جن میں پانی سے سسکتی ہوئی اس کی قوم کی روح سمائی ہوئی تھی۔

داتو کی رگ رگ میں نشہ چھا گیا، اس کے اندر جیسے برف کا ٹھنڈا طوفان آ گیا جس سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ داتو نے خوشی سے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس کے سامنے کچھ نہ تھا کچھ دیر پہلے بڑھتے ہوئے سفید بادل ہواؤں میں بکھر کر گم ہو چکے تھے۔ داتو کی حالت اس ماں کی سی ہو گئی جس کا بچہ ابھی ابھی اس کے سامنے کسی پھٹتے ہوئے پہاڑ کے کسی بڑے سے تودے کے نیچے زندہ دفن ہو گیا ہو۔ اس کے سارے خیال ریزہ ریزہ ہو کر اس کی امیدوں پر گرے اور اس کی سبھی خوش فہمیاں دب کر ختم ہو گئیں۔ خدا پر سے تھوڑی دیر کے لیے اس کا اعتقاد اُٹھ گیا۔ ناامیدی نے اس کے مقصد کو اس قدر جھنجھوڑا کہ وہ خودکشی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے دل نے چاہا کہ وہ اس پہاڑ پر سے چھلانگ لگا کر نجات حاصل کر لے۔

www.urdukorner.com

لیکن اس کی قوم جو امیدوں کا جھنڈا لیے اس کے انتظار میں کھڑی تھی اس کا کیا ہوگا؟

اور یہ سوچ کر داتو رو پڑا۔

''کیا کروں...... میں اپنے مقصد کو کس طرح عملی جامہ پہناؤں، میں تیرا در چھوڑ کر اور کس کی دہلیز پر سجدہ کروں؟''

کوہستان کی خاموش وادی میں داتو کے رونے کی آواز دھوپ میں تپتے ہوئے پہاڑوں کا دل کمزور کرنے لگی۔ نوجوان بیٹوں کے طعنوں سے منہ موڑ کر بوڑھے باپ کے ریزہ ریزہ دل کی طرح خاموش پہاڑ بھی داتو کے ساتھ سسکیاں بھرنے لگے لیکن بارش نہ ہوئی۔ بہت سے دن بیت گئے، داتو خدا کو پکارتا رہا لیکن روز قدرت کی جانب سے خاموشی۔ سفید بادل منہ نکال کر اس کے ٹوٹے ہوئے دل پر قہقہہ لگا کر چھپ جاتے۔

داتو بالکل ناامید ہو گیا۔ اس نے اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ دنیا میں اس کو بیزاری محسوس ہونے لگی۔ وہ ہر چیز سے تنگ آ گیا۔ وہ پانی کے لیے اتنا رویا تھا کہ اگر وہ اپنے آنسوؤں کو جمع کر کے ایک معصوم بچے کے منہ میں ڈال دیتا تو بچہ قہقہہ لگا کر اپنی امی کے سینے سے چمٹ کر بس یہی الفاظ دہراتا کہ ''امی مجھے اور کچھ نہیں چاہیے میری پیاس بجھ گئی۔'' بہت دنوں کی پیاس سے ابھی داتو کے گلے میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ بلند آواز میں پانی کے لیے پکار سکے۔ وہ اپنے دونوں لب الگ کر کے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز کے بجائے اس کی زبان اس کے خشک تالو سے جا لگتی۔ داتو نے سوچا کہ کیا یہی ہے وہ زندگی جس کے لیے انسان کو بنایا گیا تو کیا یہی ہے وہ دنیا؟ قدرت کی محتاج دنیا کہ اسے پانی کی ایک بوند بھی خدا سے مانگنی پڑتی ہے۔

داتو اپنے ذہن میں باغی خیالات کو جنم دیتا رہا۔ اس نے اپنے کو کسی دوسرے کے ہاتھوں میں محسوس کیا حالانکہ اس کا جسم اور بازو ہر قسم کی ڈوری سے آزاد تھے لیکن پھر بھی اس نے اپنے آپ کو اس اُڑتی ہوئی پتنگ کی طرح محسوس کیا جس کی ڈور نچانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر دور میں کمزور نظر آیا لیکن آج اس کے ذہن میں باغی خیالات اُبھر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ آخر وہ گزشتہ کچھ دنوں کی افراتفری کا ردعمل تھا یا خدا سے گڑگڑانے کا ایک طریقہ جیسے خدا اس کے بدلتے ہوئے اندازوں کو دیکھ کر کچھ رحم کھائے، بارش برسائے۔ اچانک داتو کو ایسا محسوس ہوا جیسے سورج کے آگے کوئی بڑا دیو آ گیا ہو۔ گرمیوں کی دھوپ میں جلتے ہوئے پہاڑوں پہ جنت سا ٹھنڈا عکس چھا گیا۔

''اس نے گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ بادل تیزی سے سارے آکاش پر چھا رہے تھے۔ داتو نے پہلے اس کو قدرت کا مذاق سمجھا اور اس کے دل میں کوئی بھی خوشی نہیں جاگی لیکن دھیرے دھیرے اس کو یقین آ گیا کہ بارش ضرور آئے گی۔ ایک بار پھر خوشی اس کے من میں بسنے لگی۔ خدا کے خلاف اس کے باغی خیالات خوشی کے طوفان سے اُڑ گئے۔ داتو نے ہاتھ بلند کر کے خدا سے اپنی گمراہی کی معافی مانگی۔ بادل آہستہ آہستہ سارے آسمان پر پھیل گئے۔ ہر سمت بہار کی شام سا منظر محسوس ہونے لگا۔ بھورے رنگ کے پہاڑ جن پر پہلے دھوپ کا عزرائیل سوار تھا اب ان میں جیسے روح کی گردش شروع ہو گئی۔ داتو کے آگے اس کی قوم کے مسکراتے ہوئے مکھڑے گھوم گئے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے نظر آئے جو برسات کی بوندوں میں اپنے سڑے ہوئے ننگے ڈھانچے نکال کر نہا رہے تھے۔ خوشی میں چھلانگیں لگا کر کھیل رہے تھے۔

''ابھی بارش ہوئی...... ابھی بارش ہوئی...... خدا تمہارے لاکھ شکرانے...... خدا تم عظیم ہو۔'' وادیوں [illegible] آنے لگیں

www.urdukorner.com

دھوپ میں کام کرتے ہوئے مزدوروں کی چڑی جیسے کالے بادل بارش برسانے کے لیے آسمان میں تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دنیا کی ہر چیز جیسے سانس روک کر اس گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔

جب بارش کی پہلی بوند گرے گی تو ہر ایک چیز پکار کر جاگ اُٹھے گی۔ ہر انگ میں مستی سما جائے گی اور پھر مسلسل بوندیں برسنا شروع ہو جائیں گی۔ چھن چھنا ہو جائے گی۔

''خدا بارش برساؤ..... خدا بارش برساؤ'' داتو کے اندر سے جیسے آوازیں نکلنے لگیں لیکن اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سارے بادل داتو کی خواہشوں کی طرح بکھر گئے۔ کائنات کی ہر ایک چیز نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان میں بکھرے ہوئے کپاس کے پھولوں جیسے بادلوں کو دیکھا۔ ہر ایک کی حالت اس بھوکے فقیر بچے کی سی ہو گئی جس نے بھنک بھنک کر روٹی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا ہو اور اس سے کوئی طاقتور فقیر تھپڑ مار کر چھین لے گیا ہو اور ننھا فقیر جس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر حسرت بھری نگاہوں سے طاقتور فقیر کو جاتے ہوئے دیکھا ہو۔

داتو کو اب مکمل یقین ہو گیا کہ قدرت اس کے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ اس سے زمین پر رہنے کا کرایہ وصول کر رہی ہے۔ اسے اپنی کمزوری پر بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے آپ کو تیز ہواؤں میں اڑتی ہوئی تتلی کی طرح محسوس کیا۔ آخر وہ اتنا کمزور کیوں ہے؟ وہ کتنے دن پانی کی ایک بوند کے لیے رویا ہے؟ خدا کے سامنے اس نے ایک جگہ پر بیٹھ کر دعائیں مانگیں۔ آخر ان کا سبب کیا تھا؟ کیا مقدر، تقدیر، نصیب یہ سب بکواس ہے؟

داتو غصہ میں اُٹھا۔ اس کی رگ رگ میں جوش بھرا ہوا تھا۔

اس نے اُٹھتے ہی ایک بڑے پتھر کو اپنے ہاتھوں میں بلند کر کے نیچے پتھریلی زمین پر بہت زور سے دے مارا۔ ایک بہت بڑا دھماکہ وادی میں گونج اُٹھا اور پتھر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ داتو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ایک اور بڑا پتھر اُٹھا کر زمین پر دے مارا اور پھر دیوانہ وار پتھر اُٹھا اُٹھا کر زمین پر مارتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے پانی رس کر باہر نکلنے لگا۔ داتو نے اس کو بھی قدرت کا مذاق سمجھا اور اس کے عمل میں شدت آ گئی۔ داتو دیوانوں کی طرح پہاڑوں سے لڑتا رہا۔ اس کی سانسوں میں بہت تیزی آ گئی۔ منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ جب وہ تھکا تو ایک پہاڑ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ جوش اور تھکاوٹ کی وجہ سے اس کا انگ انگ کانپ رہا تھا۔ جب اس کو کچھ ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ مسلسل پتھر نکلنے والی جگہ سے پانی باہر اُبل رہا تھا۔ داتو کو یقین نہیں آیا لیکن اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے پانی کو چھوا تو اس کی انگلی کو جیسے کسی نے ڈس لیا۔ ٹھنڈا برف جیسا پانی۔ داتو کے لبوں پر ایک غمگین مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کو اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ جب اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر ابھرے ہوئے لال چھالوں پر جا پڑیں تو اس کو اپنا ماضی ایک گالی محسوس ہوا۔ اس کو مقدر اور قسمت سبھی بکواس محسوس ہوئے اس نے ایک بار پھر لال چھالوں کو چوما اور بڑے بڑے پہاڑی پتھر اٹھا کر پانی نکلنے والی جگہ پر مارتا رہا۔ مسلسل پتھر مارنے سے پانی زمین سے تیزی سے نکلنے لگا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

داتو کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ وہ تیزی سے چشمہ کا منہ چوڑا کرتا رہا۔

پانی اب ایک ندی کی صورت میں اس کی بستی کا رُخ کر کے بہہ رہا تھا۔

انسپکٹر نواز خان

دولت

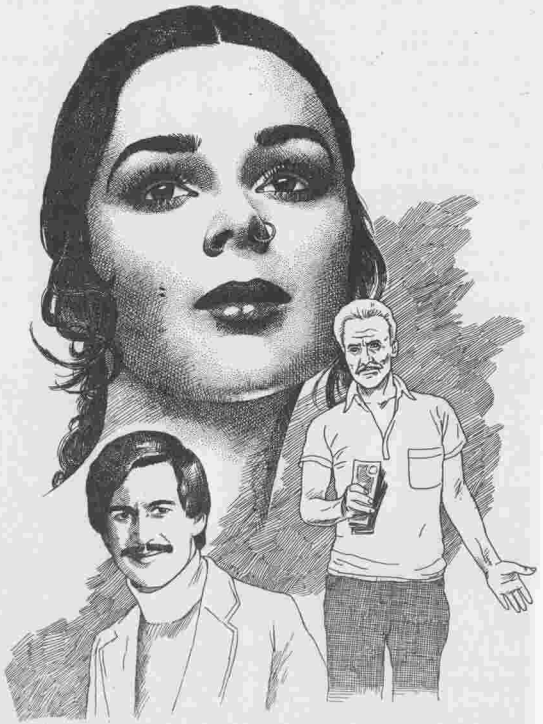

www.urdukorner.com

انسپکٹر نواز خان

دولت

اس نے اپنے خیال میں اچھا سودا کیا تھا، لیکن اسے
پتہ نہیں تھا کہ یہ اسے بہت مہنگا پڑے گا۔

دولت انسانوں کا دماغ خراب کرتے دیر نہیں لگاتی۔ اگر یہ دولت کسی ایسے آدمی کے پاس ہو جس کا دماغ پہلے ہی خراب ہو تو پھر فساد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے کیس دیکھے ہیں جن میں انسانی دماغ کی اس خرابی اور دولت نے بہت سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دولت ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت نہیں کرتے۔ میں جو واقعہ آپ کو سنانے لگا ہوں اس میں بھی میں نے ایسی چیز ایک بار پھر دیکھی کہ دولت اور دماغ کی خرابی کیا گل کھلاتی ہے۔

ان دنوں میں جہاں تعینات تھا وہاں علاقے میں ذیل داروں کے دو تین گھر تھے۔ آبادی کے اردگرد کافی دور تک ان گھروں کی زمینیں تھیں۔ یہ ذیل دار آپس میں رشتہ دار تھے اور اس طرح اس علاقے میں ایک ہی خاندان بہت اثر و رسوخ والا اور طاقتور خاندان تھا۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا۔ مردبھی کافی تھے۔ زمین بھی کافی تھی۔ ان گھروں میں سے ایک گھر کے آدمی کا دماغ خراب ہونا شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں یہ جب نوعمر تھا تو ماں باپ نے ضرورت سے زیادہ لاڈ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی گاؤں کے کسی آدمی کے جانور زخمی کر دیتا۔ کبھی کسی مزارعے کا سر پھاڑ دیتا اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ انہی حرکتوں کے ساتھ وہ جوان ہو گیا۔ اب اس کے گرد آوارہ گرد اور اوباش لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اب وہ باقاعدہ بدمعاش بن گیا۔ ڈیرے پر اسلحہ بھی رکھ لیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے کیسوں میں ہوتا ہے وہ اپنے کسی جرم کی وجہ سے جیل کی ہوا

کھا آیا۔ جیل جا کر بدمعاشوں میں جو کمی ہوتی ہے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے اور وہ وہاں سے استاد بن کر نکلتے ہیں۔ جیل سے فارغ ہوا تو جسونت بھی استاد بن چکا تھا۔

اب اس کے حامی موالی اور بچے اسے ذیل داروں کی نسبت سے نہیں بلکہ استاد کہہ کر بلاتے تھے اور اس نام سے میں بھی اسے جاننے لگا۔ میں جب اس علاقے میں آیا تو میرے محرر نے بدمعاشوں کا تعارف کرانا شروع کیا اور جو کہانی میں نے آپ کو سنائی ہے وہ مجھے محرر نے ہی بتائی تھی۔ مجھے بڑا شوق ہوا کہ اس جوان کو دیکھوں جس نے بچپن سے ہی بدمعاشی کا باقاعدہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے محرر سے کہا کہ کسی دن استاد جسونت کو میرے پاس لانا۔ ایک دن وہ اسے لے آیا۔ جسونت چہرے مہرے سے بھی بدمعاش ہی لگتا تھا۔ بچپن کی لڑائیوں کے نشان اس کے چہرے پر تھے۔ چھ فٹ کے قریب قد خوب گٹھا ہوا جسم۔ اس کا ڈیل ڈول کسی ہندو کی بجائے مسلمان کا نظر آتا تھا ورنہ زیادہ تر ہندو مریل سے ہوتے تھے۔ میں اسے باتوں باتوں میں استاد کہتا تو وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ وہ تھا تو بدمعاش لیکن اس نے ابھی تک مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے میں نے اسے صرف یہ تنبیہ کی کہ وہ میرے علاقے میں نہ میرے لیے اور نہ اپنے لیے مشکل پیدا کرے۔

وہ چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا۔ اتنا خوبصورت جوان آدمی ہے لیکن کس غلط کام میں لگا ہوا ہے۔ لیکن دولت کچھ نہ کچھ تو خرابی ضرور کرتی ہے۔ اس آدمی کے خاندان کے پاس روپے کی ریل پیل تھی۔ خود اس کا باپ اچھی خاصی زمین کا مالک تھا اور یہ جسونت اور ایک لڑکی اس کی اولاد تھے۔ اس کے پاس روپیہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اب وہ اس طرح کچہریوں میں ضائع ہونا تھا۔ خیر استاد جسونت کا نام میرے ذہن سے نکلتا چلا گیا۔

ایک دن محرر نے مجھے آ کر بتایا کہ ذیل داروں کے خاندان کا ایک آدمی جو، ان کا نوکر ہے ایک قتل کی اطلاع دینے آیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے لاؤ۔ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میرے سامنے آ کر خالص ہندوانہ انداز میں پرنام کیا۔ اپنا نام پریتم بتایا اور کہنے لگا کہ اس کے مالک ذیل دار تیار دسنگھ کے بیٹے جسونت کا قتل ہو گیا ہے اور وہ مجھے لینے آیا ہے۔ جسونت کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں نے اسے کہا، جسونت استاد؟ اس آدمی نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

وہ خوبصورت جوان جسونت استاد آخر اس راہ پر چلتا ہوا مارا گیا جس پر چل کر کسی نے آرام سکون نہیں پایا۔

میں نے تھانے سے دو تین آدمی ساتھ لیے اور پریتم کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تھانے سے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ پریتم نے ہمیں اس میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پریتم ہمیں لے کر اس قصبے میں ایک بڑے سے گھر کے سامنے رُک گیا۔ ہم اُتر کے اندر جانے لگے تو اس نے اشارے سے ہمیں روک دیا اور خود تیزی سے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک بارعب سکھ باہر آ گیا۔ اس نے تانگے کے پاس آ کر پرنام کیا اور اوپر چڑھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرا نام تیار دسنگھ ہے جی! میرے نوکر پریتم نے بتایا ہوگا کہ میرے لڑکے جسونت کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ بڑے صبر کرنے والے آدمی کی طرح اس کا رویہ تھا۔ پریتم بھی تانگے

www.urdukorner.com

میں بیٹھ چکا تھا اور تانگہ پھر چل پڑا۔ میں نے تپارو سے پوچھا یہ وقوعہ کس جگہ ہوا ہے؟

ہماری زمین پر۔ وہیں جسونت نے ڈیرہ بنا رکھا ہے۔ وہ اس گھر میں نہیں رہتا (اس نے اپنے پیچھے اس مکان کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ہم چلے تھے) آج صبح میں نے پریتم کو گھر سے پراٹھے اور حلوہ بنوا کر جسونت کے ڈیرے پر لے جانے کے لیے کہا تھا۔ اس کو روانہ کر کے میں کاموں میں لگ گیا۔ کچھ کام گھر سے باہر تھے لیکن میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں گھر پر ہی تھا کہ پریتم واپس آ گیا لیکن روتا پیٹتا۔ اس نے بتایا کہ کسی نے جسونت کو قتل کر دیا ہے۔ جسونت کی ماں اور میں فوراً وہاں پہنچے۔ جسونت کی ماں ابھی تک وہیں ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا میں پریتم کو لے کر اس گھر واپس آیا اور اسے آپ کی طرف بھیج دیا۔ باقی آپ چل کر دیکھ لیں۔

وہ جس انداز سے باتیں کر رہا تھا اس سے وہ مجھے بڑے حوصلے والا معلوم ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ جب میں تفتیش شروع کروں گا یہ آدمی بڑے کام کا ثابت ہوگا۔ کیونکہ ایسے اعتماد والے لوگ ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں بڑے یقین سے کہتے ہیں۔

جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ذیل دار کے قتل کا سن کر بھی لوگ جمع ہو گئے ہوں گے۔ ہم تانگے سے اُترے۔ پریتم ہمارے آگے آگے تھا۔ تپارو دھریک سے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس سے صحیح طرح چلا نہیں جا رہا تھا۔ پریتم ہمیں (مجھے اور سپاہیوں کو) ایک کمرے کی طرف لے جانے لگا۔

ہم اس میں داخل ہوئے تو اندر چند عورتیں بین کر کے رو رہی تھیں ان میں سے ایک عورت خاصی عمر کی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید جسونت کی ماں ہوگی۔

جسونت کی لاش چارپائی پر پڑی تھی جس پر ایک خاکی رنگ کا کھیس بچھا ہوا تھا لیکن اکٹھا ہو چکا تھا۔ جیسے اس پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے کشتی کرتے رہے ہوں۔ جسونت کے کپڑے اس کے اپنے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک خون تھا۔ اس طرح کا قتل ایک ہی طریقے سے ہوتا ہے یعنی ٹوکے سے یا کلہاڑی سے۔ میں نے قریب ہو کر لاش کا معائنہ کیا اور میرے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ جسونت کو ٹوکے یا کلہاڑی کے واروں سے قتل کیا گیا تھا۔ قاتل شاید ایک سے زیادہ تھے کیونکہ ایسے شواہد بھی مل رہے تھے کہ قتل کے بعد لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈالا گیا ہو بلکہ لگتا یہ تھا کہ جسونت جیسے چارپائی پر لیٹے لیٹے قتل ہو گیا ہے۔ وہ جوان آدمی تھا اور مرتے ہوئے تو مریل آدمی بھی مزاحمت کرتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مارنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ انہوں نے جسونت کو لیٹے لیٹے ہی قابو کر لیا۔ جسونت مرتے ہوئے تڑپا ہوگا اس لیے اس کے نیچے کھیس اکٹھا ہوا تھا۔

میں نے پریتم سے کہا کہ تپارو کو میرے پاس لاؤ۔ وہ اسے لینے باہر چلا گیا۔ میں نے لاش پر چادر ڈلوا دی۔ تپارو آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں لاش ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دوں۔ اس نے میری بات سن کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ مرنے والا تو مر گیا۔ چیر پھاڑ کر وہی معلوم ہوگا کہ یہ قتل ہوا ہے؟ یہ تو کسی کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اسے ٹوکے مارے گئے ہیں۔ تھانیدار صاحب [illegible] کام [illegible] دو تم یہ تلاش کرو کہ

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

یہ کام کیا کس نے ہے؟

تپارو پوسٹ مارٹم پر رضامند نہیں تھا۔ میں سپاہیوں کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور ہم ڈیرے پر بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ عورتیں پھر کمرے میں رونے دھونے لگ گئیں۔ میں نے تپارو سے افسوس کیا۔ اس کے ساتھ قانونی کارروائی کی بات کی اور کہا کہ جب تم آخری رسوم سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں تمہارے پاس آؤں گا۔ میں نے وہاں نقشہ وغیرہ بنایا اور تھانے آ کر کاغذات مکمل کیے۔

پریتم ہمارے ساتھ اپنی طرف سے رپورٹ درج کروانے آ گیا تھا۔ اسے فارغ کر دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ کام کیسے ہوگا؟ میں نے محرر کو بلایا۔ یہ درمیانی عمر کا آدمی تھا بہت سیانا تھا اور تجربہ کار۔ ستیش اس کا نام تھا۔ ایسے تجربہ کار لوگ تھانے داروں کے بہت کام آتے ہیں۔ ستیش بھی میرے ساتھ سر کھپاتا رہا پھر کہنے لگا کہ میں کوئی مخبر لاتا ہوں۔ اس طرح کی وارداتوں میں کئی چیزیں سامنے ہوتی ہیں۔ عورت، دولت، زمین، دشمنی اور جسونت جیسے بدمعاش کے معاملے میں ان میں سے کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بعض چیزوں کے معاملے میں پریتم سے زیادہ اچھا مخبر کون ہوتا؟ میں نے محرر سے کہا کہ وہ پریتم کو جا کر لے آئے۔ کافی دیر بعد وہ آیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ جسونت کی آخری رسوم ادا کر کے تم میرے پاس آ جانا۔ محرر تھانے سے چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا کہ وہ مخبر لے کر آئے گا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ محرر بہت سیانا آدمی تھا۔ وہ ذیل داروں کا ہی ایک آدمی پکڑ لایا۔ یہ آدمی اس امیر خاندان کا فرد ہونے کے باوجود غریب تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ اچھے اچھے گھرانوں میں بھی ایک آدھ آدمی ایسا ہوتا ہے جس کی حالت کمزور ہوتی ہے۔ یہ آدمی شنکر بھی مالی لحاظ سے کمزور تھا۔ چونکہ اس کا ہر گھر میں آنا جانا تھا اور رشتہ داری بھی تھی اس لیے وہ گھر کا بھیدی تھا۔ پولیس کے لیے اس طرح مخبری نہیں کرتا تھا جس طرح دوسرے مخبر کرتے ہیں لیکن پولیس کے کام آ جاتا تھا۔ اس میں جاگیردارانہ اکڑ والی بات نہیں تھی۔

میں اسے تھانے سے گھر لے گیا تاکہ ذرا دوستانہ ماحول میں وہ کھل کر بات کرے۔ میں نے اس سے صرف تپارو کے گھر کے حالات معلوم کرنے پر ہی زور نہ دیا تھا بلکہ جسونت کی یاری دوستیاں، دشمنیاں، لین دین وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھتا رہا۔ وہ جب جسونت کے بارے میں شروع ہو گیا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اسی کی زبانی جسونت کے حالات سنتا رہا۔

تھانے دار صاحب اس علاقے میں ہم ذیل داروں کی زمین بہت جگہ ہے۔ ہمارے لڑکے اس وجہ سے بھوتر جاتے ہیں۔ یہ جسونت جسے ہم جسا کہتے تھے شروع سے ہی اکھڑ مزاج آدمی تھا۔ داڑھی مونچھ پھوٹی تو برے کاموں میں پڑ گیا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بس کھانا پینا اور آوارگی کرنا ہی اس کا کام تھا۔ انہی کاموں میں ایک بار جیل بھی ہو گئی۔ تپارو کی یاریاں دوستیاں بھی اس کے لڑکے کو جیل جانے سے بچا نہ سکیں۔ جب ایک بار جیل ہو کر آیا تو وہاں اس نے جو نگی بیلی بنائے تھے وہ بھی یہاں ہمارے گاؤں میں جسے کے ڈیرے پر آنے لگے اور اس کی دہشت زیادہ ہو گئی۔ جسا جیل سے پکا مجرم بن کر نکلا تھا۔ اپنے گھر یعنی باپ کے گھر کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ اپنے ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ میں بھی کئی بار اس کے ڈیرے پر گیا ہوں۔

میں [illegible]

وہ میرے آنے پر اعتراض نہیں کرتا تھا ورنہ ہر کوئی اس کے ڈیرے کی طرف جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ میں نے جب بھی وہاں کوئی آدمی دیکھا ہے وہ شکل صورت سے ہی بدمعاش نظر آتا تھا اور اس علاقے کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ادھر ادھر سے جرائم پیشہ یا بدمعاش لوگ اس ڈیرے پر یاری دوستی کے لیے یا پھر چھپنے چھپانے کے لیے آتے تھے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جسونت کی بدمعاشوں سے یاری دوستی تھیں۔

بہرحال جو بھی ہو جسونت کی اپنی بیوی سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ اس کی بیوی اس کی ماں کی بہن کی بیٹی تھی اس لیے وہ گھر سے جا بھی نہیں سکتی تھی بلکہ اپنی خالہ کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ جسونت کا اپنی بیوی سے کیا جھگڑا تھا میں نے اس بارے میں چاچی (جسونت کی ماں) سے کھوج کی تھی۔ چاچی کہتی ہے جسو دولت کا پجاری بن چکا ہے اور اپنی بیوی نیتو سے جس کا باپ زمیندار ہی ہے اچھی کمائی کرتا ہے ہر وقت یہی کہتا ہے کہ جاؤ اپنے باپ سے پیسے لے کر آؤ حالانکہ جسونت کا باپ تپارو اچھا خاصا امیر آدمی ہے۔ ان کے گھر دولت بھری ہوئی ہے اور جسونت ہی اس ساری جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے باوجود وہ ایسی نیچ حرکت کرتا تھا کہ اپنی بیوی کو تنگ کرتا کہ جاؤ باپ سے پیسے لے کر آؤ۔ چاچی کا تو یہ خیال تھا لیکن میرا نہیں خیال کہ اصل بات یہی ہوگی۔ اگر جسونت کی نیتو جیسی خوبصورت بیوی سے لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ چاچی بھی مجھ سے چھپا رہی ہو۔ خیر بات کر رہا تھا جسو کی حرکتوں کی۔ وہ ڈیرے پر چارپائی پر پڑا رہتا تھا یا بندوق لے کر شکار کو نکل جاتا تھا۔ روٹی پانی کے لیے ڈیرے پر [illegible] لے کر آتا تھا۔ میں وہاں ڈیرے پر رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ روپے پیسے کی جسو کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ رہی کسی سے دشمنی کی بات تو ہو سکتا ہے کہ دشمنی رہی ہو اور پھر نیتو کے بھائی بھی بہت اتھرے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بہن کے ساتھ زیادتی پر قابو سے باہر ہو گئے ہوں اور انہوں نے جسونت کو پار کر دیا ہو۔

شنکر نے جسونت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ تقریباً میں اس کے بتانے سے پہلے ہی جانتا تھا۔ صرف اس نے نئی بات یہ بتائی تھی کہ جسونت کا اپنی بیوی سے جھگڑا رہتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی نے اپنے بھائیوں دلیر اور شمیر سے اس کا ذکر کیا ہو جنہوں نے اشتعال میں آ کر اسے ختم کر دیا ہو۔

مجھے اب نیتو سے ملنا ضروری تھا۔ یہی سوچ کر میں تپارو کے گھر چلا گیا۔ وہ لوگ اب جسونت کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تپارو کے ساتھ میں اس کے بیٹے کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے کہا کہ ایک بیوی سے زیادہ اپنے خاوند کے بارے میں کون جان سکتا ہے؟ اس لیے میں نیتو سے ملنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اکیلے شاید وہ تمہارے سامنے زبان نہ کھولے۔ تپارو سیانا آدمی تھا وہ سمجھ گیا اور اس نے نیتو کو بلا کر میرے پاس بٹھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس عورت کی اپنے خاوند سے لڑائی رہتی تھی اور میں اسی بات کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی۔

نیتو مرنے والا تو چلا گیا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے تمہیں دکھی ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتا دو۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ جس کے بارے میں اس نے اپنے باپ کو بھی نہ بتایا ہو؟

نیتو میرا سوال سن کر کافی دیر خاموش رہی پھر

www.urdukorner.com

کہنے لگی کہ مرنے والے کے ساتھ اس کے دوہرے رشتے تھے اس لیے وہ اس کی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتی تھی۔ دشمنی کے بارے میں اس نے کبھی بتایا نہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس زیادہ دیر رہتا تھا۔ اس لیے میں کچھ نہیں جانتی۔ نیتو کے ساتھ کافی دیر کی باتوں کے باوجود مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اسے اندر جانے کا کہہ دیا اور تپارو کے آنے پر اسے بتایا کہ اس کی بہو کو کچھ بھی علم نہیں یا وہ بتانا نہیں چاہتی۔ تپارو کہنے لگا کہ وہ خود اپنی بہو سے معلوم کرے گا اور اگر کوئی کام کی بات ہوئی تو مجھے بتا دے گا۔ پریتم بھی گھر میں ہی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تم میرے پاس تھانے آ جاؤ لیکن تپارو یا نیتو کو بتائے بغیر۔

پریتم کے ساتھ گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے صحیح آدمی پر نظر رکھی ہے۔ پریتم سے پہلے شنکر نے مجھے بڑے کام کی بات بتائی تھی اور دوسرا کام کا آدمی پریتم نکلا۔ گھر کا یہ نوکر گھر کے ہر راز سے واقف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ یہی بات چھیڑی تھی کہ نیتو کا جسونت کے ساتھ کیا جھگڑا تھا۔ دولت یا کوئی اور بات۔ پریتم کا کہنا تھا کہ دولت کوئی بڑی بات نہیں جسونت کے باپ کے پاس بہت روپیہ ہے جس کا وہ واحد وارث تھا۔ اس کے اپنے پاس بہت پیسے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کے ڈیرے پر میں نے خود کئی بار ڈھیر سارے پیسے چارپائی پر پڑے دیکھے تھے۔ بات یہ نہیں کہ وہ اپنے سسر سے پیسے لانے کی خاطر بیوی سے لڑتا تھا۔ نیتو کو اصل شکایت یہ تھی کہ وہ گھر کیوں نہیں رہتا۔ ڈیرے پر کیا رکھا ہے؟

ڈیرے پر کیا تھا جسے چھوڑ کر جسونت گھر نہیں جاتا تھا۔ اس بارے میں پریتم جانتا بھی تھا لیکن فی الحال مجھے نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے پریتم اور شنکر کے بعد نیتو کے دونوں بھائیوں دلمیر اور شمیر سے بات کی۔ دونوں کو کوئی علم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے خاص طور پر اس طرح پوچھ گچھ کی کہ کہیں انہوں نے تو جسونت کو ٹھکانے نہیں لگایا لیکن وہ دونوں تو سرے سے اس بات سے ہی ناواقف تھے کہ ان کی بہن اور بہنوئی کے درمیان کوئی جھگڑا ہے بھی یا نہیں۔ اب یا تو پریتم ہی اصل بات بتاتا یا شنکر کوئی ٹوہ لیتا۔ نیتو خود بڑی پکی تھی۔ اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ زبان بند کر چکی تھی یا اسے پتہ ہی نہیں تھا۔ بہرحال میں نے پریتم کے ساتھ پھر سر کھپانا ضروری خیال کیا اور جسونت کے سالوں سے بات کر کے جب تھانے واپس گیا تو کچھ دیر آرام کر کے میں نے پریتم کو بلوا لیا۔ اپنے سامنے بٹھا کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ آ گیا۔ اس ہندو کی شکل ہی مجھے مکار لگنے لگی۔

"پریتم! میں تم سے بڑی رعایت کر رہا ہوں۔ تم مجھے وہ باتیں سناتے ہو جو سارے لوگ جانتے نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جسونت اور نیتو کے جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی۔ تم بھی اسی گھر میں رہتے ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم نے کوئی بات نہ سنی ہو۔ رات گئے تک سر کھپانے کے باوجود پریتم نے کوئی خاص بات نہ بتائی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں یہ شک ہونے لگا کہ یہ خود بھی اس قتل میں ملوث ہو سکتا ہے۔ فی الحال میرے پاس میرے شک کی کوئی خاص گواہی نہیں تھی۔ صرف میرا دل کہتا تھا اور میرا احساس کبھی غلط نہیں ہوتا۔ پریتم سے مایوس ہو کر میں نے پھر شنکر سے رابطہ کیا اور اسے اپنے گھر بلایا۔ میں گھر میں اکیلا تھا اور ہم تقریباً ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ اب شنکر اور کھل چکا تھا۔ خان صاحب جس دن سے جسونت قتل ہوا ہے یقین جانوں میں ا[illegible]

نے؟ چونکہ رشتہ داری ہے اس لیے ان کے (تپارو) کے گھر بے دھڑک جاتا ہوں۔ پرسوں میں گیا تو چاچی (جسونت کی ماں) اور نیتو اکٹھی بیٹھی تھیں اور کسی عورت کو کوس رہی تھیں جس کا نام وہ نندہ لے رہی تھیں۔ اس عورت یا لڑکی نندہ کا نام سن کر میں وہاں ٹک گیا۔ اس نام پر چونکنے کی میری وجہ یہ تھی کہ میں جس نندہ نام کی لڑکی کو جانتا ہوں وہ ہمارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہے اور تپارو کے شریکے برادری کی ہے۔ اس کا باپ اور اس کے بھائی بہت ہی اتھرے ہیں۔ ان کی ایک ہی بہن ہے اور وہ ہے بہت شکل صورت والی۔ چاچی اور نیتو نندہ کو اس لیے کوس رہی تھیں کہ ان کے کہنے کے مطابق جسونت اب نندہ کا کھلے عام نام بھی لینے لگا تھا اور انہیں کسی نے بتایا تھا کہ نندہ ڈیرے پر بھی دیکھی گئی ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ نندہ کے بھائیوں یا باپ میں سے کسی نے اسے جسونت کے ڈیرے پر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا۔ انہوں نے اپنی دھی بہن کو کچھ نہیں کہا لیکن جسونت کو پار کر دیا۔

شنکر کا یہ کہنا میرے لیے ایک نئی راہ ثابت ہوا کیونکہ اس کی بات میرے بھی دل کو لگی۔ جسونت کی ماں اور اس کی بیوی اگر کسی لڑکی کو کوستی ہیں اور اس کا تعلق جسونت سے جوڑتی ہیں تو پھر ضرور کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی اور جیسا کہ شنکر کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کے باپ بھائی اتھرے آدمی ہیں تو ایسی صورت میں قتل ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی اور ماجھے کے علاقے میں سکھوں کے خاندانوں میں تو یہ بہت معمولی بات تھی۔ شنکر نے جو بات سنی تھی وہ تو اُڑتی اُڑتی ہی ہو گی کیونکہ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک دن اچانک تپارو کے گھر گیا تو چاچی اور نیتو باتیں کر رہی تھیں۔ اس لیے پوری بات کا علم اگر ہو گا تو [illegible] بھی ہیں

اور گھر کے مالک انہیں وفادار سمجھ کر ان سے دل کی بات بھی کر لیتے ہیں۔ شنکر کی بات سن کر میں نے اسے فارغ کر دیا اور کہا کہ وہ یہی بات زیادہ تفصیل سے معلوم کر کے آئے۔ میں نے دوسرے دن ہی پریتم کو قابو کر لیا۔ میں نے اسے کہا کہ اتنے دن ہو گئے ہیں تم نے ابھی تک کام کی بات نہیں کی مجھے چکر نہ دو اور جو کچھ تمہیں پتا ہے بتا دو۔ پھر وقت ضائع کرو گے تو مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

پریتم ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے لگ گیا۔ میں نے مجبوراً نندہ کا نام لیا۔ پریتم کو ایسے لگا جیسے اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ اس کی یہ حالت بہت تھوڑی دیر رہی اور وہ سنبھل گیا لیکن اس کی حالت میں تبدیلی میں نے نوٹ کر لی تھی۔ میں نے اب اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

پریتم! تم نوکروں میں ایک خرابی یہی ہوتی ہے کہ تم بات کو سمجھنے میں بہت دیر کر دیتے ہو۔ اتنے دن تم نے نندہ کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ گھر میں تمہاری مالکن اور نیتو دونوں ہی اسے کوسنے دیتی ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا ہے لیکن تم نے انہیں کوستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ نندہ تپارو کے شریکے برادری کی لڑکی ہے اور اس کا باپ اور بھائی بہت اتھرے ہیں۔ انہوں نے نندہ کو جسونت کے ڈیرے پر جاتے دیکھ کر جسو کو اس دنیا سے ہی بھیج دیا۔

میری اتنی لمبی بات کے شروع میں پریتم کے چہرے پر جو رنگ آ کر گزر گیا تھا اب اس کا نشان بھی باقی نہیں تھا بلکہ اب اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔ مجھے اس کی تبدیلی پر بڑی حیرانی ہو رہی تھی لیکن اس وقت مجھے اس تبدیلی کی سمجھ نہیں آئی

www.urdukorner.com

تھی۔ بعد میں جا کر اس کا پتہ چلا۔

پریتم میری بات سن کر صاف مکر گیا کہ اسے کسی چیز کا پتہ نہیں۔ اس نے کبھی مالکن یا نیتو کے منہ سے نندہ والی کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی اسے یہ پتہ ہے کہ تپارو کی کون سی شریکے برادری میں نندہ نامی لڑکی ہے جو جسونت کے ڈیرے پر جاتی رہی ہے۔ وہ کہنے لگا: ''سرکار! مجھے ان باتوں کا پتہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں لیکن میں معلوم کروں گا۔'' پریتم کے اس جواب نے اسے میرے نظروں میں مشتبہ نمبر ایک بنا دیا۔ یا تو یہ نوکر قتل میں ملوث تھا یا شنکر مجھے چکر دے رہا تھا لیکن دل شنکر کی طرف سے مطمئن تھا۔ مجھے بار بار شک اسی پریتم پر ہوتا تھا لیکن ابھی وقت نہیں تھا کہ اسے حوالات میں ڈال دیتا اور پھر اس کا باپ بھی مجھ سے جھوٹ نہ بولتا۔

میں ایک بار پھر تپارو کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ تمہاری شریکے برادری میں نندہ نام کی کسی لڑکی کے جسو سے تعلقات تھے؟ وہ کہنے لگا کہ اسے پتہ نہیں لیکن اگر تھے تو ایسی باتیں عورتوں کو زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ میری بیوی یا بہو سے پوچھ لیں۔

نیتو اس سے پہلے میرے ساتھ بے کار باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجھے اس سے کوئی خاص بات معلوم ہونے کی کم ہی امید تھی۔ اس لیے میں نے تپارو سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ چونکہ ماں تھی اور اس کا بیٹا قتل ہوا تھا اس لیے اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ فوراً اُگل دیتی۔

تپارو نے اپنی بیوی کو بلا لیا اور میں نے اس سے اظہار ہمدردی کے بعد پوچھا کہ اس کو اپنے بیٹے کے بارے میں کیا کیا معلوم ہے۔ بیٹوں کو اگر کوئی مسئلہ ہو تو وہ ماں سے ذکر ضرور کرتے ہیں یا بیوی کے ساتھ جھگڑا ان کی ماں کے علم میں آ جاتا ہے۔ تپارو کی بیوی کہنے لگی کہ اس کی بہو کے ساتھ دوہری رشتہ داری ہے۔ وہ بہت اچھی ہے صرف جسو میں خرابی تھی اور وہ اس حرام کی جنی کے عشق میں پھنس گیا تھا۔

''نندہ'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

میرے منہ سے نندہ کا نام سنتے ہی وہ ٹھٹھک کر میری طرف دیکھنے لگی اور تپارو بھی منہ کھولے کبھی میری طرف دیکھتا کبھی اپنی بیوی کی طرف۔ شاید اسے پہلی بار علم ہوا تھا کہ جسونت کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں نے تپارو کی بیوی سے کہا کہ وہ بات کرتی رہے۔

''ہاں نندہ ہی اس لڑکی کا نام ہے۔ ہمیں نام اس لیے معلوم ہوا ہے کہ جسو اب اُٹھتے بیٹھتے اس کا نام لینے لگا تھا اور نیتو کے ساتھ اس لڑکی کی وجہ سے ہی جھگڑا رہنے لگا تھا۔''

''یہ نندہ تمہارے شریکے برادری والی لڑکی ہے ناں!''

''اس کا مجھے پتہ نہیں۔ صرف نام جانتی ہوں۔''

''تم نے کبھی جسو سے پوچھا تھا کہ یہ نندہ کون ہے؟''

جسو کی ماں چپ ہو گئی پھر بولی۔

''میں نے جسو سے نہیں پوچھا کہ یہ نندہ کون ہے۔ ہمارے شریکے برادری والی یا کوئی دوسری لیکن وہ جو ہماری رشتے دار نندہ ہے وہ تو شکل صورت کی واجبی سی ہے اور مجھے نہیں یقین کہ اس نے (جسو نے) کبھی اس کے ساتھ شادی کا سوچا بھی ہو۔ ویسے بھی اس کے باپ بھائی اچھی فطرت والے نہیں اور ہم انہیں پسند نہیں کرتے۔ میں نے اپنی بہو سے ایک بار پوچھا [illegible]

نہیں؟ لیکن اس کا بھی وہی خیال تھا جو میرا خیال تھا یہ نندہ وہ نہیں بلکہ مہیشوری کی بیٹی ہے جو ہمارے اس گاؤں میں رہتے ہیں جہاں ہماری زیادہ زمین ہے اور وہیں جسو نے ڈیرہ بنایا ہوا ہے۔

''یہ مہیشوری کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مہیشوری کا گھر والا فوج میں صوبے دار تھا۔ وہ کسی چھاؤنی میں مر گیا۔ یہ ودھوا ہو گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بجائے سسرال میں ہی رہی۔ اس کے ساس سسر بھی دنیا سے چلے گئے۔ ان کی جو زمین گھر تھا وہ اسی کے حصے میں آیا کیونکہ صوبے دار کا نہ بھائی تھا نہ بہن۔ مہیشوری کی ایک ہی بچی تھی وہ اب جوان ہو چکی ہے۔ اسی کا نندہ نام ہے۔''

میں نے جسو کی ماں سے پوچھا کیا واقعی انہیں یقین ہو گیا ہے کہ جسو کے نندہ سے تعلقات تھے۔

''اس کا تو پتہ نہیں لیکن وہ میری نیتو پر سوکن لانے کی باتیں بہت کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اسے گالیاں دی تھیں کہ میری بہو میں کیا خرابی ہے لیکن پتہ نہیں اس لڑکی نے اس پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ جسو سارے رشتے ختم کرنے پر تل گیا تھا۔''

میں نے دل میں سوچا کہ ان عورتوں کو جتنا معلوم تھا وہ میں جان چکا ہوں۔ اب یہ کھوج شنکر لگائے گا کہ نندہ والا پورا چکر کیا تھا۔

میں یہی سوچ کر تپارو کے گھر سے تھانے آیا اور شنکر کو بلوا لیا۔ میں نے اسے بلانے کے لیے آدمی بھیجا لیکن وہ آدمی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد خود ہی آ گیا۔ کہنے لگا۔

''میں تھانے کے دو تین چکر مار چکا ہوں۔ آپ پتہ نہیں کہاں تھے۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہیں۔'' میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں تپارو کے گھر اس کی بیوی سے بات کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ کرو لیکن جو نندہ تم سمجھ رہے ہو وہ جسونت والی نندہ نہیں! میری بات سے شنکر بہت حیران ہوا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وہ ہماری برادری والی نندہ نہیں جس کے ساتھ جسو کے تعلقات تھے تو پھر کون سی نندہ ہے یہ؟''

''یہی جاننا تمہارا کام ہے۔'' میں نے اس کا امتحان لینا شروع کر دیا اور وہ سوچنے لگ گیا۔

''شنکر جو بات تم نے معلوم کرنا تھی وہ نہیں کر سکے۔ وہ میں نے معلوم کر لی ہے۔ یہ نندہ صوبے دار کی بیٹی ہے۔ مہیشوری کی بیٹی۔ سمجھ گئے؟''

مہیشوری کی بیٹی کا نام سن کر شنکر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے دور کسی چیز کو دیکھنے لگیں۔

''لعنت میری یادداشت پر۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ یہ نندہ تو میں نے ایک بار جسو کے ڈیرے کے قریب دیکھی تھی۔ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ڈیرے پر گئی تھی یا ادھر سے گزر رہی تھی۔ آپ کو کس نے یہ بات بتائی ہے؟''

''چلو اب تم جان تو گئے ہو کہ یہ نندہ کون سی ہے تو جاؤ جا کر اس کی پوری کھوج لاؤ۔ کیا خیال ہے ایک دو دن میں آ جاؤ گے؟'' شنکر نے سر ہلایا اور وہ اس قدر حیران تھا کہ مجھ سے مزید بات کیے بغیر چلا گیا۔

شنکر واقعی کھوج لگا لایا تھا اور اس بار میری توقع سے بڑھ کر اس نے کھوج لگائی تھی۔ میرے بھیجنے کے تیسرے دن وہ واپس مجھے تھانے نہیں بلکہ اپنے گھر آ کر ملا۔ جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''خان صاحب آپ نے ٹھیک کہا تھا یہ وہی مہیشوری والی نندہ ہے لیکن اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ وہ یہاں سے دو تین گاؤں آگے ایک گھر میں بیاہی گئی ہے۔ یہ صوبے دار کے دور پار کے

www.urdukorner.com

رشتہ دار ہیں۔''

''کب بیاہی گئی ہے؟ جسو کے ساتھ تعلقات سے پہلے یا بعد میں؟'' میرے سوال کے جواب میں شنکر نے بتایا کہ جب جسو قتل ہوا ہے اس سے ایک آدھ دن پہلے کی بات ہے۔ ''خان صاحب اس بات کو چھوڑیں جو بات میں معلوم کر کے آیا ہوں وہ بڑی زبردست ہے۔ میں نے گاؤں کی ایک عورت سے معلوم کیا ہے۔ اس عورت کے بارے میں آپ نہ ہی پوچھیں۔ ایسی عورتیں ہر گاؤں میں ہوتی ہیں جو آج میرے ساتھ کل دوسرے کے ساتھ۔ ایک ایسی ہی عورت ہے وہ جس کو میں نے کھوج کے کام پر لگایا۔ وہ بہت کچھ جانتی تھی اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ جسو نندہ کا رشتہ چاہتا تھا اور اس نے نندہ کی ماں مہیشوری سے بات کی۔ اس دوران اس نے نندہ سے تعلق بھی بنا لیا۔ وہ اس کے ڈیرے پر بھی آنے لگی لیکن مہیشوری خواہ غریب عورت تھی لیکن وہ جسو کو اس کی دولت کے باوجود اچھا آدمی خیال نہیں کرتی تھی۔ اس نے جسو کو صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے نندہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، کل کو اسے کوئی اور عورت پھر پسند آ گئی تو وہ نندہ کو چھوڑ کر اس سے بیاہ کر لے گا۔ اس لیے وہ اسے رشتہ نہیں دے سکتی۔ اس انکار پر جسو کو آگ لگ گئی کہ ایک نچلے گھرانے کی عورت نے اسے جواب دے دیا ہے۔ اس نے شاید نندہ سے بھی بات کی ہو گی لیکن شاید وہ بھی ماں کی مرضی کے بغیر شادی پر تیار نہیں تھی اس لیے اس نے جسو کے ڈیرے کی طرف جانا بند کر دیا۔ مہیشوری کے انکار پر جسو نے اسے دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس کی لڑکی کو اٹھا لے گا لیکن مہیشوری پتہ نہیں کیوں چپ تھی نہ ہی وہ خوفزدہ تھی۔ مجھے ایک دن مہیشوری کنویں پر مل گئی۔ میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو وہ پھٹ پڑی اور رونے لگ گئی۔ روتے روتے اس نے بتایا کہ نندہ کا باپ زندہ ہوتا تو یہ بکھیڑے نہ ہوتے۔ اس نے بتایا کہ وہ نندہ کا رشتہ صوبے دار کے رشتہ داروں میں کر رہی ہے۔ وہ تگڑے لوگ ہیں۔ نندہ ان میں بیاہی گئی تو وہ خود ہی اس کی حفاظت کر لیں گے۔ اس ملاقات کے بعد کافی دن تک مہیشوری نظر نہیں آئی نہ ہی اس کی بیٹی نندہ۔ ان کے گھر پر تالہ لگ گیا۔ کوئی چھ سات دن بعد مہیشوری پھر گاؤں میں نظر آئی۔ اس نے اپنا گھر کھول لیا تھا اور وہیں اکیلی رہ رہی تھی۔ میں نے گھر کھلا دیکھا تو اس کے پاس گئی۔ میں نے پوچھا کہ نندہ کہاں ہے تو کہنے لگی کہ میں نے تمہیں بتایا تھا میں اس کی شادی کر رہی ہوں۔ میں نے اسے صوبے دار کے رشتہ داروں میں بیاہ دیا ہے۔ وہ اپنے سسرال میں ہے۔ میں نے اسے یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ اگر ملنا ہو گا تو میں خود جا کر اس سے مل لیا کروں گی۔ میرا داماد کہتا ہے کہ میں ان کے گھر میں آ جاؤں۔ اتنی بڑی حویلی میں مجھے بھی ایک کمرہ مل جائے گا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں اپنے اسی گھر میں رہوں گی جو صوبے دار نے خود بنایا تھا۔ نندہ کے بیاہے جانے کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے مہیشوری سے کہا کہ میں اس کے پاس آتی جاتی رہوں گی لیکن پھر مجھے مہیشوری سے ملنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ چند دن بعد میں اس کے گھر گئی تو پھر تالہ لگا ہوا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی ہو گی۔ وہ دن اور آج کا دن اس کے گھر تالہ لگا ہوا ہے۔''

شنکر اس عورت کی بات سنا کر کہنے لگا ''خان صاحب مجھے تو پکا یقین ہو چلا ہے کہ جسو کے قتل میں اسی نندہ کا چکر ہے۔'' شنکر نے جو نئی بات سنائی تھی

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

اس کے بعد تو مجھے بھی شک ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں نندہ والا چکر ہے۔ میں نے شنکر سے کہا کہ مجھے نندہ کے گھر جانا ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ مہیشوری وہاں ہے کہ نہیں۔ اس لیے تم اس عورت سے جس نے تمہیں یہ باتیں بتائی ہیں یہ معلوم کرو کہ نندہ کا گھر ہے کہاں۔ مہیشوری نے ضرور اسے بتایا ہوگا ورنہ مجھے بتاؤ وہ عورت کون ہے میں خود پوچھ لوں گا۔ شنکر گھبرا گیا کہنے لگا آپ رہنے دیں میں معلوم کر کے آتا ہوں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شنکر واپس آ گیا۔ وہ نندہ کے گھر کا پتہ معلوم کر کے آیا تھا۔ ہم نے گھوڑے لیے اور شام ہونے سے پہلے صوبے دار کے رشتہ داروں کی حویلی پہنچ گئے۔ ہمیں مہیشوری کے داماد کا نام معلوم نہیں تھا جب ہم نے نندہ کے بارے میں پوچھا تو ایک آدمی گرم ہو کر ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کون ہیں اور کیا بات ہے نندہ میری بیوی ہے۔ ہم اسے ایک طرف لے گئے اور اپنا تعارف کرایا جس پر وہ نرم پڑ گیا۔ اس نے بتایا کہ صرف نندہ یہاں ہے۔ اس کی ماں مہیشوری کافی دنوں سے نہیں آئی بلکہ نندہ کہہ رہی ہے کہ اس نے ماں سے ملنا ہے میں اسے خود کسی دن لے کر آنے والا تھا۔

مہیشوری کی گمشدگی کا سن کر اس کا داماد پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو اور یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائے۔ میں خود مہیشوری کو تلاش کر رہا ہوں اور جب تک میں نہ کہوں تم نے نندہ کو نہیں بتانا۔ اس کے بعد ہم تھانے واپس آ گئے۔ راستے میں میں نے شنکر سے کہا کہ جسو مارا گیا ہے اور مہیشوری غائب ہے۔ اب تم کیا کہتے ہو؟ شنکر کہنے لگا چکر واقعی گھمبیر ہے۔ مجھے جانے دیں میں اور کھوج کرتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ مہیشوری کے بھائیوں کے گھر چلیں وہ وہاں نہ ہو۔ ہم اس کے بھائیوں کے گھر چلے گئے۔ ان کا گھر بھی بند پڑا تھا۔ مہیشوری کے بھائی بھی غائب تھے۔

شنکر کے جانے کے بعد میں بھی گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے محرر کے کمرے سے آدمیوں کے اونچا اونچا باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک سپاہی کو آواز دی کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا بات ہے وہ مجھے آ کر بتانے لگا کہ گاؤں کے دو آدمی لڑ پڑے ہیں۔ پہلے ان کے بیچ آپس میں لڑے ہیں اور پھر یہ لڑ پڑے ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے ہیں۔ ایک کا سر پھٹ گیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے پاس شکایت کرنے آ رہا تھا کہ دوسرا بھی آ گیا ہے۔ دونوں میں سے ایک کا بچہ بھی ساتھ ہے۔ میں نے اسے کہا کہ دونوں کو یہاں لے آؤ۔ دونوں آ گئے تو میں نے انہیں اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ کی کہ بچوں کی لڑائی میں تم بھی بچے بن ہو گئے ہو۔ جس آدمی کا سر پھٹا تھا وہ دوسرے کے بارے کہنے لگا کہ اسے زیادتی کرنے کی عادت ہے کیونکہ اس کا بچہ جسونت کے ڈیرے پر بھی کام کرنے چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو جسو کا رعب رہتا تھا۔ آج جب ہمارے بچے لڑ پڑے اور میں نے ان کی زیادتی کی اس سے شکایت کی تو اس نے بجائے انصاف کرنے کے مجھے اور میرے بچے کو مارا ہے اور اُلٹا شکایت کرنے یہاں چلا آیا۔ میں بھی آ گیا کہ صحیح بات بتاؤں۔ سر پھاڑنے والے اور اس کے بچے کی طرف میں نے نظر اُٹھائی اگر یہ بچہ جسو کے ڈیرے پر جاتا تھا تو اسے بہت کچھ معلوم ہوگا۔ اس ڈیرے پر جو لوگ آتے تھے وہ بچے کے سامنے ایسی باتیں بھی کرتے ہوں گے جو دوسروں کے آگے نہیں کرتے۔

میں نے جس آدمی کا سر پھٹا تھا اسے کہا کہ

جائے۔ دوسرے کو اور اس کے بچے کو میں نے وہاں بٹھا لیا۔ کافی دیر بٹھانے کے بعد جب میں نے اندازہ کیا کہ وہ آدمی اب اُکتا گیا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں اسے ضرور سزا دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تمہارے بچے سے باتیں کرنا ہیں تم گھر جاؤ۔ میں اسے سپاہی کے ساتھ گھر بھیج دوں گا۔ وہ پہلے تو ہچکچایا پھر چلا گیا۔ میں نے بچے کو پچکارا اور اس کا حوصلہ قائم کیا کہ میرا اسے ماروں گا نہیں۔ اس کے بعد اس سے پوچھنے لگا کہ وہ ڈیرے پر کیا کرتا ہے؟ ”میں ڈیرے پر بھینسوں کو پانی اور چارہ دیتا ہوں اور چھوٹے موٹے کام کرتا ہوں۔“ دس بارہ سال کے اس لڑکے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کافی کچھ دیکھ چکا ہے کیونکہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بول رہا تھا۔

”کیا اس ڈیرے پر تم نے کبھی کوئی عورت دیکھی ہے؟“ میرا سوال سن کر وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس سے ادھر ادھر کی کافی باتیں کر کے پھر وہی بات پوچھی تو وہ چپ ہی رہا۔ شاید وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا جبکہ مجھے اس سے اسی سوال کا جواب لینا تھا۔ میں نے اسے پچکارا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اب جسو تو مر گیا ہے اور میں بھی اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ لڑکا میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ پھر جب اسے یقین آ گیا تو کہنے لگا: ”وہ۔۔۔ صوبے دارنی۔۔۔ کی بات کر رہے ہیں آپ؟“

”کونسی صوبے دارنی؟“

”وہ جی نندہ کی ماں وہ ایک دن وہاں آئی تھی اور اس نے جسو سے کہا تھا کہ جو کرنا ہے کر لو۔ اس کے اگلے دن جسو نے مجھے نندہ کے گھر بھیجا تھا کہ مہیشوری کو بلا کر لاؤ۔ میں اسے بلا کر لے آیا تھا۔ ڈیرے پر جسو کا اس کے ساتھ بہت جھگڑا ہوا۔ وہ دونوں جھگڑ رہے تھے اور مہیشوری کہہ رہی تھی کہ نندہ پر تم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگا اور جسو نے مجھے وہاں سے بھگا دیا کہ گھر چلے جاؤ۔ میں ڈرتا ہوا گھر آ گیا۔ میں نے ان کی لڑائی کی بات گھر بھی نہیں بتائی۔ صبح میں ڈیرے گیا تو جسو نے مجھے پھر بھگا دیا اور کہا کہ تم گھر جا کر کھیلو۔ بھینسوں کو چارہ دینے کی ضرورت نہیں وہ خود دے لے گا۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو چھٹی مل گئی۔ اس سے اگلے دن ہم گاؤں کے لڑکے ڈیرے کے آس پاس کھیلتے رہے۔ جسونت نے مجھے کہا تھا کہ ایک دو دن ڈیرے پر نہ آنا لیکن میں اس دن چھٹی ملنے پر بھی کھیلتا ہوا وہاں چلا گیا تھا۔ کھیل کے دوران میں ڈیرے پر چلا گیا کیونکہ مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ بیری کے نیچے ہم نے گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں جو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں وہاں جسونت کے دوست بیٹھ اور گامی بیٹھے ہوئے تھے۔ جسونت ان کے پاس نہہل رہا تھا اور وہ ہنس رہے تھے۔ گامی جسونت کو کہہ رہا تھا کہ تم نے سودا اچھا کیا ہے۔ وہ نہیں تو اس کی ماں لے آؤ۔ مجھے وہاں دیکھ کر جسونت نے مجھے گالی دی کہ میں ڈیرے پر کیوں آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ پانی پینا ہے پھر چلا جاتا ہوں اور پانی پی کر دوسرے بچوں کے ساتھ گاؤں بھاگ آیا۔ رات کو سوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے جسونت ڈیرے پر کیوں نہیں جانے دیتا اور گامی کس کی ماں کی بات کر کے ہنس رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صبح جا کر دیکھوں گا۔ میں نے صبح اُٹھ کر روٹی کھائی۔ کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ ڈیرے سے ادھر مجھے باجرے میں چھپ جانا پڑا کیونکہ ادھر سے جسونت گھوڑی لے کر کہیں جا رہا تھا۔ میں خوش ہوا کہ چلو اچھا ہو گیا ہے۔ اب میں ڈیرے پر چلا جاؤں گا مجھے دیکھے گا کوئی نہیں۔ میں

www.urdukorner.com

جب ڈیرے کی بیری کے نیچے آیا تو مجھے اس کے ساتھ والے کمرے سے گامی کی آواز آئی۔ وہ پتہ نہیں کس کے ساتھ بول رہا تھا۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے اس کمرے کی طرف بھاگا جس میں ہم توڑی اور دوسرا سامان رکھتے ہیں۔ اس کے دروازے کی کنڈی اُتری ہوئی تھی میں جھٹ دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ میں آگے ہوا تو مجھے نظر آیا کہ چارپائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی ہے۔ میں اسے دیکھ کر اُلٹے پاؤں باہر بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ اس کی سرگوشی جیسی آواز سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ چوری مجھے بلا رہی ہے۔ میں جب اس کے قریب گیا تو یہ تو صوبے دارنی تھی۔ اس کے ہاتھ چارپائی سے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں سے گردن تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ ڈر کے مارے میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ صوبے دارنی کہنے لگی کہ یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو جا کر میرے بھائیوں کو بتا دینا۔ میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ مجھے سے زیادہ وہ وہاں کھڑا نہیں ہوا گیا۔ میں بھاگ آیا اور سیدھا اپنے گھر گیا۔ دوپہر تک گھر سے نکلا ہی نہیں۔ کبھی خیال آتا کہ صوبے دارنی نے جو کہا ہے اس کے بھائیوں کو جا کر بتا دوں۔ کبھی خیال آتا کہ اپنی ماں کو بتا دوں۔ دوپہر کے وقت میرے ننگی کھیلنے کے لیے آگئے اور ہم باہر چلے گئے۔ کھیلتے کھیلتے پتہ نہیں مجھے کیا خیال آیا کہ میں صوبے دارنی کے بھائیوں کے گھر چلا گیا اور اس کے بھائیوں رگھوبیر اور پرکاش میں سے ایک رگھوبیر مجھے مل گیا۔ وہ روٹی کھا رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے اسے ساری بات سنا دی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ کئی دن سے میں ڈیرے پر نہیں گیا اور پھر مجھے آپ نے بتایا ہے کہ کسی نے جسونت کو مار دیا ہے۔'' اس لڑکے کا بیان میرے لیے بہت بڑی خبر تھی۔ میں نے اسے سپاہی کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا اور خود شنکر کو بلوا لیا۔

شام کا اندھیرا اس وقت گہرا ہو چکا تھا جب میں اور شنکر گھوڑوں پر تھانے سے نکلے۔ ہم نے مہیشوری کے بھائیوں کے گھر چھاپہ مارنا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے جو بات بتائی تھی اس کے بعد میں نے شنکر کو گھر سے بلوا کر اسے ساری بات سنائی اور اس سے کہا کہ مہیشوری کے بھائیوں کا ٹھکانہ معلوم کرو۔ شنکر نے اسی عورت سے سن گن لی اور اب ہم اسی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تھانے سے کوئی لاؤلشکر نہیں لیا تھا بلکہ تین سپاہی لیے۔ شنکر نے جو جگہ معلوم کی تھی وہ بارہ میل دور تھی۔ اس زمانے میں جب سڑکیں زیادہ تھیں نہ دیہات میں بجلی تھی۔ رات کے وقت دس بارہ میل کا سفر بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے چونکہ اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی تھی نہ ہی گھوڑے بلکہ شنکر کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی رات کو گھڑسواری نہیں کی تھی۔ راستہ دیکھا بھالا ہو تو اچھے گھوڑے پر کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ جگہ یعنی راستہ انجان ہو تو وقت زیادہ لگتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگنے لگا کہ ہم پتہ نہیں کب کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ گاؤں پر گاؤں نکلتے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں گھروں کے بھولے، بھونکتے کتے، چوکیداروں کی لالٹین اور آوازیں۔ اس وقت یہ سب کچھ نظر آتا یا آواز آتی جب ہم کسی گاؤں کے پاس سے گزرتے۔ شنکر کہنے لگا کہ اس نے یہ گاؤں صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ کئی سال پہلے دوا لینے کے لیے اس گاؤں میں حکیم کے پاس آیا تھا۔ گاؤں کی ایک نشانی اسے یاد ہے کہ ایک بہت چوڑا پایا

(راستہ۔ کچی سڑک جو گاؤں کے اندر جاتی ہے) جس کے شروع میں پیپل کے تین بہت بڑے بڑے درخت ایک دائرے کی شکل میں اُگے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک جتنے گاؤں سے ہم گزرے تھے ان میں کسی جگہ ایسی نشانی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم راستہ بھول گئے تھے۔ گھوڑوں کو تھکانے کی بجائے میں نے سفر روک دیا اور سب سے کہا کہ نیچے اُتر آؤ۔

ہم اس وقت ایک بستی کے قریب ہی تھے۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر بالکل دیے کی طرح ایک روشنی نظر آ رہی تھی جو چل رہی تھی۔ گیدڑوں کی آواز کے ساتھ نہایت ہلکی انسانی آواز آ جاتی تھی جیسے کوئی چوکیدار بول رہا ہو۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ اگر یہ کوئی چوکیدار ہے تو جا کر اس سے پتہ کر کے آؤ کہ وہ گاؤں کس طرف ہے جہاں ہم نے جانا ہے۔ شنکر بھی اس آدمی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ وہ گھوڑوں پر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آ گئے۔ شنکر کہنے لگا کہ ہم دو گاؤں آگے نکل آئے ہیں۔ پیچھے جانا ہوگا۔ ہم نے اس طرف رُخ کر لیا جدھر سے آئے تھے۔ ایک بستی گزرنے کے بعد دوسری آئی تو مجھے وہ درخت نظر آ گئے جو میرے دائیں طرف تھے۔ میں نے گھوڑا ان کے پاس لا کھڑا کیا۔ یہ دائرے میں اُگے ہوئے پیپل کے تین درخت تھے۔ جن کے ساتھ وہ چوڑا راستہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی مہیشوری کے بھائیوں کا گاؤں نہیں دیکھا ہوا تھا اس لیے کسی کو ان کے گھر کا پتہ نہیں تھا۔ اس وقت ہم کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ جس گھر میں ہم نے جانا ہے وہ کون سا ہے۔ اس کے لیے چوکیدار ہی مدد کر سکتا تھا اور اسی امید کے ساتھ ہم گاؤں میں داخل ہو گئے۔ یہاں چوکیدارے کا انتظام بہت اچھا تھا۔ ہم گاؤں کے پہلے گھر کے پاس ہی پہنچے تھے کہ چوکیدار لالٹین لے کر چکر لگاتا ہوا ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ ایک سپاہی نے آگے ہو کر اپنا اور ہم سب کا بتایا اور میری طرف اشارہ کیا۔ چوکیدار نے پاس آ کر پرنام کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ میں نے اسے اپنی مشکل بتائی۔ وہ سر کھجانے لگا اور سوچ کر بولا کہ یہاں رگھوبیر اور پرکاش رہتے ہیں جن کا ایک بہنوئی فوج میں تھا۔ میں آپ کو ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیں۔ وہ ہمیں گاؤں کی طرف لے گیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے خیال آیا کہ گھوڑے یہیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن گھوڑے یہاں کہاں رکھے جائیں۔ میں نے شنکر اور ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور ہم چوکیدار کے ساتھ چل پڑے۔ گلیوں میں سے گھومتا گھماتا چوکیدار ہمیں ایک مکان کے سامنے لے گیا اور اس نے خود دروازے کو کھڑکایا۔ کافی دیر بعد ایک آدمی دروازے کی طرف آتا سنائی دیا۔ اس نے اندر سے کنڈی گرائی اور ایک پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے چوکیدار تھا جس کے پیچھے ہم کھڑے تھے۔ وہ پوچھنے لگا ''مہنتا کیا بات ہے۔ یہ کون آدمی ہیں؟'' مہنتا چوکیدار کہنے لگا کہ تم سے ہی ملنا ہے انہوں نے۔ ان کو اندر لے جاؤ۔ گھبراؤ نہیں رگھوبیر۔

''مہنتا پتہ نہیں تم کس آدمیوں کو میرے پاس لے آئے ہو؟'' اس نے دروازہ بند کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے چوکیدار کو ایک طرف ہٹایا اور رگھوبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ میرے پیچھے شنکر اور سپاہی بھی آ گئے۔ مہنتا بھی اپنے چکر پر جانے کی بجائے میرے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔

اندر صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر

www.urdukorner.com

چادریں لیے دو آدمی پڑے تھے۔ ہماری آواز سن کر ان میں سے ایک اُٹھ بیٹھا اور اونچی آواز میں بولا ''رگھوبیرے کیا بات ہے کون ہیں یہ آدمی؟'' رگھوبیر نے جواب نہیں دیا بلکہ چوکیدار کہنے لگا ''پرکاش کوئی نہیں خیر ہے۔'' پر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سرہانے رکھی ہوئی ڈانگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اس کا ارادہ اچھا نہیں لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈانگ پر ہاتھ ڈالتا میں چھلانگیں مار کر اس کے سر پر جا پہنچا اور میرے زوردار مکے سے وہ گھوم گیا۔ اسے مکا پڑتا دیکھ کر رگھوبیر شنکر سے لپٹ گیا اور اسے مارنے لگا۔ چوکیدار نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چھڑانے لگ گیا۔ میں نے پرکاش کو مکوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ سپاہی نے رگھوبیر کی طبیعت صاف کر دی۔ اب دونوں زمین پر پڑے ہانپ رہے تھے۔ اب تیسرا آدمی بھی اُٹھ کر چادر لپیٹے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن پاس جا کر رُک گیا کیونکہ یہ ایک عورت تھی۔ شنکر میرے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے حیرانگی سے مہیشوری کا نام نکلا۔ اچانک رگھوبیر نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے پر جا لیا۔ سپاہی نے پھرتی دکھائی اور پرکاش کو پکڑ لیا۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ مجھے رسی دو ان کی مشکیں باندھنا ہیں۔ اس نے کندھے پر پڑی چادر میری طرف پھینک دی۔ میں نے شنکر سے کہا کہ رگھوبیر کو باندھ لو۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے پرکاش کو باندھا لیکن انہیں تھانے لے جانا ضروری تھا۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ کسی سواری کا انتظام کرو۔ وہ جا کر نمبردار کو بھی لے آیا اور سواری کو بھی۔ میں تینوں کو تھانے لے آیا۔

تھانے میں ایک رات اور دن رکھنے کے بعد پہلے رگھوبیر سے پوچھ گچھ کی تو وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ پرکاش اور رگھوبیر بہت چالاک ثابت ہوئے۔ نہ ان پر مار اثر کرتی اور نہ ہی وہ میری کسی بات میں آتے تھے لیکن انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ میرے پاس کیا ہتھیار ہے۔ میں نے تنگ آ کر اس لڑکے کو بلا لیا جس نے انہیں مہیشوری کے توڑے والے کمرے میں ہونے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے رگھوبیر کو حوالات سے نکال کر اپنے کمرے میں بٹھایا اور اس لڑکے کو اس کے سامنے کر دیا۔ وہ اسے دیکھ کر پیلا زرد پڑ گیا اور سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کے سامنے لڑکے سے پوچھا ''یہی مہیشوری کا بھائی ہے ناں؟ اور تم نے اسی کو جا کر بتایا تھا ناں کہ مہیشوری جسونت کے ڈیرے پر توڑی والے کمرے میں قید کی ہوئی ہے؟'' لڑکا رگھوبیر کے سامنے کہنے لگا کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ میں نے اس آدمی کو مہیشوری کی بات جا کر بتائی تھی اور اس نے مجھے کہا تھا کہ میں جاؤں۔ یہ مہیشوری کا بھائی ہے اور مہیشوری نے مجھے اسی کے پاس بھیجا تھا۔

میں نے لڑکے کے اتنا کہنے کے بعد اسے وہاں سے بھیج دیا اور رگھوبیر سے کہا کہ اب چھپانے کا فائدہ نہیں۔ مہیشوری مجھے بتا چکی ہے کہ تم نے اور پرکاش نے مل کر جسو کو مارا ہے۔ میرا یہ وار رگھوبیر نے بیکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ مہیشوری جھوٹ بولتی ہے اور لڑکا بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ رگھوبیر سخت جان تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میں نے اس پر توجہ ختم کر دی اور مہیشوری کو پکڑ لیا۔ مہیشوری نے بڑی دردناک بات بتائی۔

''یہ جسونت سنگھ میری بیٹی نندہ پر عاشق ہو چکا تھا۔ اس [illegible]

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

لیکن نندہ نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میری ماں کو منا لو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر جسونت نے مجھے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اس بدمعاش کو رشتہ نہیں دے سکتی تھی۔ میرے انکار پر جسونت نے مجھے جان سے مارنے اور نندہ کو اٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں۔ میں نے یہ بات اپنے بھائیوں کو نہیں بتائی تھی۔ میں نے خاموشی سے نندہ بیاہ دی۔ جب جسو کو معلوم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے ایک رات مجھے اُٹھا لیا اور ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں اس نے۔۔۔ میں بتا نہیں سکتی۔۔۔ سمجھ لیں میں اسی رات مر گئی تھی۔ صرف جسو ہی نہیں اس کا کوئی یار بھی جسے وہ گامی کہتا تھا۔۔۔ پتہ نہیں میں کتنے دن اور سولی پر چڑھتی کہ گاؤں کا ایک لڑکا اس کمرے تک آ گیا جہاں میں قید تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ بھائیوں کو پیغام دیا۔ اسی رات میرے دونوں بھائی مجھے نکالنے آ گئے۔ جسو اور گامی دوسرے کوٹھے میں شراب پی رہے تھے۔ میرے بھائی مجھے نکال کر لے گئے اور اس گاؤں لے گئے جہاں میرے چچا کا مکان ہے اور جہاں سے آپ نے میرے بھائیوں کو پکڑا ہے۔ جب ہم وہاں چلے گئے تو میرے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب جسو کو اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتی رہی لیکن ایک دن جسو کے قتل کی خبر میں نے بھی سن لی۔

مہیشوری کے بیان کے بعد کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ پرکاش مجھے کمزور لگ رہا تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح مروایا۔ اس کی برداشت سے زیادہ اور پھر اس نے بتا دیا کہ جسونت کو انہوں نے کیسے قتل کیا۔

''ہماری بہن کے ساتھ جسونت نے جو کچھ کیا اس کی کم سے کم سزا اس کا خون ہی ہو سکتی تھی۔ مہیشوری کو اس کے ڈیرے سے نکال لانے کے بعد میں نے اور رگھویر نے جسونت کے قتل کی بات پوری کر لی۔ اس کے پاس بدمعاشوں کا ٹھکانہ ہوتا تھا اس لیے ہمیں گھر کے بھیدی کی ضرورت تھی۔ پرتیم سے بڑا بھیدی اور کون ہو سکتا تھا۔ اس آدمی کی ایک ہی کمزوری ہے وہ ہے پیسہ۔ ہم نے جسو کے گاؤں میں اپنی تین کلے زمین بیچ دی اور پیسہ پرتیم کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ یہ سودا ہوا تھا کہ جسو کے کھانے میں دھتورا ملا دے اس کے بعد ہم سنبھال لیں گے۔ دھتورا رگھویر لے کر آیا تھا۔ پرتیم انتظار کرنے لگا کہ گامی وغیرہ ڈیرے سے جائیں اور جسو اکیلا ہو۔ وہ کھانا لے کر ڈیرے پر جاتا تو ہم ذرا فاصلے پر اس کے ساتھ ہوتے۔ ایک دن جسو اکیلا ہی تھا۔ پرتیم کو بھی موقع مل گیا اور ہمیں بھی۔ دھتورا کھا کر جسو بے جان ہو رہا تھا کہ ہم اس کے سر پر نازل ہو گئے۔ میرے پاس کلہاڑی اور رگھویر کے پاس ٹوکا تھا اور پھر ہم جیسے پاگل ہو گئے۔ پرتیم برداشت نہیں کر سکا اور بھاگ گیا۔

پرکاش کا بیان سن کر میں نے سپاہی ساتھ لیے اور تپارو کے گھر جا کر پرتیم کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد کی کارروائی ساری کی ساری تھانے میں ہوئی۔ میں نے پرکاش کے ساتھ جا کر وہ کلہاڑی اور ٹوکا برآمد کیا جو انہوں نے جسو کے ڈیرے پر ہی ایک روڑی (کوڑے اور گوبر کا ڈھیر) پر پھینک دیے تھے۔ رگھویر اور پرکاش جسونت کے قتل میں اور پرتیم جرم میں مدد دینے پر سزا پا گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کو عمر قید ہو گئی تھی۔ تپارو انتظار کرتا رہا کہ دونوں باہر آئیں تو اپنے بیٹے کا بدلہ لے۔ پتہ نہیں اس کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں کیونکہ میں کچھ دیر بعد وہاں سے تبدیل ہو گیا تھا۔

سیلاب کہانیاں

پروفیسر محمد ظریف خان

125 افراد..... ہر بس میں..... اور روپے؟ محض دو ہزار..... یعنی 15 روپے فی کس..... صرف آدھ پاؤ چنوں کے دام..... مگر یہ بھی غنیمت تھا..... کچھ اور مانگتے تو شاید کلاشنکوف کی لمبی لمبی گولیاں کھاتے۔ بہرحال گاڑیاں روانہ ہوئیں اور چھ گھنٹے کے دشوار گزار اور صبر آزما سفر کے بعد یہ لوگ کراچی پہنچ ہی گئے..... امدادی کیمپ میں۔

حالیہ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی لہو رنگ سچی کہانیاں

(جی ای ای اے.....؟)

''کراچی بھی سندھ کا حصہ ہے..... کسی کے باپ کا اجارہ نہیں..... اگر باہر والے زیادہ ہیں تو کیا ہوا؟ ہے تو تمہارا ہی شہر..... بابا قائداعظم کا شہر..... تمہارے بزرگوں کی جاگیر..... ابھی تم ادھر کو جاؤ..... وہ دیکھو..... گاڑیاں کھڑی ہیں..... میں بھی آ جاؤں گا۔ پوری پارٹی آئے گی تمہاری خدمت کو..... سر ہائی وے پر تمہارے لیے تنبو لگا دیے گئے ہیں..... سب کچھ ملے گا ادھر ہی..... روٹی پانی، بستر..... تکیے، چادریں..... بس اب تم جاؤ..... جلدی جلدی بیٹھو..... کہیں دوبارہ بارش نہ ہو جائے۔''

www.urdukorner.com

کڑھی ہوئی اور شیشے جڑی محراب دار ٹوپی سر پر رکھے اور بوسکی کی قیمتی شلوار زیب تن کیے ہوئے وہ ادھیڑ عمر، چھوٹی چھوٹی داڑھی والا، قدرے بھاری بھرکم اور دراز قامت شخص شیر کی مانند گرج رہا تھا۔ اس کی شاندار پراڈو جیپ پہاڑی ٹیلے پر کھڑی تھی جبکہ چار عدد کھٹارا سی بسیں سیلاب زدگان کو کراچی لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس شخص کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے آٹھ عدد مسلح محافظوں نے حصار قائم کر رکھا تھا۔ اس کے سامنے تقریباً 500 افراد کھڑے، سر جھکائے اس کا خطاب سن رہے تھے...... 500 نفوس...... عورت، مرد، بوڑھے، بچے، جوان اور ادھیڑ عمر...... مگر زیادہ تر غربت و افلاس کی تصویر...... کسی مرد کے بدن پر صرف شلوار تھی تو کوئی بنیان اور نیکر میں ملبوس...... کچھ عورتیں پھٹے پرانے گھیر دار قمیض شلوار کے سوراخوں میں جھانکتے ہوئے بدن کے کچھ حصوں کو بوسیدہ اوڑھنی سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی تو کچھ چادروں سے بھی محروم۔

یہ سب لوگ تقریباً ایک ہفتے سے گاؤں میں زمین کے ایک نیم خشک حصے پر پناہ گزین تھے۔ ایک تو وہ تقریباً سب کے سب غریب اور دوسرے شدید سیلاب ان کا سب کچھ بہا کر لے گیا تھا...... گھر، بار، بستر، چادر، برتن، بھانڈے، مال مویشی اور ان میں سے تیس چالیس مرد و زن کو بھی مگر "مردے" ان کا مسئلہ نہیں تھے۔ بھوک...... پیاس...... پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان...... یہ تھے ان کے مسائل اور ان کا حل۔ خالی پیٹ روٹی مانگ رہا تھا...... کھلے آسمان تلے انہیں کسی چھپر کی ضرورت تھی...... کمر کے نیچے چٹائی اور سر کو آرام دینے کے لیے تکیہ...... کچے گھر اور جھگیاں تو سیلاب کے شدید ریلے میں بہہ چکی تھیں۔ نیم پختہ مکانات کے صرف آثار باقی تھے۔ باقی تمام گھر سات آٹھ فٹ پانی میں غرق تھے...... وہ پانی جو شدت کے ساتھ حفاظتی بندوں کو توڑتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کی لہریں گاؤں والوں کا سب کچھ سمیٹ کر سندھو ندی کی طرف چل دیں جبکہ باقی ماندہ ڈھیٹ بنا کھڑا ہوا تھا۔ گاؤں کے زندہ لیکن مُردوں سے بدتر مکین کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔ اب ان کا نمائندہ...... ان کا راہنما...... سرکاری جماعت کا رکن صوبائی اسمبلی دو عدد بڑی بڑی کشتیاں لیے ان کی مدد کو آن پہنچا تھا...... مگر انہیں یہاں جمانے کے لیے نہیں مل کر "اکھاڑ" کر کراچی بھیجنے کے لیے۔ اس کی دس نشستوں والی جیپ تو پہاڑی ٹیلے پر کچھ اس طرح باآسانی چڑھ گئی تھی جیسے امریکہ کی کسی شاندار فراخ شاہراہ یا پھر پاکستان کی موٹروے پر سفر کر رہی ہو۔ اب وہ ان بے کسوں کے درمیان کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ اسے اپنی بلند بانگ آواز کو پھیلانے کے لیے کسی آلۂ مکبر الصوت کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے کشتیوں کے ذریعے سیلاب زدگان کو بسوں میں جانے کا حکم دیا۔ تین چار پھیروں میں یہ لوگ بسوں تک پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ راہنما بھی کسی پرپیچ راستے سے اپنی اچھلتی کودتی گاڑی دوڑاتا ان تک آ گیا۔

وہ بے کس و بے آسرا لوگ بسوں میں عملاً ٹھنسے ہوئے تھے۔ تین کی جگہ چار اور دو نشستوں والے پھٹے پر تین تین بندے بیٹھے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگ کھڑے کھڑے سفر کرنے پر مجبور تھے۔ ان میں سے کچھ افراد کے پاس بچے کھچے سامان کی پوٹلیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں کے پاس خورد و نوش کے لیے کچھ نہ تھا۔ چند بے کسوں نے جب اس راہنما سے روٹی، پانی کی درخواست کی تو اس نے فی کس کے حساب سے دو دو ہزار روپے انہیں دیتے ہوئے کہا:

"راستے میں سے کچھ کھا لینا...... پانی بھی کسی ٹیوب ویل یا کنویں سے مل جائے گا۔"

مگر 125 افراد...... ہر بس میں...... اور روپے؟ محض دو ہزار...... یعنی 15 روپے فی کس...... صرف آدھ پاؤ چنوں کے دام...... مگر یہ بھی غنیمت تھا...... کچھ اور مانگتے تو شاید کلاشنکوف کی لمبی لمبی گولیاں کھاتے۔ بہرحال گاڑیاں روانہ ہوئیں اور چھ گھنٹے کے دشوار گزار اور صبر آزما سفر کے بعد یہ لوگ کراچی پہنچ ہی گئے...... امدادی کیمپ میں۔

مگر اپنے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد یہ دیکھ کر ان کے دل دھک سے رہ گئے کہ پتھریلی زمین پر صرف پچیس، تیس پھٹی پرانی چھولداریاں نصب تھیں۔ کم از کم ساٹھ، ستر برس پہلے، شاید انگریز بہادر کے پاکستان سے دفع ہوتے وقت انہیں اسی میدان میں چھوڑ گئے تھے۔ دو چار بڑے بڑے شامیانے بھی نصب کیے گئے تھے لیکن وہ اس قدر بوسیدہ تھے کہ ان کے اوپری حصہ یعنی "چھت" کے سوراخوں میں سے ریتلی ہوا اور دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس سرکاری یا عوامی پڑاؤ میں ان کا استقبال کرنے والا بھی کوئی نہ تھا...... کوئی والی وارث نہیں...... کوئی ہم دم نہ غمگسار...... قریب ترین شہری آبادی بھی "کیمپ" سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ان کے لیے اشیائے خورد و نوش اور ادویات تو کجا دری، چادروں اور تکیوں کا انتظام تک نہ کیا گیا تھا...... ان لوگوں نے نہایت دشواری، اذیت، بھوک، پیاس اور چلچلاتی دھوپ اور گرد آلود ہواؤں کے جھکڑ میں پورا ایک دن...... اذیت ناک چوبیس گھنٹے گزارے۔

پھر خدا جانے کس طرح ایک فلاحی اور رفاہی جماعت کے ذمہ داروں تک ان کی حالت زار کی خبر پہنچ گئی۔ دینی اصولوں پر خدمت الناس کرنے والی یہ تنظیم امریکہ کی مردود اور "سرکار ولایتا" کی معتوب ہے۔ اس جماعت کے عہدیداران اور کارکنوں نے ان بے کسوں کے لیے ہر سہولت بہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ کھانا، صاف پانی، لباس، دوا، علاج، بستر، تکیے، برتن، بھانڈے، حتیٰ کہ زیرِ تعلیم بچوں کے لیے پڑھائی کا بندوبست بھی۔ کامل تین ماہ تک یہ افلاس زدہ سیلاب کے مارے اس جماعت کے سایہ عاطفت میں رہ کر اس کا کلمہ پڑھتے رہے مگر ان کی "پارٹی" کے کسی عہدیدار تو کجا کارکن نے بھی ان کی خبر نہ لی۔ اس دوران ان کی گوٹھ میں سیلابی پانی اتر چکا تھا اور اب ان کو اپنے علاقے کی یاد ستا رہی تھی۔ جب ایسی خواہش کرنے والوں کی خاصی تعداد ہو گئی تو اس تنظیم کے کارکنوں نے انہیں ان کے گاؤں تک پہنچانے کے لیے شاندار اور آرام دہ، ایئرکنڈیشنڈ کوچز کا بندوبست کیا۔ جب یہ کارواں روانہ ہونے لگا تو زادِ راہ کے علاوہ ضروریات پوری کرنے کے لیے ان میں 2 ہزار روپے فی خاندان نقد بھی تقسیم کیے گئے۔ پھر ان کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا گیا مگر...... مگر بسوں کے روانہ ہونے سے پہلے ایک سیلاب زدہ نے کسی مرحوم لیڈر کا نام لے کر نعرہ بلند کیا: "جی ای ای اے......؟ قافلے والوں نے اس کا فلک شگاف جواب دیا: "سداااا جئے" اور پھر یہ "غریب اور بے کس لوگ" جماعت والوں کو منہ چڑاتے اور ٹھلے، دکھاتے ہوئے چل دیئے۔ آخر انہیں رہنا تو اپنے گاؤں ہی تھا ناں؟

عارضی ہسپتال

گاؤں کا زیادہ تر حصہ تو کئی کئی فٹ گہرے سیلاب میں ڈوبا ہوا مگر کچھ نسبتاً خشک قطعات ہی سیلاب زدگان پناہ گزین کے تھے۔ ایک ٹیلے پر

www.urdukorner.com

سیلاب زدگان کے لیے عارضی ہسپتال قائم کر دیا گیا تھا۔ مضبوط خیمے اور چھول داریاں، ادویات کا وافر انتظام، مریضوں کے لیے بستر، چادریں، تکیے اور چارپائیاں۔ ڈاکٹر اور نرسیں بڑی تندہی کے ساتھ ان کے علاج اور تیمارداری میں مصروف تھے۔ اس وقت صوبے کے وزیراعلیٰ، چند وزراء، اعلیٰ افسران اور سرکاری جماعت کے عہدیداران ہسپتال کا دورہ کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مریضوں کے چہروں پر پژمردگی اور بیماری کے نہیں بلکہ سکون اور تروتازگی کے آثار تھے۔ مریضوں کی تعداد 40 یا 42 کے قریب تھی۔ وزیراعلیٰ صاحب نے چند مریضوں کی عیادت کی۔ ان کے طبی کوائف ملاحظہ کیے۔ تشخیص دیکھی۔ پھر ہر مریض کو نقد رقوم کے لفافے تقسیم کیے۔ اس مقام سے کچھ فاصلے پر واقع ایک دوسرے ٹیلے پر سینکڑوں کی تعداد میں مرد و خواتین، بوڑھے، بچے اور جوان سیلاب زدگان بھی کھڑے تھے۔ بس کس و بے آسرا۔ وہ چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہیں موجود پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کے اہلکار لاٹھی، ڈنڈے اور اسلحہ دکھا کر انہیں خاموش کرا دیتے۔ چند بے کسوں نے پانی میں اُتر کر صاحب بہادر اور افسران ذی شان تک پہنچنے کی کوشش کی تو ان پر ڈنڈے برسا کر واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ وزیراعلیٰ اور دیگر ذمہ داران کم و بیش ایک گھنٹے تک یہاں کا دورہ کرنے کے بعد پانی کے اس پار چلے گئے۔ افسران ذی شان نے بھی اپنی اپنی دخانی کشتیوں میں قدم رکھا اور پھرتی ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی عارضی ہسپتال میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ تمام مریض اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ تمام سامان سمیٹا، جھول داریاں اور شامیانے اکھاڑ کر تہہ کیے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

''ڈاکٹر'' اور ''نرسیں'' بھی اپنی اوقات میں آ گئیں۔ ''ڈاکٹروں'' میں سے کچھ پٹواری تھے اور چند محکمہ انہار کے کلرک۔ نرسیں...... رہیں ''نرسیں'' تو وہ بھی بس اینویں ہی تھیں۔ جعلی...... اکا دکا محکمہ منصوبہ بندی کی ''بندی'' اور کوئی ''پارٹی'' کی کارکن۔ روپیہ پیسہ کھیسے میں ڈالا اور سامان کو قبضے میں کر کے یہ لوگ بھاگ نکلے۔ ''ہسپتال'' کا خاتمہ ہوتے ہی وہاں پھر وہی خالی زمین باقی رہ گئی۔ خشک...... پتھریلی...... بے آب و گیاہ......

اصل حقدار پانی کے اس پار کھڑے شور مچاتے اور پولیس کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ کچھ دیر بعد تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔ اب ان کے پاس کیا بچا تھا...... بھوک...... ننگ...... ''اپنوں'' کی بے نیازی بلکہ سنگ دلی کے سوا؟

ماں

شہزادی کو بس اتنا یاد تھا کہ گاؤں میں جب شدید سیلابی ریلا داخل ہوا تو وہ اگلے روز کے لیے سائنس کے آزمائشی امتحان سے متعلق چند سوالات کے جواب یاد کر رہی تھی۔ اس کا گاؤں؟...... گاؤں نہیں بلکہ ایک بڑا قصبہ تھا جسے چھوٹا سا شہر کہا جا سکتا تھا۔ یہاں زندگی کی تمام بنیادی سہولیات موجود تھیں۔ شدید بارشوں کے باوجود بھی قصبے میں بہت کم نقصان ہوا تھا۔ جانی اور مالی دونوں...... نہ ہونے کے برابر۔ زیادہ تر مکان پختہ تھے جبکہ سڑکیں اور گلیاں بھی کچی نہ تھیں لیکن قصبے کی بدنصیبی یہ تھی کہ یہاں سے منتخب ارکان قومی و صوبائی اسمبلی سرکاری پارٹی کے ارکان یا عہدیداران نہ تھے۔ دونوں شریف اور عوام کے خدمت گزار۔ اس لیے وہ ان بدمعاشوں کا مقابلہ نہ کر سکے جنہوں نے راتوں رات بلکہ شام ہوتے ہی نہ معلوم کس وقت اپنی زمی[illegible]

بند تڑوا کر سیلابی ریلے کا رُخ شہزادی کی بستی کی طرف پھیر دیا۔ شہزادی کا پختہ اور خوبصورت مکان نہر کے کنارے واقع تھا لہٰذا سیلاب کے پہلے ہی ہلے میں اس کا مکان غرقاب ہو گیا۔ پھر اسے یہ خبر نہ ہو سکی کہ اس کا گھر کس طرح گرا؟

اس کے بابا، ماں اور دونوں بھائی کہاں گئے؟ اس گائے کا کیا بنا جسے وہ اپنے ہاتھوں سے چارہ کھلایا کرتی تھی؟ اس کی کتابیں...... بستہ...... قلم...... پنسل؟...... دلکش سکول یونیفارم...... عام استعمال کا لباس...... سب غائب۔ خدا جانے وہ خود زندہ کس طرح بچی؟...... سیلابی لہریں اس کے لیے کشتی کیوں کر بن گئیں جنہوں نے اسے نہر کنارے لا پھینکا؟...... اب تو اس کے سر پر دوپٹہ بھی نہ تھا...... بس وہ تو صرف دو کپڑوں میں ملبوس تھی...... پانی میں بھیگی، ڈوبی...... تین دن کی بھوکی پیاسی...... اس کا دماغ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے چاروں طرف مُردہ مرد و زن اور مویشیوں کی لاشیں تھیں...... صرف لاشیں...... اگر کوئی زندہ وجود تھا تو صرف وہ خود تھی۔

بارہ سالہ شہزادی بنت اکبر چانڈیو گوٹھ انٹر پور کی رہائشی تھی۔ باپ ایک پڑھا لکھا کسان جو اسے بھی زیور تعلیم سے آراستہ کر رہا تھا۔ انٹر پور میں تعلیم کا عام رواج تھا کہ وہاں کے لوگ دورِ جدید کے تقاضوں سے آشنا تھے۔ شہزادی ایک اچھے سکول میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ایک شب اس کا پورا گاؤں بہہ گیا۔ سیلابی ریلا سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اس کی زندگی باقی تھی اس لیے وہ بچ گئی۔ اب نہر کے کنارے پڑی ہوئی کسی غیبی امداد کی منتظر تھی۔

اب ایک سامنے سے دو [illegible] آتے دکھائی دیے۔ ایک تقریباً بوڑھا اور دوسرا جوان مگر دونوں باریش...... ٹخنوں سے اونچی سفید شلواروں والے...... سر پر عربی رومال باندھے...... شہزادی ان لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گئی اور اپنے ہاتھوں سے سینہ چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر بوڑھے نے اپنے سر کا بڑا سا رومال اسے دیا اور شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شہزادی نے خود کو اس رومال سے چھپا لیا۔ بوڑھے نے اسے بتایا کہ وہ ایک رفاہی تنظیم کا نمائندہ ہے اور اسے امدادی کیمپ میں پہنچا دے گا۔ دلکش اور بھرے بھرے بدن والی شہزادی کسی سحرزدہ کی طرح بغیر کچھ کہے ان کے ساتھ چل پڑی۔ کچھ فاصلے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ شہزادی کو اس میں سوار کر کے مولوی نما یہ دونوں افراد نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ شہزادی پر دوبارہ غشی طاری ہوئی اور اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اس بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر پڑا پایا۔ دونوں ''مولوی'' اس کے قریب کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک بھاری بھرکم، بوڑھی لیکن سرخی پاؤڈر میں لتی پتی عورت تھی۔ بوڑھا درویش، رفاہی کارکن کہہ رہا تھا:

''چھما بائی! ایک لاکھ سے کم میں یہ سودا نہیں ہوگا...... دیکھو!...... کیسا گورا گورا مال ہے۔ ایک لاکھ روپے تو اس کی صرف ایک رات کی قیمت ہے۔''

''او جی ٹھیک!...... بالکل ٹھیک!......'' بوڑھی نے قہقہہ لگا کر کہا اور شہزادی کا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا...... اب وہ اتنی بچی بھی نہ تھی کہ یہ بات سمجھ نہ سکتی کہ آئندہ زندگی میں تاریکیاں ہی اس کا مقدر ہوں گی۔

www.urdukorner.com

نجات

شمع خالد

عامر رات بھر جاگ کر منے کو دیکھتے اور وہ سو جاتے تو میں جاگ کر دیکھتی۔ اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں باپ جیسی تھیں اور ہونٹ ٹھوڑی بالکل میرے جیسی۔ آپا کہتیں، عمار بہت عقل مند ہے اس نے ماں اور باپ دونوں جیسے نقش لیے ہیں تا کہ یہ دونوں خوش رہیں۔

والدین کا افسانہ۔ انکے معصوم بچے نے انہیں نجات کا راستہ فراہم کردیا

کتاب پڑھتے پڑھتے میں نے کروٹ بدلی اور پیٹ کے بل لیٹ کر کتاب کو زمین پر رکھ کر پڑھنا شروع کیا، اور مجھے یاد آیا کہ ابو کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکی اپنی نظر کا ستیاناس کر دے گی۔ جتنی ڈانٹ مجھے اس انداز پر پڑھنے پر کھانی پڑتی اتنا ہی مطالعہ کا انداز بھانے لگا، اور کسی چیز کے پڑھنے کا مزہ ہی نہ آتا۔ جب تک میں اس طرح لیٹ کر نہ پڑھا کرتی۔ ابو کے بار بار ڈانٹنے پر میں انہیں یہی کہا کرتی تھی، ابو مجھے اسی طرح پڑھنے سے سبق یاد ہوتا ہے اور وہ منہ میں بڑبڑا کر چپ ہو جایا کرتے۔ اب

شادی کے بعد پڑھائی وغیرہ تو کیا ہوتی، کوئی مزیدار کہانی پڑھتے ہوئے میں بے خیالی میں اپنے انداز سے لیٹ جاتی۔ ابھی میں نے آدھا صفحہ ہی پڑھا تھا کہ آپا کی چیخ سنائی دی۔ ارے یہ کیا کر رہی ہو۔ جانے ان کی آواز میں کیا تھا کہ میں اچھل پڑی اور ساتھ ہی پیٹ میں اتنے زور سے بل پڑا کہ بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اگر آپی جلدی سے آگے بڑھ کر سنبھال نہ لیتیں تو میں شاید گر جاتی۔ مجھے سنبھالتے ہوئے انہوں نے جھاڑتے ہوئے کہا: اب تم یہ لڑکیوں والی حرکتیں چھوڑ دو۔ اب تم ایک ذمہ دار عورت ہو اور یہی نہیں اس وجود کا دھیان رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ جانتی ہو اس طرح پیٹ کے بل لیٹنے سے اس کا سر چپٹا ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی میں خوفزدہ ہو گئی...... بھلا ایک ماں کیسے چاہے گی کہ اس کا بچہ Deframed ہو۔

یوں ایک سے دو وجود ہونے کی وجہ کے احساس نے جہاں مجھے جینے کے نئے انداز سکھائے وہیں میرے اڑوس پڑوس...... سسرال میکے میں گفتگو کا محور بھی صرف میں ہی بن کر رہ گئی۔ یہ کرو! یہ نہ کرو!...... صبح آنکھ کھلتے ہی آپا دودھ کا پیالہ لیے سرہانے کھڑی ہوتیں۔ دودھ دیکھتے ہی مجھے ابکائیاں سی آنے لگتیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ دودھ پینے سے بچے کا رنگ دودھ جیسا ہوگا میں آنکھیں بند کر کے پیالہ تھام لیتی...... کبھی کبھی تو مجھے اس بچے پر غصہ آنے لگتا...... جس کی فکر ہر شخص کو دامن گیر تھی...... اور میں سوچتی میری پسند ناپسند سب اس کی وجہ سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر شخص میرے وجود کی نفی کر کے ایک ان دیکھے وجود کو اہمیت دیئے جا رہا ہے۔ میرا وجود میری ذات صرف اس لیے اہم تھی کہ ایک ننھا وجود میرے اندر کلبلا رہا تھا۔ عامر کو مجھ سے زیادہ اس وجود کی فکر تھی اور میری حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔

جانے اپنے وجود کی نفی ہونے کی بغاوت کا اثر تھا یا قدرت نے میری ناشکری کو ناپسند فرمایا کہ میں خون کے دریا میں ڈوبتی چلی گئی۔ جانے کب تک ہوش اور بیہوشی کی صلیب پر لٹکتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو مجھے اپنا آپ خالی سا لگا۔

سب کے مرجھائے چہروں پر میرے لیے ہمدردیاں ہی ہمدردیاں تھیں۔ عامر نے جب میرے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے تسلی دینی چاہی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں جو ممتا کے جذبے سے ناآشنا تھی جانے ایک لمحہ میں کیسے ممتا سے بھر گئی اور میں نے سسکتے ہوئے کہا مجھے میرا بچہ تو دکھا دو۔ نرس نے جب ایک ٹرے میرے سامنے کی تو جمے ہوئے جیلی جیسے خون میں وہ پلاسٹک کے گڈے جیسا سو رہا تھا۔ اس طرح سرخ جیلی میں وہ سفید ننھا وجود یوں فٹ تھا جیسے سرخ بیک گراؤنڈ میں لگے پلاسٹک آف پیرس کا بُت۔ جسے دیکھتے ہی میرے سینے میں سنسناہٹ سی ہو گئی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ د، دن ہسپتال میں رہنے کے بعد جب میں اپنے بیڈ روم میں آئی تو وہ بھی مجھے اپنے پیٹ کی طرح خالی خالی لگا۔ عامر نے میرے کمرے سے تمام تصویریں جو آپی نے مختلف کیلنڈروں سے کاٹ کر لگائی تھیں، ہٹا دیں۔ وہ مجھے جب پیار سے ہمدردی سے سینے سے لگاتے تو میں سسک اُٹھتی اور کہتی، عامر خدا نے مجھے میرے ناشکرے پن کی سزا دی ہے۔ اگر میں اپنی ذات کو ثانوی سمجھتی تو خدا مجھ سے یہ نعمت نہ چھینتا۔ عامر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتے...... پگلی گھبراؤ نہیں۔ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ ان کی یہ بات سن کر میرے ہونٹوں پر ایک شرمساری

www.urdukorner.com

سے بھری مسکراہٹ آ گئی اور میں نے کہا ”ہم بھی خوب ہیں۔ اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں اور جب وہ ہمارے اعمال کے نتیجے میں انہیں واپس لے لیتا ہے تو ہم اپنی کوتاہیوں کو بھول کر یہ بھی اس کے سر ڈال دیتے ہیں کہ اس کی رضا یہی تھی یا ہماری قسمت ہی خراب۔“

میری بات کے جواب میں عامر نے مجھے دوائی کا چمچہ پلایا اور میں نیند کے، دھندلکوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

دن مہینوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ شادی کی سالگرہ پر جہاں لوگ مجھے مبارکباد دیتے وہیں میری خالی کوکھ کے لیے ہمدردی کرتے تو میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی۔

میری پور پور ماماتا کے جذبے میں ڈوب چکی تھی۔ میں جو پہلی دفعہ یہ سوچتی کہ ابھی تو میرے گھومنے پھرنے اور عامر سے پیار کرنے کے دن تھے، یہ مصیبت کیوں گلے میں آن پڑی۔ اب عامر کے قریب جاتی تو ایک بچے کی خواہش لے کر۔

ڈاکٹر، تعویذ، مزار میں بھکارنوں کی طرح بچے کے لیے جھولی پھیلاتی۔

بڑی بوڑھیاں کہتیں، ارے! ابھی تم دونوں جوان جہان ہو۔ اللہ کبھی نہ کبھی رحمت کرے گا۔ تو مجھے اپنا انگ انگ صرف اور صرف ایک چیز کا تمنائی نظر آتا کہ کب یہ سوکھی شاخ ہری ہو۔ کب یہ خالی کوکھ بھر جائے۔

میں کرسی پر بیٹھی خالی الذہن سامنے لگی تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ مجھے لگا جیسے میری چھاتیوں سے گرم گرم دودھ کی پھوار نکلی ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب دیکھا تو قمیض بھیگ چکی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ شاید بچے کی تصویر دیکھ کر میری آنکھوں کے ساتھ ساتھ چھاتیاں بھی چھلک پڑی ہیں۔ وہ بھی تو ان ننھے منے لبوں کو ترس رہی ہیں کہ آپی نے غور سے میری قمیض کو دیکھا اور مجھے سینے سے لگا لیا اور میرا منہ چومتے ہوئے سرگوشی کی کہ تُو ماں بننے والی ہے۔

ڈاکٹر نے جب چیک اپ کے وقت بتایا کہ مجھے پانچواں مہینہ ہے تو میں خوشی اور حیرانی سے ڈاکٹر کو تکنے لگی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس دولت سے مالا مال ہوں اور مجھے ہی نہیں پتہ چلا۔ آج بھی میری چھاتیاں یہ راز نہ اُگلتیں تو مجھے کیسے پتہ چلتا۔

تب پہلی مرتبہ میرے وجود میں اس کی کلبلاہٹ محسوس ہوئی اور یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ یہ پانچ مہینے میں کیسے گزارتی کہ اس سے پہلے چوتھے مہینے کے آخر میں یہ حادثہ ہوا تھا۔ یہ چار مہینے میں کیسے گزارتی۔

ڈاکٹر صاحبہ نے جب مجھے کہا کہ ہر ہفتے چیک اپ کے لیے آنا ضروری ہے اور جب آپا نے ڈاکٹر کو سو کا نوٹ دیا تو میں نے سوچا۔ آخر ہر ہفتے یہ لال نوٹ کہاں سے آئے گا۔ عامر نے سنا تو کہنے لگے میں اوور ٹائم لگا لیا کروں گا۔ تمہارے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

نعمت چھن جانے کے بعد جب دوبارہ ملے تو انسان اس کی قدر میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ میں پہلے ماماتا کے جذبے سے ناآشنا تھی لیکن اب ماں بننے کے لیے ایک ایک لمحہ کو خوشی خوشی بسر کر رہی تھی۔ جب وہ میرے پیٹ میں کلبلاتا تو میرا جی چاہتا سب کو پتہ چلے۔ پیٹ کو اپنی پوروں سے چھو کر اسے محسوس کرتی اور سوچتی جانے وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ جانے اس کی صورت کیسی ہو گی اور مجھے ہنسی بھی آتی ہے۔ وہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ چوس کر میرے پیٹ میں پل رہا تھا لیکن میں نہ تو اس کی صورت سے شناسا تھی اور نہ یہ جانتی تھی کہ وہ لڑکا

ہے یا لڑکی۔ بس جانتی تھی تو یہ کہ وہ پورے کا پورا میرا ہو گا۔

ساتویں مہینے جب میرا کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا اور دل متلانے لگتا تو آپا کہتیں کہ بچے کے بال جب معدے کو چبھتے ہیں تو دل متلانے لگتا ہے۔ ان کی اس جاہلانہ بات پر میں پوری طرح یقین کر لیتی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ننھی سی جان تو ایک جھلی میں بند ہے۔ آپا جب مجھے اس برہمن کا ذکر سناتیں تو میں ہنستی بھی نہیں کہ میں اس دفعہ بھی کفرانِ نعمت یا ناشکری کے ہاتھوں اسے گنوا نہ بیٹھوں۔ آپی نے جب پہلی بار مجھے کہا تھا کہ جو کھانے کو جی چاہے ضرور کھانا کہ یہ تم نہیں وہ آنے والا وجود مانگتا ہے کہ ایک برہمن زادی نے جب کسی چمار کے ہاں گوشت پکتے سونگھا اور اس کا کھانے کو جی چاہا تو اس نے مانگ کر کھا لیا۔

جب شوہر کو پتہ چلا اس نے بیوی کو بھرشٹ ہونے کے کارن قتل کر دیا لیکن جب پیٹ سے بچہ برآمد ہوا تو گوشت کی بوٹی بچے کے منہ میں دیکھ کر وہ برہمن پچھتایا کہ یہ غلطی بیوی کی نہیں بلکہ اس بچے کی تھی جس نے گوشت کھانے کی خواہش کی اور ماں نے یہ خواہش پوری کی تو میں نے قتل کر دیا۔ لہٰذا بی بی جس چیز کو جی چاہے ضرور کھانا کہ یہ تمہارے لیے ہی ضروری نہیں بچے کے لیے بھی ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے جب پچھلی مرتبہ آپا نے یہ واقعہ سنایا تھا تو میں گھنٹوں ہنسا کرتی تھی لیکن اس بار میرا کسی چیز کو کھانے کو جی چاہتا تو بھوک نہ ہونے کے باوجود میں وہ چیز اس لیے کھا لیتی کہ میرے بچے کا دل چاہ رہا ہو گا۔ نویں مہینے کے شروع میں آپا رات کو کبھی کیسٹر آئل پینے کو دیتیں اور کبھی گرم دودھ میں اصلی گھی ڈال کر۔ اور میں خاموشی سے پی لیتی۔ جوں [illegible]

ہوتی جا رہی تھی۔ آپا نے گھر میں ایسے رسائل اور ایسے لوگوں کا داخلہ بند کر دیا تھا جن رسائل میں Deframed بچوں کی تصاویر ہوتیں یا جن گھروں میں کوئی بچہ ابنارمل ہوتا۔ آپا ان عورتوں سے بھی مجھے بچاتیں جن کے بچے ضائع ہو چکے ہیں کہ کوئی سایہ نہ ہو جائے۔

اور آخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کے لیے میں نے اپنی ذات کو بھلا دیا تھا۔ کروٹ کے بل لیٹنا بھول گئی تھی۔ میرا کھانا پینا، سونا جاگنا صرف اور صرف یہ مقصد لیے ہوئے تھا کہ میں ایک نئی زندگی کو جنم دینے والی ہوں۔ میں نے جب آپا کو وہ سوٹ دکھائے جو بیٹے کی پیدائش پر میں نے انہیں اور عامر کی دوسری بہنوں کو دینے تھے۔ عامر کو جب پتہ چلا کہ زچگی کے خرچ کے لیے بھی میں نے کمیٹی ڈال کر پیسے جمع کیے ہیں تو وہ مسکرا اُٹھے۔ ہسپتال جاتے عامر بار بار میرا ہاتھ تھام لیتے۔ آپا سورتیں پڑھ پڑھ کر دم کرتی جاتیں۔ لیبر روم میں آپا نے قرآنی منقش پیالے میں بی بی فاطمہؓ کا پنجہ (ایک پودا جسے بی بی فاطمہؓ نے بچے کی پیدائش کے وقت پکڑا تھا) پانی میں ڈال دیا اور کہنے لگیں جب یہ پودا کھِل جائے گا تب تم ننھے وجود کو دنیا میں لے آؤ گی۔

میں درد کی صلیب پر لٹکی۔ ڈاکٹر اور آپا کا ہاتھ تھامے ان کی ہدایات پر عمل کرتی گئی کہ اگر ایسا نہ کیا تو ننھی جان کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ ڈاکٹر جب درد کی شدت میں ہونٹ بھینچ لینے کے لیے کہتی تو میں اپنے ہونٹ کاٹ لیتی اور سوچتی کیا اس درد سے بھی کوئی زیادہ درد ہو سکتا ہے۔ درد کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے جب میں بیہوش ہوئی جا رہی تھی تو ننھی منی رسیلی آوازوں نے مجھے درد کے سمندر سے نکال لیا۔ وہ سکھ کا لمحہ...... میرے لیے بہت

www.urdukorner.com

بڑی خوشخبری لایا۔ مبارک سلامت کے شور میں، میں سوگئی۔ خواب میں دو ننھے منے ہاتھ میری طرف بڑھتے رہے۔ چوبیں گھنٹوں کے بعد جب منے کو میں نے چھاتی سے دودھ پلانے کے لیے لگایا تو میری تڑپتی مامتا کو جیسے قرار مل گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دودھ بیٹھ کر پلایا کرنا۔ ننھے کو گود میں لیے جب میں گھر میں داخل ہوئی تو ذرے ذرے نے میرا سواگت کیا۔ ننھی منی چیخیں میرے سونے آنگن میں شہنائی کی طرح گونجنے لگیں۔ تار پر ننھے منے فراک اور نیپکن دیکھ کر میرا رواں رواں ناچنے لگتا۔

دسواں نہلاتے ہوئے آپا نے مجھے سرخ جوڑا پہنایا۔ باداموں اور گھی والا دودھ پلایا جس میں ہلدی اور اجوائن ڈالی گئی تھی اور منے کو میری گود میں ڈالا۔ منے کو دودھ پلانے لگی کہ مجھے لگا جیسے اس کا رنگ نیلا ہوتا جا رہا ہے۔ نجانے میں کب تک چیختی رہی ٹیکسی میں ہسپتال پہنچنے تک میرے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد منے کو آکسیجن لگا دی۔ میں اور عامر پاگلوں کی طرح ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ منے کا رنگ بدلنے لگا۔ اسے نارمل ہوتے دیکھ کر میری چھاتی سے دودھ کی پھواریں بہنے لگیں۔ اس نے اپنے ننھے منے ہونٹوں سے جب مجھے تھاما تو مجھے لگا جیسے میرا وجود ہلکا پھلکا ہوتا جا رہا ہے۔ بچے کی ای۔سی۔جی بلڈ ٹیسٹ اور جانے کتنے ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ بچے کا دل دائیں سائیڈ پر ہے اور ہمیں ہر وقت اس کا دھیان رکھنا ہے کہ اس کی آرٹلری vane دب جانے کے باعث اس کا جسم نیلا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ میرا دل بھی دائیں سائیڈ پر ہے لہٰذا یہ گھبرانے والی بات نہیں۔ ہاں خون جسم کو نہ سپلائی ہونا خطرناک ہے لیکن بچے کی مناسب نگہداشت اور مستقل چیک اپ رہنا چاہیے۔

شروع میں ہی اس صدمے نے ہمیں ماؤف کر دیا۔ میں اور عامر پہروں خوفزدہ عمار کو دیکھتے کہ (یہ نام دادی اماں نے رکھا تھا) اب آہستہ آہستہ مجھے دوائیوں، ڈاکٹرں کے نام ازبر ہو گئے۔ عامر کو میں نے کتنی دفعہ کہا کہ وہ دفتر چلے جائیں لیکن وہ عمار کو ایک لمحہ نہ چھوڑتے۔ ذرا رنگ نیلا ہونے لگتا اور ہم اسے ہسپتال لیے پہنچ جاتے اور آکسیجن لگتے ہی اس کا رنگ پلٹ آتا۔ عامر کو مسلسل نوکری سے غیر حاضری کے بعد جواب مل گیا لیکن جانے وہ اتنا پیسہ کہاں سے لاتے کہ شہر بھر کے ڈاکٹروں کے نسخے اور نمبر ہمارے گھر جمع ہوتے گئے۔ چھلہ نہانے پر میری نندوں نے وہی جوڑے پہنے جو میں نے بیٹے کی خوشی میں بنوائے تھے۔ عمار کو سرخ ستاروں پر ٹوپی اور سرخ فراک پہنایا تو میرا منا دولہا لگنے لگا۔ نظر اُتارنے کے لیے میں نے کالا تلک اس کے کان کے پیچھے لگا دیا۔

ایکسرے، ای۔ سی۔ جی، الٹرا سونک تمام مشینوں کے نام مجھے یاد ہوتے چلے گئے۔ عامر رات بھر جاگ کر منے کو دیکھتے اور وہ سو جاتے تو میں جاگ کر دیکھتی۔ اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں باپ جیسی تھیں اور ہونٹ تھوڑی بالکل میرے جیسی۔ آپا کہتیں، عمار بہت عقل مند ہے اس نے ماں اور باپ دونوں جیسے نقش لیے ہیں تاکہ یہ دونوں خوش رہیں۔

اس دن صبح سے ہی میری طبیعت اداس تھی۔ جانے میں بدحواس کیوں ہو رہی تھی۔ آج میرا منا دو ماہ اور دس دن کا ہو چکا تھا۔ پھر میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ عامر نے نہاتے ہوئے دوبارہ نل بند کر کے پوچھا۔ منا رو تو نہیں رہا اور آخر تولیہ لپیٹے باہر نکل آئے اور کہنے لگے [illegible]

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

دل مطمئن رہتا ہے ورنہ ایک پل کے لیے ادھر ادھر ہو جاؤں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ میں کہنا چاہ رہی تھی کہ کب تک گھر بیٹھے رہو گے۔ آخر گھر کا خرچہ، ڈاکٹر، لیکن یہ کیا منا ایک دم نیلا سا لگا۔ ہم دونوں اسے لیے ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر جو ہماری شکلوں سے آشنا تھا پہچان گیا۔ بغیر کچھ کہے سنے، منا ہم سے لیا اور مشینوں میں لے گئے۔ جلدی جلدی سے آکسیجن لگائی، اسے زور زور سے جھٹکتے رہے۔ اس کے ماتھے پر ٹیکے لگائے اور ماتھے پر ہی ڈرپ کی سوئی لگائی اور مجھے کہا کہ میں دیکھتی رہوں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے آکسیجن سلنڈر کو دیکھا۔ اس میں بنتے بلبلے میرے بچے کی زندگی کی نوید سناتے۔ قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے ماتھے کے راستے جاتا۔ مجھے یہ آس دلاتا کہ منا ٹھیک ہے۔ رات بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میری چھاتیاں دودھ سے پھٹنے لگیں۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کیا میں اسے دودھ پلا دوں۔ ڈاکٹر نے مجھے اور عمار کو دیکھ کر اجازت دے دی۔ اس کے ہونٹوں میں کچھ تھامنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے دبا کر قطرہ قطرہ اس کے ہونٹوں میں اُتارا اور پھر منے نے چند گھونٹ میرے وجود سے لے کر پیے۔ جب ڈاکٹر نے اسے دوبارہ مجھ سے الگ کر کے آکسیجن ماسک پہنایا تو اس کے ہونٹوں سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی بڑا آدمی درد سے کراہ رہا ہو۔ رات کے بعد دن نکلا۔ سورج کی کرنوں کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا شاید یہ سورج میرے لیے روشن ہوا ہو۔ شاید میرا منا ٹھیک ہو جائے اور پھر یہی سوچتے سوچتے مجھے اونگھ آ گئی۔ گھبرا کر دیکھا۔ آکسیجن میں بلبلے بن رہے تھے اور قطرہ قطرہ ڈرپ بھی جا رہا تھا۔ منے نے اب کراہنا بند کر دیا تھا۔ ساری رات جاگنے اور کراہنے کے بعد وہ سکون سے سو گیا تھا۔

اس کے چہرے پر اتنا سکون اتنی شانتی تھی کہ میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ایک نرس کہنے لگی ذرا بچے کو پیچھے کیجیے۔ دوسرے مریض کو ساتھ لٹا دوں۔ میں نے کہا نہیں، اسے ہلانا نہیں۔ وہ سو رہا ہے کہ پیچھے سے عامر کی چیخ سنائی دی۔ (He is gone) جانے اس کی آواز میں کتنا کرب تھا۔ ڈاکٹروں کی فوج ادھر چلی آئی۔ مجھے اور عامر کو باہر نکال دیا۔ دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا۔ وہ میرے بچے کا چہرہ ڈھانپ رہے تھے اور پھر اسے لیے ہم گھر آئے۔ اس کو نہلا دھلا کر جب لے کر چلے تو عورتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ بی بی تم نہا لو ورنہ تمہارا سایہ دوسری عورتوں پر پڑ جائے گا۔ میں نہانے کے لیے گئی تو دودھ بہہ بہہ کر میری قمیض بھگوتا رہا۔ نہانے کے بعد عورتوں نے میوہ میری گود میں ڈالا۔

دوسرے دن میں قبر پر گئی تو جانے اتنا دودھ کہاں سے آیا۔ دودھ کی ندیاں بہتی رہیں اور رات بھر فیڈنگ کپ سے اپنا دودھ نچوڑتی رہی۔

دوسرے روز جب میں سو کر اٹھی تو عامر کپڑے پہن کر تیار ہو رہے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلے۔ میں دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھے۔ پھر میری طرف واپس آئے اور مڑ کر کہنے لگے۔ جان اگر منا زندہ ہوتا تو میں ایسے تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا تھا؟ اگر میں گھر سے نہ نکلتا تو نئی نوکری کہاں سے ملتی۔ لوگوں کے قرض کیسے اترتے؟ منے نے جا کر ہمیں اس خوف سے نجات دلا دی کہ جانے اب کیا ہوگا۔ عامر یہ کہہ کر تیزی سے پلٹ گئے......اور میں سوچنے لگی، اچھا ہوا، جو منا چلا گیا۔ اب مجھے کوئی فکر، کوئی ڈر تو نہیں رہا۔ اب نجات ہی نجات ہے۔ شانت ہی شانت ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے تار پر پڑے منے کے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیئے۔

گمنام جینئس

خاور قیوم

ہمارے آس پاس بے شمار ایسے افراد موجود ہیں جو بے مثال صلاحیتوں کے باوجود گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ گمنام مؤجد کسی بھی طرح اپنے دیگر مشہور ہم عصروں سے کم تر نہیں بلکہ مناسب مارکیٹنگ نہ ہونے، وسائل اور سرمائے کی کمی اور دیگر کئی وجوہات کی بناء پر یہ لوگ خود کو دنیا کے سامنے منوا نہیں پاتے۔

لاجواب صلاحیتوں کے باوجود گمنام زندگی بسر کرنے والے جینئس

ہم زیادہ تر ان لوگوں کو یاد کرتے اور انکے مداح ہوتے ہیں جن کی ایجاد کردہ چیزوں نے براہ راست ہماری زندگیوں پر اثر ڈالا ہے اور ہمارے روزمرہ معمولات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ انٹرنیٹ کے مؤجد ونٹون سرن، فیس بک کے خالق مارک زُکر برگ اور پہلی ای میل ویب سائٹ ہاٹ میل کے مؤجد اور مائیکرو سافٹ کے بانی بل گیٹس جیسے لوگوں کے لیے ہر کسی کے دل میں بے انتہا احترام اور عزت ہے۔ اکثر لوگ خود ان جیسا بننا یا اپنے پیاروں کو ان جیسا بنانے کی خواہش دل میں بسائے رکھتے ہیں مگر ہم میں سے اکثر لوگ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ ایسے کامیاب اور ارب پتی لوگوں کے علاوہ بے شمار ایسے بھی ذہین اور باصلاحیت تخلیق کار ہیں جو اپنی حیثیت میں لاجواب ہیں مگر ساری عمر گمنامی کی زندگی گزار کر خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنی

www.urdukorner.com

ایجاد کردہ چیزوں سے ہمیں کسی نہ کسی طرح فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم انہیں وہ مقام اور عزت نہیں دے پاتے جس کے وہ حقدار ہیں اور انہی کے جیسے دوسرے موجد معاشرے میں اعلیٰ مقام اور کامیابیاں سمیٹ لیتے ہیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ گمنام موجد کسی بھی طرح اپنے دیگر مشہور ہم عصروں سے کم تر ہیں بلکہ مناسب مارکیٹنگ نہ ہونے، وسائل اور سرمائے کی کمی اور دیگر کئی وجوہات کی بناء پر یہ لوگ خود کو دنیا کے سامنے منوا نہیں پاتے۔ مثال کے طور پر جیک ژائیلکن نامی شخص کو ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے ان لوگوں پر ایک احسان عظیم کیا ہے جو کبھی پرانے ٹائپ رائٹرز پر ٹائپنگ کا کام انجام دے کر اپنی روزی روٹی کماتے تھے لیکن جدید کمپیوٹر کے آنے سے یہ لوگ بیروزگار ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ جیک ژائیلکن نے ان لوگوں کے لیے یو ایس بی USB ٹائپ رائٹر ایجاد کیا ہے جو کسی بھی کمپیوٹر سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ نئی ٹیکنالوجی سے نابلد لوگ اپنی پرانی روٹین کو برقرار رکھتے ہوئے روزگار کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اب یہ ٹائپ رائٹرز ان لوگوں کے لیے کمپیوٹر کی بورڈ بن گیا ہے اور وہ اس کی مدد سے ای میلز تحریر کرنے اور ہر طرح کی کمپوزنگ کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ یہ ایک زبردست ایجاد ہے اور ان بزرگ افراد کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں جو اس عمر میں کمپیوٹر چلانا نہیں سیکھ سکتے۔ لیکن اس ایجاد کا موجد جیک ژائیلکن اب بھی ایک گمنام اور عام حیثیت کا مالک شخص ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے اپنی مدد آپ کے تحت سائیکل کم ٹرالر کو آکس کریم مشین میں تبدیل کیا ہے اور یہ مشین رات کے اندھیرے میں دور سے چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سان فرانسسکو کے ایک گمنام گروپ نے اپنی مدد آپ کے تحت ایسا موسمی غبارہ "Weather Ballon" تیار کیا ہے جو 70 ہزار فٹ کی بلندی تک جا سکتا ہے اور یہ کس نے سوچا ہوگا کہ ایک خالی ٹینک کو موسیقی کے آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جی ہاں ایک خاتون ایسی ہے جس کے پاس نیورو سائنس کی ڈگری ہے لیکن وہ ایک خالی ٹینک کو موسیقی کے آلے کے طور پر استعمال کر کے میوزک ترتیب دیتی ہے۔

ایسے بے شمار لوگ ہمارے آس پاس موجود ہیں جو کبھی ہوا سے چلنے والی گاڑی بنا ڈالتے ہیں اور کبھی پانی سے چلنے والی موٹر سائیکل! جو کبھی سورج کی روشنی سے ایئر کنڈیشنر چلا دیتے ہیں اور کبھی اپنے ارادے کی پختگی سے بے کار چیزوں کی مدد سے ایسی حیرت انگیز مفید شے بنا ڈالتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ایسے باصلاحیت لوگوں کا ذکر ہمیں صرف دلچسپ و عجیب خبروں، ہیکر سپیس'' جیسی ویب سائٹس یا پھر اخبارات کے اندرونی صفحات پر ہی ملتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسے باصلاحیت لوگوں سے یہ دنیا بھری پڑی ہے جو اپنے گھروں کے تہہ خانوں، گیراجوں، باورچی خانوں یا بیڈ رومز کو ہی اپنی ورکشاپس بنائے دن رات اپنے جنون میں مگن ہیں۔ یہ میرے اور آپ کے جیسے عام لوگ ہیں لیکن ان کی تخلیقات عام نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے بظاہر کھلونا نما نظر آنے والی ان کی معمولی ایجادات ایک روز دنیا کو ہلا دیں اور حیران کن پذیرائی حاصل کر کے ہماری زندگیوں کو بدل کر رکھ دیں۔

امریکہ اور کینیڈا میں ایسی 70 سے زیادہ ویب سائٹس بن گئی ہیں جو ایسے ہی تخلیق کاروں، موجدوں اور سائنسدانوں کو متعارف کروانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں جو گمنامی کی زندگی بسر کر رہے

ہیں لیکن دل میں بڑی تخلیق اور ایجاد کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے پاس جذبہ بھی ہے اور کچھ کر دکھانے کا یقین بھی۔ یہ لوگ باصلاحیت بھی ہیں اور اپنی ایجادات سے انسانیت کو مستفید کرنے کی لگن بھی لیے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کے لوگ اب ان لوگوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ دنیا کو ان کی صلاحیتوں سے روشناس کروا رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ گلی گلی محلے محلے ایسے لوگ بکھرے ہوئے ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے بے چین ہیں۔ ہمیں بھی ایسے گمنام جینئس لوگوں کو آگے بڑھنے اور اپنے خوابوں کو سچ کر دکھانے کا موقع دینا ہوگا، کیا پتہ ان میں کون ہمارے لیے ایک اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان بن جائے!

ویب ٹریفک کا ایک فیصد آئی پیڈ یوزرز

ایک فیصد کوئی بہت زیادہ شرح ظاہر نہیں کرتی تاہم اس سے آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی بڑھتی تعداد کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی تاہم نیٹ مارکیٹ شیئر کی شائع کردہ ماہانہ رپورٹ کے مطابق آئی پیڈ کے استعمال کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایپل آئی پیڈ ٹیبلٹ استعمال کرنے والے گلوبل ویب ٹریفک میں 1.03 فیصد کا حصہ رکھتے ہیں۔ پہلی بار آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوئی ہے۔

صرف انکل سام کی سرزمین (امریکہ) میں 2 فیصد سے زیادہ لوگ انٹرنیٹ سرفنگ کے لیے آئی پیڈ استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ مزید برآں آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کے اعداد و شمار میں تیزی سے اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ گزشتہ ایک سال کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آئی پیڈ یوزرز کی تعداد میں ہر ماہ 10 فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اعداد و شمار اس لحاظ سے بھی حیران کن اور زبردست ہیں کہ پہلا آئی پیڈ محض 15 ماہ پہلے ہی مارکیٹ میں متعارف کروایا گیا تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایپل آئی پیڈ ٹیبلٹ کا استعمال محض فیشن یا نمود و نمائش ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

ڈاٹ کام..... خدا حافظ

ایک عرصہ تک ویب سائٹس پر راج کرنے کے بعد ''ڈاٹ کام'' نامی ڈومین کا راج ختم ہونے کو ہے اور بہت جلد آپ کو دوسرے ناموں سے ویب سائٹس کی بھرمار نظر آئے گی جیسا کہ ''ڈاٹ گوگل'' ''ڈاٹ ایم ایس این'' اور اسی طرح کے دیگر نام بھی نظر آئیں گے اور یہ مشہور زمانہ ''ڈاٹ کام'' کی جگہ لے لیں گے۔ یہ اس لیے ہونے جا رہا ہے کہ آئی کین Icann جو کہ ''انٹرنیٹ کارپوریشن فار اسائنڈ نمبرز اینڈ نمبرز'' نامی ادارے کا مخفف ہے اس نے اب یہ منظوری دے دی ہے کہ نئے نام بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے قبل یہ آزادی نہ ہونے کے سبب زیادہ تر ویب سائٹس کے نام ڈاٹ کام یا زیادہ سے زیادہ ڈاٹ او آر جی تک محدود تھے تاہم اب یہ انٹرنیٹ کی تاریخ کے گزشتہ پچیس سالوں کی سب سے دلچسپ تبدیلی بن کر سامنے آنے والی ہے۔

اس وقت صرف 22 ٹاپ لیول ڈومین نیم موجود ہیں تاہم اب یہ تعداد تیزی سے بڑھے گی کیونکہ مختلف کمپنیاں اب اپنے ناموں کے ساتھ ڈومین نیم فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر رہی ہیں۔

www.urdukorner.com

اوڑگا

عرفان جاوید

لبوں کی نمی محسوس کرتے ہوئے اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ میرے ہاتھوں میں صرف خوشبو رہ گئی۔ وہ آہستگی سے بولی "تم بہت جذباتی ہو۔ یاد رکھو ہم آج ہی ملے ہیں اور صرف دوست ہیں۔ ہم دونوں سیاح ہیں اور کل کو یہاں سے اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔"

ایک جرمن دوشیزہ کا فسانہ جس کے دیس میں سچے جذبوں کا فقدان تھا

وہ ایک روشن صبح تھی مگر اسے صبح کہنا مناسب نہ ہوگا کہ دن کے دس بج رہے تھے اور بودرم جیسے ساحلی تفریحی علاقوں کی صبحیں دس بجے کے بعد ہی شروع ہوا کرتی ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنے کے بعد سیاح اکثر دن کے دس گیارہ بجے ہی آنکھیں ملتے بودرم کی اکلوتی شاہراہ پر سرگشت کرتے نظر آئیں گے۔ ایک روز قبل ہی اس Pension کے مالک نے، جہاں میں پچھلے روز استنبول سے طویل سفر کے بعد پہنچا تھا، مجھے بتایا تھا کہ بحیرہ قلزم کے ٹرپ کے لیے چھوٹے سمندری جہاز اور کشتیاں صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان روانہ ہو کر شام چھ سات بجے واپس لوٹ آتے ہیں۔

سو میں ساحل سمندر پر ایسے ہی کسی سفر کی تلاش میں چلا آیا تھا۔ ابھی زیادہ رش نہیں تھا اور اکا دکا کشتیاں اور جہاز سفر کے لیے تیار تھے۔ ان کے ملاح یا تو کشتیوں اور جہازوں کی نوک پلک سنوار

رہے تھے یا پھر ہار بر پر بیٹھے سگریٹوں کے لمبے لمبے کش لگا رہے تھے۔ سمندر کے پانی کا رنگ کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے نیلی روشنائی کی بہت بڑی دوات کسی نے اس میں انڈیل دی ہو۔ جب پانی ساحل سے ٹکراتا تو شڑاپ کی آواز سے سفید جھاگ پیدا ہوتی اور پانی ایک باریک نمکین تہہ کو چھوڑ کر واپس سرک جاتا۔ میں چلتا ہوا کافی دور نکل گیا تو میری نظر ایک سجے سجائے جہاز پر پڑی جو پرانے بادبانی جہازوں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اس نے مجھے پرانی جنگی فلموں کی یاد دلا دی اور میں نے اس کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے عملے نے مجھ سے میرے جوتے لے لیے۔ ننگے پیر سفر کرنا وہاں کی روایت تھی۔ میں چلتا ہوا جہاز کے اگلے عرشے پر چلا آیا جو سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا سے پیدا ہوتی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ عرشہ تقریباً خالی پڑا تھا۔ وہاں صرف دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک سنہرے بالوں اور نیلی پرکشش آنکھوں والی معصوم سی لڑکی تیراکی کے لباس میں بیٹھی دور سمندر کی چمکتی سطح پر بگلوں کی طرح ڈولتی کشتیوں کو دیکھ رہی تھی اور دوسری تیرہ چودہ سال کی مقامی لڑکی اس کی ساتھی لگتی تھی۔ جب میں عرشے پر آیا تو ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور ایک رسمی سا ہیلو کہہ کر دوبارہ سمندر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

پہلی ہی نظر میں سنہرے بالوں والی لڑکی کے چہرے پر مجھے اپنائیت سی محسوس ہوئی، جیسے یا تو میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے یا پھر میں اسے جانتا ہوں۔ زندگی میں کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو پہلی مرتبہ ہی مل کر اس کے لیے اپنائیت کا ایک گرم جذبہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں جبکہ بسا اوقات کئی ملاقاتوں کے بعد بھی کوئی آپ کو اجنبی لگتا ہے۔ [illegible] اس کا کھوج [illegible] میں لگاتے ہیں۔ بہرحال اس لڑکی کے اندر مجھے ایسی ہی اپنائیت کا احساس ہوا کہ میں عرشے پر ہی ٹھہر کر ریلنگ تھام کر سمندر میں جھانکنے لگا۔

جہاز آہستہ آہستہ لوگوں سے بھرنے لگا۔ ان میں زیادہ تر گورے، چینی اور عرب نسل کے جوان لڑکے لڑکیاں تھے جو مل جل کر پس منظر میں لگے ترکی گانوں پر ہلا گلا کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وسل بجی اور جہاز نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

اب تک دن کے دس سے بارہ بج گئے تھے۔ اس دوران میری کئی افراد سے شناسائی ہو گئی تھی۔ میرا نام ترکوں جیسا ہے اس لیے ترکوں سے قدرتی طور پر جلد ہی انگریزی میں گپ شپ شروع ہو جاتی ہے۔

سیاحوں میں زیادہ تعداد طالبعلموں کی نظر آتی تھی جو یورپ کے مختلف ملکوں سے سیاحت کی غرض سے بودرم کے آزاد اور خوبصورت ہونے کی وجہ سے چلے آتے تھے اور یورپ کی آبادی کے تناسب سے یہاں بھی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تر نے اضافی لباس اُتار کر اور جسم پر سکن لوشن لگا کر جہاز کی چھت کا رُخ کیا۔ لڑکے بھی شارٹس پہنے وہیں کا رُخ کرنے لگے۔

جلد ہی عرشے پر تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ میرے ساتھ میں ایک برٹش لڑکی ہیلن کھڑی تھی۔ اس سے تعارف ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں کئی پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی قریبی ترین سہیلی بھی ایک پاکستانی نژاد برطانوی لڑکی ہے۔ جب میں نے اسے عام تصور کے برعکس پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تو وہ میری باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سنہرے بالوں والی لڑکی اُٹھ کر ہمارے قریب چلی

www.urdukorner.com

آئی اور ہیلن سے اگلے قیام کے مقام کا پوچھا۔ میں پورا شیڈول پڑھ کر آیا تھا اس لیے ہیلن کو تذبذب میں دیکھ کر بول پڑا 'ابھی کوئی آدھ ایک گھنٹے کا سفر ہے۔' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رسمی سا شکریہ ادا کیا اور ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر دھوپ والا سیاہ چشمہ لگا کر دور دیکھنے لگی۔

میں اور ہیلن اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جب میں نے اسے وادی کیلاش کی رسومات کا بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر میں نے ہنزہ میں واقع 'ایگلونیسٹ' کا ذکر کیا جہاں ایک مقام سے دنیا کی زیادہ سے زیادہ بلند ترین چوٹیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ریاست بہاولپور کے سابق والیان کی دولت کا تذکرہ بھی اس کے لیے نئی چیز تھی۔ اس دوران سنہرے بالوں والی لڑکی بھی ہماری گفتگو کو بے اعتنائی کا نقاب اوڑھے دلچسپی سے سن رہی تھی۔

ابھی ہماری گفتگو چل ہی رہی تھی کہ ایک جزیرہ آ گیا اور جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ ہیلن تیراکی کے لیے چلی گئی۔

اب عرشے پر صرف میں، سنہرے بالوں والی لڑکی اور اس کے مقامی دوست رہ گئے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میری اور اس کی نگاہیں ٹکرائیں تو میں نے ہیلو کہہ دیا اور ''عرفان'' کہہ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ مسکرائی اور ''اولگا'' کہتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے جب اسے یہ کہا کہ وہ میری نظر میں آنے والی پہلی ترکی لڑکی ہے جس کے بال قدرتی طور پر ایسے گہرے سنہرے ہیں تو وہ بے اختیار ہنس پڑی اور بولی ''میں جرمن ہوں۔'' پھر اس نے جرمنی کے کسی چھوٹے سے قصبے کا نام لے دیا۔ اس دوران اس کی مقامی دوست بھی ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ ہم نے ہاتھ ملائے۔ میں نے جب اولگا کو پاکستان کا نام بتایا تو وہ بولی ''ہاں ہاں میں نے تمہارے ملک کا نام تو ٹی۔وی پر بہت سن رکھا ہے مگر افسوس کہ میں حالات حاضرہ اور جغرافیے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی۔''

اس پر میں نے اسے بتایا کہ پاکستان انڈیا کا ہمسایہ ہے اور یہ کہ ترکی کا دوست ہے۔ ... ہوئے میں نے مقامی لڑکی ... ر دیکھا۔ وہ لڑکی بھی مسکرا ... اور بہت گرم جوشی سے پاکستان کا ذکر کرنے لگی۔ اس کی گرم جوشی دیکھتے ہوئے اولگا کی بھی دلچسپی بڑھ گئی اور اس نے بتایا کہ اس کی ایک دور پار کی سہیلی ہندوستان میں کنبھ کے میلے میں گئی تھی اور وہاں کے یوگیوں اور جوتشیوں کا بہت ذکر کرتی تھی۔ یہ سن کر میں نے اپنی ٹھوڑی کھجلائی اور اسے بتایا کہ میں بھی علم دست شناسی کی کچھ شدھ بدھ رکھتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ اس نے اشتیاق سے اپنے دونوں ہاتھ میرے آگے پھیلا دیئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کے ہاتھ عام یورپی لڑکیوں کے نسبتاً سخت ہاتھوں کے برعکس بہت ملائم تھے۔ ہاتھوں کی مہین گوری شفاف جلد کے نیچے نیلی نیلی رگیں زندگی سے دھڑکتی تھیں اور لامبی انگلیوں کے کونوں پر خوبصورت تراشیدہ ناخن نسوانیت کا شاہکار تھے۔

میں نے ہاتھوں میں جھانکتے ہوئے سوال داغ دیا کہ اس کی اپنے بوائے فرینڈ سے حال ہی میں علیحدگی کیوں ہوئی ہے؟ وہ سوال سن کر حیران رہ گئی اور بول اُٹھی کہ مجھے ان کی علیحدگی کا کیسے پتہ چلا؟ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر دیا اور عمومی نوعیت کی پیش گوئیاں کرتا چلا گیا اور وہ متاثر ہوتی چلی گئی۔ پھر یکدم اس کا ہاتھ دھیرے سے نیچے کرتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا کہ میں ... نے پہلی مرتبہ بلا قیمت کسی کو اتنا کچھ بتایا ہے۔ وہ سر کو پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنس پڑی۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ پہلی مرتبہ جرمنی سے باہر نکلی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سہیلی تھی جسے استنبول میں کوئی لڑکا مل گیا تھا جس کے ساتھ اس نے آئندہ چند روز کا پروگرام طے کر لیا تھا۔ یہاں پر وہی مقامی ترک لڑکی اس کی دوست بن گئی تھی جو اس کی انگریزی پالش کرتی رہتی تھی اور یوں اس کی استانی تھی۔ جب میں نے اس سے تیراکی نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ بچپن میں کسی نے اسے پانی میں دھکا دے دیا تھا۔ تب سے پانی کا خوف اس کے دماغ میں ایسا بیٹھا کہ وہ دوسروں کو تو تیراکی کرتے دیکھتی رہتی ہے مگر خود پانی میں اُترنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

ابھی باتیں جاری ہی تھیں کہ انجن سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ہیلن اور دوسرے سیاح جہاز میں واپس آنے لگے۔ کوشش کے باوجود سلسلۂ گفتگو واپس نہ جڑ پایا۔ یوں بقیہ سفر ہیلن کے ساتھ خوش گپیوں میں کٹ گیا۔

شام کو جہاز ساحل سے لگا تو سیاحوں میں ایسی ہڑبونگ مچی کہ میں اولگا سے الوداعی ملاقات کے بغیر ہی جدا ہو گیا۔

اسی روز بودرم کی اکلوتی شاہراہ پر مٹر گشت کرتے، دکانوں اور کلبوں کو دیکھتے میں ایک کلب کے نیم تاریک گوشے میں آن بیٹھا۔ میں اب تک اولگا کو بھلا نہ سکا تھا۔ اس کے سنہری بال، نیلی آنکھیں، متناسب جسم، خوبصورت ہاتھ اور سب سے بڑھ کر معصومیت بار بار نظروں کے سامنے آ جاتے۔ جہاں اس سے اس طرح بغیر ملاقات کے بچھڑنے کی خلش سی تنگ کرتی تھی وہیں چھٹی حس کہتی تھی کہ ایسے چھوٹے ساحلی قصبے میں اس سے دوبارہ ملاقات ضرور ہو جائے گی۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری نظریں کلب کے دروازے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں چونک کر رہ گیا۔ سامنے سے اولگا اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ شام کے وقت صبح سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا حسن اس طرح نکھر آیا تھا جیسے سرمئی بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا ہو۔ اس کے ساتھ اس کی نوعمر استانی بھی تھی۔ وہ دونوں ہنستی ہوئی بار میں داخل ہوئیں تو ایک مرتبہ بار میں بیٹھے لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگی۔ کلب کی نیم تاریک اور دھوئیں سے بھری فضا میں مجھے بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں۔ اس نے گہری سرخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی جو گورے چہرے پر بہت پیاری لگ رہی تھی اور سنہرے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو کلب کی جلتی بجھتی گھومتی روشنیوں میں سلگ سلگ کر بجھ رہے تھے۔ وہ میرے قریب آئی تو استانی کی کسی بات پر سر کو پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنسی اور ساتھ سے گزر گئی۔ نہ تو وہ میرے قریب رُکی اور نہ ہی اس کے قدم ٹھٹھکے۔ میری نظریں اس کا تعاقب کرتی چلی گئیں۔ وہ کلب کے بار والے حصے کو عبور کر کے ڈانسنگ ہال میں داخل ہو چکی تھی۔

ڈانسنگ ہال کیا تھا، شور وغل اور مستانہ ہڑبونگ کی آماجگاہ جہاں جوان جسم کان کے پردے پھاڑ دینے والی تیز موسیقی پر دنیا و مافیہا سے بے پرواہ تھرک رہے تھے، لچک رہے تھے اور مدہوش ہو کر گر رہے تھے لیکن وہ ڈانس میوزک میری سماعت میں معدوم ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ ایک نامعلوم اور بے نشان سناٹے نے لے لی۔ میرے سامنے جوان جسم نہیں ناچ رہے تھے بلکہ رنگ برنگے نقطے لرز رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جب میں واپس اپنے حواس میں آیا

www.urdukorner.com

تو وہ میرے سامنے ناچ رہی تھی، بجلیاں کڑک رہی تھیں اور ڈانسنگ فلور لرز رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور بال فلیش لائٹ کی طرح روشنیوں میں چمکتے اور پھر دوسرے چہروں کے پیچھے گم ہو جاتے۔ اس کا جسم ایک والہانہ لیکن پراعتماد حرکت میں تھا۔ موسیقی کی لے پر اس کے قدم فلور پر پڑتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے دل پر پڑ رہے ہوں۔

کچھ دیر تو میں اس کا ناچ دیکھتا رہا، پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ایک کونے میں اس کی استانی بیٹھی نظر آئی۔

میں اپنی نشست سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ان نظروں میں آشنائی تھی۔ جب میں کرسی کھسکا کر اس کے ساتھ بیٹھ رہا تھا تو وہ مجھے بتانے لگی کہ جہاز سے اُتر کر جب کچھ دیر تک میں باوجود تلاش کے نہ مل سکا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں ہیلن کے ساتھ چلا گیا ہوں گا۔ اسے جب میں نے مسکرا کر بتایا کہ میں تو خود ان دونوں کو تلاش کرتا رہا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید میری عدم توجہی کو درشتگی سمجھ کر وہ وہاں سے چلی گئی ہیں، میں خود بھی چل دیا تو ہم دونوں اپنی اپنی غلط فہمیوں پر مسکرا دیئے۔

تھوڑی دیر میں اولگا ہانپتی کانپتی ہماری طرف آئی تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سانس درست کرتے ہوئے بولی "جیمز ز۔ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم دونوں کافی دیر تمہیں تلاش کرتی رہیں۔"

میں نے مسکین سے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی اور پوچھا کہ کیا وہ کلب کے پیچھے اوپن ائیر ٹیرس جو بحیرۂ قلزم پر کھلتا تھا، پر میرے ساتھ بیٹھنا پسند کرے گی؟ تو اس نے فوراً حامی بھر لی اور یوں ہم نیم تاریک چیختے چنگھاڑتے کلب کی عمارت سے نکل کر پرسکون بحیرۂ قلزم کے کنارے آن بیٹھے۔

رات ایک دن کا لبادہ اُتار کر دوسرے دن کا پہناوا پہن رہی تھی۔

رومانوی جوڑے دنیا سے بے خبر باہم راز و نیاز اور بوس و کنار میں مشغول تھے۔ ایک لمبے بالوں والا ہپی نوجوان پاجامہ پہنے گٹار پر کوئی گیت گا رہا تھا۔ شاید اس نے زیادہ پی رکھی تھی یا پھر حشیش استعمال کیے ہوئے تھا کہ اس کی زبان بار بار لڑکھڑا جاتی تھی۔ نیند کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ میں نے اولگا کی طرف دیکھا۔ اس کے بال سمندر کی ہوا میں لہرا رہے تھے اور ہلکی خنکی سے بچنے کے لیے اس نے ٹانگوں کو جسم کے نیچے تہہ کر کے پورے بدن کو سیاہ لباس میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ سمندر میں دور کھڑے کسی جہاز کی مدھم پڑتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ چاندنی کے ذرات اس پر جھلملا رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تو جہاز کو دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا تو میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جھینپ کر میں نے نظریں موڑ دیں۔ وہ سر پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنسی اور بول اُٹھی "دیکھو، تم تو شرما کر بلش کر گئے ہو۔" میں بھی ہنس پڑا۔

پھر ہم نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ مجھے اپنے جرمن قصبے کا بتانے لگی، اپنے چھوٹے سے باغیچے کا بتایا جہاں اس نے خود پھول لگائے تھے۔ اس نے ان بڑے جرمن شہروں کا بھی بتایا جو اس نے دیکھ رکھے تھے۔ میں بھی اسے اپنے شہر لاہور کا بتانے لگا۔ اسے شہر کی پرانی فصیل کے اندر قدیم شہر کا بتایا، کھانوں کا بتایا اور لوگوں کی عادات کا بتایا۔ اسے ان پیشوں کا بتایا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے جیسا کہ برتنوں پر قلعی کرنے والے۔ بات چلتے چلتے شاعروں اور ادیبوں تک چلی گئی۔ میں نے اسے ناصر کاظمی کا بتایا جو پورے چاند کو دیکھ کر دیوانہ

www.urdukorner.com

ہو جاتا تھا، گرمیوں میں آگ تاپتے ساغر صدیقی کا بتایا اور تارڑ کی پاسکل کا بتایا۔ وہ بہت متاثر ہوئی اور کہنے لگی کہ یہی لوگ تو قدرتی حساس فنکار ہوتے۔ پھر اس نے مجھے جرمن ادیبوں کا بتایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گو وہ زیادہ ادب تو نہیں پڑھی ہوئی مگر لوک جرمن شاعری اس کے دل کو اپنے لبوں سے چوم لیتی ہے۔ جب اس نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے مجھے یہ بات بتائی تو میرے دل میں ان ہونٹوں کو چوم لینے کی خواہش جاگی۔ میں اسے اردو کے رومانوی شعر سنانے لگا۔ وہ بہت دیر تک شعر سنتی رہی اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "تم یقیناً ایک اچھے دل کے مالک ہو اور مختلف ہو۔ آج کل کے جرمن لڑکوں کو تو ایسے شعر نہیں آتے۔" میں نے اس کے مرمریں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور لبوں تک لے آیا۔ لبوں کی نمی محسوس کرتے ہوئے اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ میرے ہاتھوں میں صرف خوشبو رہ گئی۔

وہ آہستگی سے بولی "تم بہت جذباتی ہو۔ یاد رکھو ہم آج ہی ملے ہیں اور صرف دوست ہیں۔ ہم دونوں سیاح ہیں اور کل کو یہاں سے اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔"

مجھے اپنی آواز دور سے آتی سنائی دی "اولگا ان لمحات کو دلیل کی قید میں دینا دل کے ساتھ ناانصافی ہے۔ میں کوئی اور خواہش نہیں رکھتا صرف تمہیں ہونٹوں سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی "میں نے تمہاری دلچسپی جہاز ہی میں محسوس کر لی تھی لیکن میں ایک عملی لڑکی ہوں۔"

"اور میں بھی ایک عملی لڑکا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی انگلیوں کو چوم لیا۔ ایک واضح کپکپی اس کے ہاتھوں سے سفر کرتی ہوئی اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور چاند کی جھلملاہٹ سمندر کے پانیوں سے سفر کرتی ہوئی اس کی نیلی آنکھوں میں نظر آنے لگی۔ شاید اسے کوئی پرانا دکھ یاد آ گیا تھا۔

وہ رات عجب مدہوشی کی کیفیت میں گزری۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں، پالتو جانوروں کی باتیں، سفروں کی باتیں اور پہلے بوسے کی باتیں۔ وہ بہت توجہ سے میری باتیں سنتی رہی اور اپنی چھوٹی سی سادہ زندگی کی معصوم باتیں سناتی رہی۔ رات ڈھلتی رہی اور فضا میں مستی کی مہک بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جب بودرم کی جامع مسجد سے صبح کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو ہم دونوں اپنے شکن آلود لباس درست کرتے اُٹھے اور اگلی شام ٹمپل کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے سویرے کے گنے چنے سیاحوں میں گم ہوتے چلے گئے۔

بودرم استنبول سے کئی گھنٹے کی مسافت پر واقع ساحلی تفریحی مقام ہے۔ یہ نوجوان سیاحوں کا گڑھ ہے۔ فیملیز ادھر کا رُخ کم ہی کرتی ہیں۔ وہ مارمارس کو بودرم پر ترجیح دیتی ہیں۔ یہاں کے نائٹ کلب پورے ترکی میں مشہور ہیں۔ ٹیمپل انہی کلبوں میں سے ایک ہے۔

اگلے روز میں سرشام ہی ٹیمپل کلب میں آن بیٹھا۔ جینز کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن کر میں کم فارمل نظر آنا چاہتا تھا۔ شام کو شروع ہونے والا انتظار رات کو ختم ہوا جب اولگا کلب میں داخل ہوئی۔ ایک فیڈڈ جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی سرخ ٹاپ پہنے وہ پچھلی رات کی نسبت بہت پژمردہ لگ رہی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ میری میز پر آئی اور بے دلی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا اور لائٹر جلا کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لے کر آنکھیں موند لیں۔ میرے دل پر چوٹ سی پڑی۔ میں نے نرمی سے اس کے میز

پر دھرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے اعصاب کو سکون کی ضرورت نظر آتی تھی اور میں اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی "جب سے میرے بوائے فرینڈ نے مجھ سے دھوکہ کر کے مجھے چھوڑا ہے میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔"

اس نے ایک اور کش لیا اور آنکھیں دھیرے دھیرے بند کر لیں۔ پھر بند آنکھوں کے ساتھ وہ بڑبڑائی۔

"تم لڑکے اتنی آسانی سے لڑکیوں کو دھوکا کیسے دے لیتے ہو؟ اور پھر بھول بھی جاتے ہو۔"

ابھی میں اس کے سوال کی تہہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف پرسوچ نظروں سے دیکھا اور کھسیا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

"آؤ آج کہیں اور چلیں۔ کلب میں بہت شور ہے۔ ہاربر کے پاس ایک کیفے ہے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

میں تھکے تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ باہر کی تازہ ہوا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے اسے قریب کر لیا اور ہم دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور کوئی جرمن گیت دھیمی آواز میں گنگنانے لگی۔ پھر وہ اچانک رُک گئی۔ میں نے تشویش سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ میری آنکھوں میں نمی تیر گئی اور اردگرد کی ہر شے پر ستارے دمک اُٹھے۔

ہم کیفے تک کس طرح پہنچے مجھے خبر نہیں۔ کیفے میں کافی کے تلخ گھونٹ جب میرے وجود میں اُترے تو کچھ ہوش آیا۔

وہ رات بھی ہم نے باتیں کرتے گزاری۔ معصوم باتیں، بے معنی باتیں، بے ربط باتیں، ایسی ایسی باتیں جو شاید کبھی خود اپنے آپ سے بھی نہ کی تھیں۔ اس رات میں نے خدا سے بہت دعا کی کہ صبح نہ ہو مگر پھر صبح کا تارا سیاہی مائل نیلے آسمان پر جھلملانے لگا۔

جانے سے کچھ دیر پہلے باتیں کرتے کرتے وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر حلق سے کچھ نگلتے ہوئے بولی "شاید میں کل قریب میں ازمیر چلی جاؤں۔ وہاں سے ایک آدھ ہفتے میں استنبول چلی جاؤں گی۔"

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ جب خاموشی ماحول کو بوجھل کرنے لگی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی سے دوسرے ہاتھ کو مسل رہی تھی۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ طاری کی اور اسے بتایا کہ میں دو تین روز ابھی بوردم میں رہوں گا پھر واپس استنبول لوٹ جاؤں گا۔ میں نے اسے بوردم کے اپنے Pension کا کارڈ بھی دیا اور اس کی پشت پر استنبول میں نیلی مسجد کے قریب واقع اپنے ہوٹل کا پتہ بھی لکھ دیا۔

وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر کارڈ لے لیا اور اسے تکنے لگی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو جیسے خود ہی کسی خیال میں چونک گئی اور بولی۔

"عرفان کاش تم جرمنی میں پیدا ہوئے ہوتے۔"

اس پر میں بجھے دل سے مسکرا دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"بس خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔"

ازالہ

محمد سلیم اختر

"کواس بند کرو" مارکوس غرایا۔ "اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ تم نے میری بہن کو جرائم کی دنیا میں گھسیٹا۔ اس کی عزت و ناموس سے کھیلتے رہے۔ پھر تم نے اسے عین اس وقت چھوڑ دیا جب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ بچہ مر گیا اور وہ اب تک اس حادثے کو برداشت نہیں کر سکی۔

جو وہ کسی کا مجرم تھا اور غلطی سُدھارنا چاہتا تھا مگر اسے اسکا موقع نہ مل سکا

وہ جون کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ کیپٹن جارج کے دفتر میں پنکھا چل رہا تھا۔ اگرچہ دفتر میں گرمی زیادہ نہیں تھی لیکن دماغ رساں انسپکٹر مارکوس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ وہ اس وقت اپنے چیف کیپٹن جارج کے سامنے کٹہرا بنا ہوا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے ایک طویل سانس لی جیسے سینے کے اندر ہونے والی جنگ اور گھٹن کو ختم کر دینا چاہتا ہو۔

"تو یہ تھا وہ معاملہ" کیپٹن جارج نے ایک فائل کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ مختلف یادداشتوں پر مشتمل فائل کا مطالعہ کر رہا تھا..... "یہ خبر جھوٹ بھی ہو سکتی ہے لیکن مخبر کا دعویٰ ہے کہ رامزے اس وقت یہاں موجود ہے۔ ممکن ہے کنیسا س سٹی میں اسے گرمی نے پریشان کر دیا ہو بہرحال اب

www.urdukorner.com

جبکہ وہ یہاں موجود ہے ہمیں چاہیے کہ اسے گرفتار کرادیں۔"

مارکوس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کیپٹن جارج کہیں دور سے بول رہا ہو۔ اس نے کیپٹن کی بیشتر باتیں شاید سنی ہی نہیں تھیں۔ رامزے کا نام سنتے ہی اس کا پورا جسم کھنچے ہوئے تار کی طرح تن گیا تھا۔ جذبات کا غلبہ جیسے جیسے بڑھ رہا تھا نبض کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی۔

رامزے اس کا شریک کار تھا لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پولیس میں بھرتی نہیں ہوا تھا۔ رامزے ایک ذہین اور شاطر آدمی تھا جس کے نزدیک پورٹ سٹی کا ہر آدمی احمق تھا اور بالآخر جلد از جلد زیادہ دولت کمانے کے چکر میں وہ اس شہر سے چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی پورے دو سال بعد ہوئی تھی۔ یہ آمد کیپٹن جارج کے لیے بڑی اہم تھی۔ لیکن رامزے کی آمد کی سب سے زیادہ اہمیت کلیئر مارکوس کے لیے تھی۔ وہ اس کے ظاہری حسن اور دلکشی سے بہت متاثر تھی۔ رامزے نے بھی اسے لبھانے کے لیے تمام شاطرانہ چالیں آزما ڈالی تھیں۔ اس ملاپ کے بعد وہ جلد ہی ریوالور بردار ڈاکو بن گیا تھا اور اس سے انسپکٹر مارکوس کی بہن کلیئر کی زندگی ویران ہو گئی تھی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے انسپکٹر؟"

مارکوس نے گہری سانس لی۔ اس نے دو سال پہلے یہ تہیہ کیا تھا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں وہ رامزے سے اپنی بہن کا انتقام لے کر رہے گا۔ اس وقت مارکوس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ بالآخر اسی شخص کی گرفتاری کا فرض اس کے کندھوں پر ڈال دیا جائے گا۔ اگرچہ ایسی خبروں سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہوتا تھا لیکن یہ رامزے کا معاملہ تھا جسے وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ "مجھے یقین ہے جناب" مارکوس نے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کیپٹن کبھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس کا کوئی ذاتی معاملہ بھی کسی ایسی صورتحال میں ملوث ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی بات سے مطمئن ہو گیا۔

"بہت خوب" جارج نے یادداشت کی فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا...... "مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے تاہم ہر طرح سے محتاط رہنا چاہیے۔ میاٹ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں اسے پہلے ہی اطلاع دے چکا ہوں کہ وہ تمہارا ساتھی ہوگا۔"

مارکوس کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے میاٹ کو ساتھ رکھنا ضروری نہیں تھا بلکہ اسے کسی کی رفاقت یا معاونت کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔

"مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے جناب" اس نے مختصراً کہا۔

جارج نے تردید کرتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا "رامزے ایک خطرناک خزانچی ہے۔"

اس نے کہا "میں اس کے مقابلے میں اپنا کوئی ایک آدمی نہیں بھیج سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک کی بجائے کم از کم دو آدمی ہوں۔"

"لیکن مجھے میاٹ کی ضرورت نہیں ہے۔"

کیپٹن نے مارکوس کے لہجے کو محسوس کیا تو وہ تفکر آمیز انداز میں کہنیاں میز پر جمائے آگے بڑھا۔

"تمہیں میاٹ کی ضرورت نہیں ہے یا تم اس کی رفاقت پسند نہیں کرتے۔"

"اس میں کوئی ذاتی چپقلش نہیں ہے جناب"

"کیا وہ ایک بہترین سارجنٹ نہیں ہے؟"

"یہ درست ہے لیکن......"

کیپٹن جارج اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے اس شخص کا انتخاب اس لیے کیا ہے تاکہ وہ کچھ اعت[illegible] کر سکے اور اس کے لیے [illegible] کی تجربہ کار آدمی کے ساتھ رہنا چاہیے۔" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔

"لیکن جناب"

"بس" جارج نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ "تمہیں ایک فرض سونپ دیا گیا ہے اب اس پر عمل کرنا ہے۔ یہ حکم ہے۔ سمجھے؟"

کیپٹن کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے بات ختم کر دی ہو لیکن مارکوس ابھی مزید احتجاج کی گنجائش نکال رہا تھا...... "بہت بہتر جناب لیکن" اس نے کہا اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ دفتر سے باہر نکل گیا۔ وہ سکواڈ روم میں سارجنٹ میاٹ کو تلاش کرنے چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے ذاتی طور پر کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

سارجنٹ میاٹ ایک نوعمر اور ذہین آدمی تھا۔ وہ اس موجودہ مشن کے بارے میں بہت ہی سنجیدہ تھا۔ جب کارلوس کار ڈرائیو کر رہا تھا تو وہ اس کے پہلو میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک گرم سہ پہر تھی اور سڑک پر ٹریفک زیادہ نہ تھی۔ پولیس کار پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ کار پولیس کی ہے۔

"کیا تمہارے خیال میں رامزے واقعی واپس آ گیا ہے" میاٹ نے کہا...... لیکن کارلوس خاموش رہا۔ اس نے ڈرائیونگ صرف اس لیے کی تھی کہ اپنے کھنچے ہوئے اعصاب پر قابو پا سکے۔ اس نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط رکھی۔ انگلیوں کے جوڑوں سے سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے سارجنٹ میاٹ کی طرف دیکھا اور کہا "کیپٹن کا خیال ہے کہ مخبر نے یہ اطلاع غلط نہیں دی ہے۔"

"میری خواہش ہے کہ اطلاع درست ہو اور ہم اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔" نوجوان سارجنٹ کے لہجے سے جوش و خروش ظاہر ہو رہا تھا...... "میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم کیا محسوس......" وہ یکایک خاموش ہو گیا۔

اس نے مارکوس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ لی تھی کہ وہ شدید ہیجانی کیفیت کا شکار ہے۔

"میں سمجھ رہا ہوں" مارکوس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اس قصے کو بھول جاؤ۔"

"دراصل میرا مطلب تھا۔"

"میں نے کہا ناں...... بھول جاؤ۔" مارکوس نے کہا۔

"کیا کوئی ذاتی وجہ ہے؟"

"ہاں...... رامزے نے میری بہن کو جرائم کی دنیا میں گھسیٹ لیا تھا۔ آج سے دو سال پہلے تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے...... اس کے بعد رامزے نے میری بہن کو انتہائی ذلت آمیز حالت میں چھوڑ دیا تھا اور اس نے تنہا بچے کی پیدائش کا تکلیف دہ مرحلہ طے کیا تھا"...... اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ "لیکن بچے کی پیدائش کے بعد وہ شدید بیمار ہو گئی اور بچہ مر گیا۔ اس صدمے نے اس کی ذہنی حالت خراب کر دی تھی۔ اس روز میں نے فیصلہ کیا تھا کہ رامزے کو اس جرم کی خوفناک اور عبرتناک سزا دوں گا۔"

میاٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں لیکن......"

"کچھ نہیں سارجنٹ! میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" مارکوس نے سخت لہجے میں کہا۔

میاٹ خاموش ہو گیا۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ مارکوس نے کار ایک چوراہے سے گھمائی اور اس کا رُخ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ اس نے دل ہی دل میں رامزے کی کمین گاہ کا پتہ

www.urdukorner.com

دوہرایا اور زیر لب کہا ”تم جہاں ہو۔ وہیں رہو رامزے! میں آرہا ہوں۔“

جب وہ اس عمارت کے قریب پہنچے جہاں کے بارے میں اطلاع تھی کہ رامزے وہاں چھپا ہوا ہے۔ مارکوس نے نکڑ پر کار روک دی۔ جب اس نے انجن بند کیا تو میاٹ نیچے اُترنے کے لیے سیٹ سے اٹھنے لگا۔ مارکوس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں سارجنٹ۔ وہاں ہی بیٹھے رہو۔“

”کیا مطلب جناب؟“ سارجنٹ نے حیرت سے کہا۔

مارکوس نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالا۔ یہ اعشاریہ تین آٹھ کا پولیس سپیشل تھا۔ اس نے ریوالور کو چیک کرتے ہوئے کہا ”تم گاڑی میں بیٹھے رہو۔ میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔“

سارجنٹ چند لمحوں تک مارکوس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”کیپٹن جارج نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہارے دوش بدوش رہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ریوالور نکال کر چیک کیا اور گاڑی سے اُتر آیا۔

جھنجھلاہٹ اور جوش سے مارکوس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے میاٹ کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا میاٹ کو کچھ شبہ ہو گیا ہے؟

”یہ میرا حکم ہے سارجنٹ!“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کار میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔“ سارجنٹ نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے جناب۔“

مارکوس کا غصہ بڑھ کر اپنی انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے سخت نگاہوں سے سارجنٹ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس ... فٹ پاتھ پر تھے اور ایسی جگہ ...

”ٹھیک ہے۔“

... اندر داخل ہوئے۔ تاریکی ... سن اور سیلن کا احساس ہو رہا تھا۔

مارکوس نے سارجنٹ کو اشارہ کیا۔ وہ آگے آگے چلنے لگا۔ وہ جس کمرے کو تلاش کر رہے تھے وہ چوتھی منزل پر تھا۔ اس عمارت میں لفٹ نہیں تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے زینے چڑھنے لگے۔ جب وہ تیسری منزل پر پہنچے اور سارجنٹ نے چوتھی منزل کے زینے پر قدم رکھا تو مارکوس نے اپنا ریوالور نکالا اور پوری قوت سے سارجنٹ کی کھوپڑی پر آزما ڈالا۔ سارجنٹ کے حلق سے کراہ نکل گئی اور وہ لہرا کر مارکوس کے ہاتھوں میں گر گیا۔

”مجھے افسوس ہے دوست!“ مارکوس نے زیر لب کہا۔ ”لیکن تم نے مجھے اس پر مجبور کر دیا تھا۔“ اس نے ایک بڑی الماری کی طرف میاٹ کے بیہوش جسم کو گھسیٹا اور پھر اس کی نبض دیکھ کر اطمینان کر لیا۔ اس کے بعد سارجنٹ کو اندر ٹھونس کر اس نے الماری کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مارکوس ہاتھ میں ریوالور لیے تیزی سے چوتھی منزل کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ رامزے اس کمرے میں موجود ہو۔ غصے سے اس کے جبڑے ایک بار پھر بھنچ گئے تھے۔ اس نے دروازے کے سامنے پہنچ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور آندھی کے تیز جھونکے کی طرح اندر گھس گیا۔

کمرے میں رامزے موجود تھا۔ اس کی نگاہ جیسے ہی مارکوس پر پڑی وہ دیوانہ وار

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

ریوالور کی طرف لپکا۔

''جہاں ہو۔ وہیں رُک جاؤ۔'' مارکوس غرایا۔

رامزے رُک گیا۔ اس نے مارکوس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی وردی کو دیکھ کر اس کی سبز آنکھوں سے سرد مہری جھلکنے لگی۔ وہ خاموشی سے اپنے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ مارکوس نے ایڑھی سے دروازہ بند کر دیا۔ ''کیا تم نے مجھے پہچانا رامزے؟'' اس نے کہا۔

رامزے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہاں..... لیکن تم؟''

''بکواس بند کرو'' مارکوس غرایا۔ ''اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ تم نے میری بہن کو جرائم کی دنیا میں گھسیٹا۔ اس کی عزت و ناموس سے کھیلتے رہے۔ پھر تم نے اسے عین اس وقت چھوڑ دیا جب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ بچہ مر گیا اور وہ اب تک اس حادثے کو برداشت نہیں کر سکی۔ تم اس بچے کے قاتل ہو رامزے..... اور میں تمہیں اس کی سزا دینے آیا ہوں۔''

''لیکن مارکوس.....!''

''خاموش رہو۔'' مارکوس کی غراہٹ خوفناک تھی..... ''اب تمہیں اپنے بھیانک ماضی کو یاد کرتے ہوئے موت کی آغوش میں سو جانا چاہیے''..... اس نے اوپر تلے تین فائر کیے۔ دو گولیاں رامزے کے سینے میں لگیں اور تیسری اس کی ٹانگ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے باوجود اس کی پھرتی قابل داد تھی۔ وہ ریوالور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جب وہ پلٹا تو مارکوس نے چوتھا فائر کیا لیکن اس سے پہلے ہی رامزے کی گولی چلا چکا تھا۔ گولی مارکوس کے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزری اور عقب سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

مارکوس نے چونک کر دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور سارجنٹ میاٹ سینہ تھامے فرش پر جھکا ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کب اور کس طرح ہوش میں آ کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ مارکوس نے پلٹ کر رامزے کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ کھل گیا تھا۔ وہ اب بھی مارکوس کو گھور رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا تھا لیکن مارکوس نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے ٹھوکر مار کر رامزے کو دیوار کی طرف دھکیل دیا.....

ایک نسوانی چیخ سن کر مارکوس کا ہاتھ کانپ گیا۔ دروازے میں سارجنٹ کی لاش کے پیچھے جولز کی کھڑی ہوئی تھی اس کی آنکھیں حیرت، خوف اور غیر یقینی کے عالم میں پھٹی ہوئی تھیں۔

''میری بہن'' مارکوس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا۔'' وہ چیختی ہوئی آگے بڑھی اور بھائی سے چمٹ گئی۔

''یہ اسی انجام کا مستحق تھا۔'' مارکوس بڑبڑایا ''کیا تمہیں اس کے مرنے کا افسوس ہے پاگل لڑکی؟''

اس نے خاموشی سے ایک خط نکال کر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ مارکوس نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے خط کھولا اور تحریر پڑھتے ہی اس کی آنکھیں سمٹ کر خفیف سی جھریوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ رامزے کا خط تھا۔ جو اس نے کنیساس سٹی سے کلیئر کے نام لکھا تھا۔ آخری جملہ طوفان کی طرح مارکوس کے ذہن میں چکر لگانے لگا۔

''مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی کلیئر.....! میں ماضی کی تمام غلطیوں کا ازالہ کرنے آ رہا ہوں۔''

جھوٹی روٹی

جیلانی بانو

ممی سمجھ گئیں کہ وہ سب اندر آنا چاہتے ہیں۔ رات بھر پورچ کو گندہ کریں گے۔ صبح سارا فرش دھلوانا پڑے گا۔ اس لیے ممی نے ڈیڈی سے کہا کہ ان لوگوں کو چلانے دو۔ کوئی جواب مت دو۔ بارش تیز ہوئی تو خود ہی اور کہیں بھاگ جائیں گے مگر مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ پھاٹک توڑ کر اندر نہ آ جائیں۔

معاشرتی تفریق اور اس کے اثرات کو واضح کرتی سفاک تحریر

وہ سب کھیلتے کھیلتے ہمارے لان میں آ گئے تھے۔ وہ سب بچے ہمارے بنگلے کے سامنے والی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ننگے دھڑنگے۔ کالے کلوٹے اور بے حد لڑاکو گندے بچے ہیں۔ جب بھی کھڑکی سے باہر جھانکتا تھا کوئی نہ کوئی دیپسپ لڑائی دیکھنے کو ملتی تھی۔ پھر ذرا دیر بعد دیکھو تو وہی لڑنے والے بچے مل جل کر کوڑے میں کیلے کے چھلکے اٹھا کر رکھ رہے ہیں۔

آئے دن ان جھونپڑیوں میں کوئی نہ کوئی مر جاتا تھا۔ عین اس وقت جب ہم سب ناشتا کرتے ہیں۔ اچانک جھونپڑیوں میں سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگتیں۔ ممی اکتا کر سلائیس اور چھری پلیٹ میں رکھ دیتیں اور کھڑکی بند کر کے کہتیں: آج پھر کوئی بچہ مر گیا، ساری کالونی میں جراثیم پھیل رہے ہیں۔ کم بختوں کو بچے جننے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا ہے۔ اب تو میں کچھ نہیں کھاؤں گی ممی معلوم ہو رہی ہے۔

جب تک یہ ساری جھونپڑیاں نہیں ہٹیں گی یہی

www.urdukorner.com

مصیبت رہے گی۔ ڈیڈی اُبلا ہوا انڈا کانٹے میں پھنساتے ہوئے کہتے۔

دنیا بھر کے مرض پھیلے ہوتے ہیں ان لوگوں میں۔

ڈیڈی یہ لوگ بچوں کو ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جاتے؟ میں ڈیڈی سے پوچھتا۔

عادت ہو جاتی ہے کم بختوں کو گندگی میں لاٹنے کی۔ ڈیڈی کی بجائے ممی جواب دیتیں۔

کتیوں کی طرح درجنوں بچے ہوتے ہیں ایک عورت کے۔ ان میں دو چار مر جائیں تو انہیں کوئی دکھ تھوڑی ہوتا ہے۔ ممی نے کئی بار کوشش کی کہ سامنے کے میدان سے جھونپڑیاں ہٹا دی جائیں لیکن ہمارا مکان تو بن گیا تھا مگر اس نئی کالونی میں اور بہت سے مکان بن رہے تھے۔ اس لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ مجبوراً انہیں سہنا پڑتا۔

شام کو جب ڈیڈی مجھے کار میں لاتے تھے تو وہ سب بچے تالیاں بجا کر خوشی سے چلاتے ہوئے کار کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے۔ چھوٹے راجہ آ گئے چھوٹے راجہ آ گئے۔ ان لوگوں کے راجہ کہنے پر ممی بہت خوش ہوتی تھیں جیسے ہم سچ مچ کے راجہ بن گئے ہوں۔ ڈیڈی نے اپنا دو منزلہ مکان ان لوگوں سے بنوایا تھا۔ اس لیے ان مزدوروں نے ڈیڈی کو اپنا راجہ مان لیا تھا۔ اس حساب سے میں چھوٹا راجہ ہوا۔ ممی کہتیں: اچھا ہے نئی کالونی میں اگر راجہ کہلائیں گے تو آگے آنے والوں میں بھی یہی نام چل پڑے گا۔

ممی مجھے منع کرتی تھیں کہ ان گندے بچوں کے ساتھ مت کھیلو۔ ان لوگوں کے روگ تمہیں بھی لگ جائیں گے۔ انہوں نے میرے کھیلنے کے لیے گھر میں ڈھیروں کھلونے جمع کر دیئے تھے لیکن میں وہ کھلونے کس کے ساتھ کھیلتا۔ میرا اور کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا اور پھر جب سڑک پر کچرا اُڑ رہی ہو، مٹی گھروندے بن رہے ہوں۔ گزرنے والوں کا منہ چڑایا جا رہا ہو تو ان دلچسپیوں سے منہ موڑ کر بے جان کھلونوں کے ساتھ کون کمرے میں بند رہ سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی سب کھلونے پھینک پھانک ان بچوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا تھا۔

یہ مٹی تو کچھ چھوڑ میری ہے۔ یادی اکڑ کے کہتی۔ اکڑ کر میں میدان میں پڑے ہوئے رنگین پتھر چننے لگتا۔ ہمارے میدان کے پتھر کیوں اُٹھا رہے ہو؟ وہ میرے ہاتھ سے گرا دیتی۔ جاؤ اپنے بنگلے کے اندر رہو ہماری دھرتی پر مت آنا۔ وہ خوب میراثی جلاتی تھی۔

پھر ایک دن کھیلتے کھیلتے یادی نے کہا: وہ بنگلہ تو ہمارا ہے۔

کون سا! میں نے حیرت سے پوچھا؟

وہ لال جالیوں والا۔ میرے باپ نے بنایا ہے۔ ماں کہہ رہی تھی ایک دن ہم اسی بنگلے میں جا کر رہیں گے۔

وہ بنگلہ تو ہمارا بنگلہ ہے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ یادی ہمارے بنگلے کو اپنا کہہ رہی تھی۔ میں نے لٹو اور جالی وہیں پھینکی اور بھاگا ممی کے پاس۔ ممی ممی یادی ہمارے بنگلے کو اپنا کہہ رہی تھی۔

اوہ بکنے دو۔ ممی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اطمینان سے لپ اسٹک لگاتی رہیں۔

اور کسی دن اس کی ماں سب کو لے کر اپنے بنگلے میں آ گئی تو، میں سخت پریشان تھا۔

تو میں سب کو جوتے مار کے نکال دوں گی۔

جھوٹی ہے تُو۔ دوسرے دن میں نے یادی کے دعوے کو جھٹلایا۔ وہ تو ہمارا بنگلہ ہے۔

اوں ں ں۔ یادی نے جیب نکال کر میرا منہ چڑا دیا۔

"چلو ابھی گنتہ دار سے پوچھیں گے یہ بنگلہ کس نے بنایا ہے۔" وہ اکڑ کر بولی۔

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

’’چلو‘‘ لیکن میں اٹھا نہیں کیونکہ بنگلہ سچ مچ یادی کے ماں باپ نے میرے سامنے بنایا تھا۔ پھر ہمارا کیسے ہوگیا۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی تو سامنے رہنے والے سارے مزدور چیونٹیوں کی طرح ہمارے بنگلے کو چمٹے رہتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جانے کیسے یہ اونچا بنگلہ یوں ابھرا جیسے سب مزدوروں نے مل کر اسے زمین کے نیچے سے نکالا ہو۔

شام کو جب سب مزدور چلے جاتے تھے تو یادی کی ماں ڈیڈی کے پاس آ کھڑی ہوتی اور ہنس ہنس کر ڈیڈی سے ایک آدھ پیسہ مانگ لیتی۔ نری کالی بھجنگ تھی وہ مگر خوب ہٹی کٹی چھت پر جب سیمنٹ کا کام ہو رہا تھا تو یادی کی ماں دوسری مزدورنیوں کے ساتھ مل کر ڈیڈی کی تعریف کے تکلگوگیت گاتی تھی۔ وہ گیت سن کر ڈیڈی خوب ہنستے تھے لیکن ممی کو یادی کی ماں پر بہت غصہ آتا تھا۔ تب ڈیڈی سمجھاتے کہ وہ بڑی محنت سے کام کرتی ہے جبھی تو اتنی تگڑی ہے۔ یادی کی ماں کا ذکر ہو رہا ہو تو مجھے شبہ ہوتا جیسے ڈیڈی پیپر منٹ کی گولی منہ میں رکھے ہوتے ہیں۔

کچھ کام نہیں کرتی وہ بے حیا کہیں کی۔ جب دیکھو مردوں کے ساتھ کھی کھی کر رہی ہوتی ہے۔ ممی جل کر کہتیں۔

یادی کی ماں اور سب عورتیں سچ مچ بڑی بے شرم تھیں کیونکہ ان کی پوری قوم کی عورتیں ساری کے ساتھ بلاؤز نہیں پہنتی تھیں۔ بالکل ننگی رہتی تھیں۔ جانے کیوں؟ اور مزدوری کرتی تھیں۔ پتھر پھوڑتی تھیں۔ اینٹیں اٹھاتی تھیں۔ سیڑھیوں پر چڑھتی تھیں۔ ذرا بھی نہیں سوچتی تھیں کہ وہ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو ننگی نظر آ رہی ہوں گی۔

ڈیڈی آفس سے آنے کے بعد مکان بنتے ہوئے دیکھتے تو ممی وہاں کھڑے ہو کر بڑی نفرت سے کہتی تھیں۔ جانے کیوں ان بے شرم عورتوں کو مزدوری کے لیے بلاتے ہیں اور پھر وہ ورانڈے میں جا کر ڈیڈی کو بلاتی تھیں۔ بس بہت ہو چکی تفریح، اندر آئیے ڈارلنگ آپ کو ایک بہت اچھی چیز دکھاؤں گی۔ مگر ڈیڈی جیسے جانتے ہوں کہ ممی کوئی بہت اچھی چیز نہیں دکھا سکتیں۔

پھر شام کو جب یادی کی ماں درگا پیشگی مزدوری کے لیے ڈیڈی کی خوشامد کرتی تھی ڈیڈی اسے ڈانٹ کر ایک آدھ روپیہ دے دیتے تھے۔ یادی ماں کے پیچھے کھڑی بڑی امید بھری نظروں سے یہ تماشا دیکھتی تھی۔ جیسے ہی ڈیڈی جیب میں سے پرس نکالتے وہ جھونپڑے کی طرف بھاگتی۔ اپنے باپ کو یہ خوشخبری سنانے کہ پیسے آ رہے ہیں۔

ایک رات بڑے زور کی بارش ہوئی۔ میدان والی تمام جھونپڑیوں میں پانی بھر گیا۔ یادی اور اس کے ماں باپ پھٹے ہوئے کپڑے اور سوپ سروں پر ڈالے ہمارا پھاٹک پیٹنے لگے۔ ممی سمجھ گئیں کہ وہ سب اندر آنا چاہتے ہیں۔

رات بھر پورچ کو گندہ کریں گے۔ صبح سارا فرش دھلوانا پڑے گا۔ اس لیے ممی نے ڈیڈی سے کہا کہ ان لوگوں کو چلانے دو۔ کوئی جواب مت دو۔ بارش تیز ہو گی تو خود ہی اور کہیں بھاگ جائیں گے مگر مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ پھاٹک توڑ کر اندر نہ آ جائیں۔ یادی کہتی ہے نا کہ یہ گھر ہمارا ہے۔

جس دن مہترانی ناغہ کرتی ہے تو ممی یادی کو بلوا لیتی ہیں۔ صحن میں جھاڑو لگانے، پودوں کو پانی دینے اور فرش صاف کرنے کے لیے۔ یادی کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی آ جاتے ہیں۔ بے حد گندے، ننگے اور ندیدے۔ وہ دونوں اپنی ٹوٹی رکابی لیے پھاٹک کے پاس بیٹھے رہتے تھے کہ کب یادی کا

کام ختم ہو اور ممی اسے رات کے بچے ہوئے باسی دال چاول دیں۔ ایک دن ممی نے یادی کو جو کھانا دیا اس میں ڈبل روٹی کے وہ ٹکڑے بھی شامل تھے جو صبح میں نے دانتوں سے کاٹ کر ممی کے ڈر سے پلیٹ کے نیچے چھپا دیئے تھے۔

ممی یہ تو میری جھوٹی ڈبل روٹی ہے یادی کو مت دیجئے۔

چپ۔ ممی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ممی جھوٹی ڈبل روٹی یادی کو کیوں دے رہی ہیں۔ ممی سے کھانا لے کر جب یادی اور اس کے بہن بھائی گیٹ کے پاس بیٹھ کر کھانے لگے تو میں نے یادی سے کہا۔ یادی! تو یہ توس مت کھا۔ جھوٹا ہے۔

جھوٹا ہے تو کیا بات جی؟ یادی کھانے میں جتی ہوئی تھی۔ آج کی ڈبل روٹی اتنی مزیدار تو نہیں تھی پھر یادی اسے اتنے مزے لے لے کر کیوں کھا رہی تھی۔ صبح تو مجھ سے یہ کسی طرح نہیں کھائی گئی۔ ممی نے سینڈوچ بنا کر دیا تو میں نے منہ میں رکھا اور پھر پلیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ میں ورانڈے کی ریلنگ پر چڑھا انہیں کھانا کھاتے دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے بھی خوب زور کی بھوک لگی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اپنی پلیٹ لے کر میں بھی ان کے ساتھ کھانے بیٹھ جاؤں۔ پھر جھوٹی ڈبل روٹی یاد آتی تو مجھے ابکائی آ گئی۔ ممی کتنی خراب ہیں۔ انہوں نے یادی کو جھوٹا کھانا کیوں دیا۔ کیا انہیں اس کی سزا ملے گی۔ یہ بات میں سکول جاتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا۔

پھر ہماری ہندی ٹیچر نے گاندھی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ غریبوں کے سیوک تھے۔ تو میں نے ٹیچر سے پوچھا میڈم کوئی آدمی غریبوں کو جھوٹی ڈبل روٹی کھلا دے تو کیا ہوگا۔

پاپ ہے یہ تو۔ کیا معلوم کسی دن غریب آدمی [illegible] بھی [illegible] ٹیچر نے سمجھایا مگر یادی بیچاری تو کبھی امیر نہیں بن سکتی۔ میں نے سوچا۔

شام کو ممی نے فریج میں سے نکال کر مجھے سیب دیا۔ ممی کل آپ نے یادی کو جھوٹی ڈبل روٹی کیوں دی۔

ہائے رام میرا بیٹا کتنا حساس ہے۔ ممی نے ہنس کر ڈیڈی سے کہا۔ کل سے اسے یہی فکر ہے۔ میرے چاند وہ لوگ جھوٹا کھانا کھانے کے عادی ہیں۔ یادی کی دادی پوری کالونی سے بھیک مانگ کر لاتی ہے۔ وہ بھی تو ہماری جھوٹن ہی ہوتی ہے نا؟

پھر ممی نے سیب کے چھلکے بالکونی سے نیچے پھینک کر کہا، اب تم تماشا دیکھو۔ یادی اور اس کے بھائی وہ سب چھلکے زمین سے اٹھا کر کھا لیں گے۔ یہ کمینے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹے۔

میرے ممی بڑی دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتی ہے۔ بڑے میٹھے انداز میں اس لیے میں ان کی بات مان لیتا ہوں۔

دوسرے دن میں سکول سے آیا تو ممی گھر میں نہیں تھیں۔ ڈیڈی نے بتایا کہ ممی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔

ٹرنک کال آیا تھا۔ اس لیے ممی دوپہر کے پلین سے بمبئی چلی گئی تھیں۔ اس لیے میں خوب رویا۔ روتے روتے سو گیا۔

آدھی رات کو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ یادی کی ماں درگا، ممی کے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور اپنے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر جھوٹا سیب ڈیڈی کے منہ میں رکھ رہی ہے۔

اچھا تو آج وہ آ گئی ہمارے گھر جھوٹی ڈبل روٹی کھلانے کا انتقام لینے! ڈر کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

www.urdukorner.com

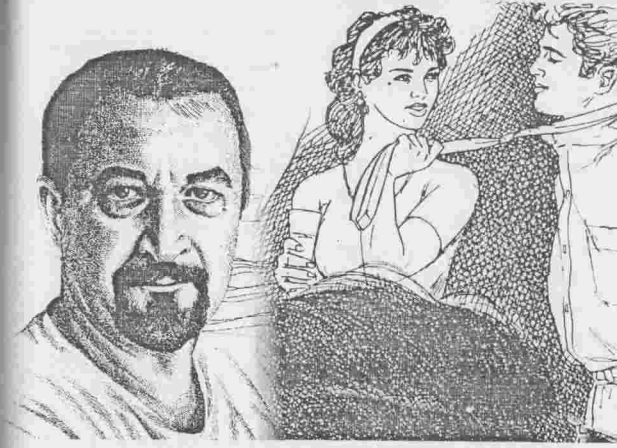

احتیاط

ایس۔ امتیاز احمد

یکسانیت زندگی کے لطف کو ختم کر دیتی ہے اور جب یکسانیت میں اذیت کا پہلو بھی شامل ہو تو نجات کی خواہش فطری ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ عورت اپنے شوہر سے تنگ آ گئی تھی۔۔۔!

ایک محروم تمنا کا حال جس نے ایک نوجوان سہارا ڈھونڈ لیا تھا۔۔۔!

''چھ بج گئے ہیں جمی! اب مجھے جانے دو!'' گلیڈس نے نیلی آنکھوں والے جمی کی آغوش میں مچلتے ہوئے کہا۔

''ابھی نہیں ڈارلنگ، ابھی نہیں!'' نوجوان جمی نے کہا۔ ''آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے؟''

''تمہیں معلوم ہے جمی مجھے جا کر ہربرٹ کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔'' ہربرٹ کا نام لیتے ہی گلیڈس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔ اس نے سوچا یہ نوجوان پتلا دبلا سمارٹ سا جمی! کاش یہ میرا شوہر ہوتا۔ ہربرٹ تو کسی گینڈے کی طرح موٹا ہے، بھدا ہے اور بدزبان جسے ہر وقت بس کھانے کی فکر ہی پڑی رہتی ہے۔ ''جمی ڈارلنگ! اگر اس کی واپسی پر میں گھر میں نہ ہوئی تو وہ پریشان ہوگا۔''

''اور اسے شاید تم پر شبہ بھی ہو!'' جمی نے کہا۔

گلیڈس دل ہی دل میں ہنس دی۔ اسے معلوم تھا کہ ہربرٹ اس پر شبہ نہیں کر سکتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گلیڈس اس کی نا مطمئن بیوی خود سے آٹھ نو سال چھوٹے ایک زیرِ تعلیم لڑکے سے رومان لڑا رہی ہوگی۔

''تم کس سوچ میں ڈوب گئیں گلیڈس؟'' جمی نے بڑے رومانی لہجے میں سرگوشی کی اور گلیڈس کے بالوں کو اُنگلیوں سے سلجھانے لگا۔

ایک کیف و سرور میں گھلی ہوئی لذت نے گلیڈس کو اپنی گرفت میں لے کر بادلوں کے اوپر پہنچا دیا۔ وہ گزشتہ دو ہفتے سے اس رومان کی کیف آفرینیوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ خوابوں کی جنت میں تھی۔ خواب حقیقت کا روپ دھار کر اس کے انگ انگ کو سرور بخش رہے تھے لیکن ابھی تک گلیڈس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ حقیقی دنیا میں خوشی حاصل کر رہی ہے۔ جمی ان کے مکان کے ایک حصے میں گزشتہ دو ماہ سے کرائے پر رہ رہا تھا۔ پندرہ دن قبل تک ان کے درمیان سرسری علیک سلیک ہی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی جمی نے ہربرٹ کی عدم موجودگی میں گلیڈس سے راہ و رسم و آشنائی پیدا کر لی تھی۔ گلیڈس اپنے بے ہنگم اور بدمزاج شوہر کی بدزبانی اور بے اعتنائی کی ماری ہوئی تھی۔ جمی کی پرجوش محبت اسے اپنے سیلاب میں تنکے کی طرح بہا کر لے گئی۔

ہربرٹ کا خیال آتے ہی گلیڈس نے اپنے آپ کو جمی کی گرفت سے رہا کرایا اور اس کے اصرار کے باوجود وہاں سے چل دی۔

باتھ روم میں جا کر اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے گلیڈس کو مدتوں بعد چہرے پر شادابی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہاں جمی کی محبت اسے بڑھاپے کی رہگزر سے واپس لے آئی تھی۔ مدتوں بعد اسے اپنے چہرے پر جاذبیت نظر آئی، بارہ برس بعد۔ ہربرٹ سے اس کی شادی ہوئے تیرہ برس بیت چکے تھے۔ ایک ہی سال کے بعد ہربرٹ کا وہ روپ سامنے آ گیا تھا جو بیویوں کے لیے ناقابل برداشت ہونے کے باوجود بھی انہیں سہنا ہی پڑتا ہے۔ ہربرٹ کی بدمزاجی اپنا روپ دکھانے لگی تھی۔

ہربرٹ کی بدمزاجی کے بارے میں سوچتے ہی گلیڈس باتھ روم سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ ریڈیو کا سوئچ آن کرنے کے بعد وہ پھرتی کے ساتھ کھانا تیار کرنے میں جت گئی۔ ہربرٹ کے واپس آنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اور اس کے آنے سے پہلے پہلے کھانا ہر صورت تیار ہونا چاہیے تھا۔ آج اسے پھلوں کا سوپ، روسٹڈ چکن، مٹن چانپ اور چیری کی پائی بنانا تھیں۔ چیری کی پائی ہربرٹ کی مرغوب ترین ڈش تھی۔ گلیڈس جانتی تھی کہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھنے سے پہلے وہ ساری پائی نگل چکا ہوگا۔ وہ تھا ہی اتنا چٹورا۔ اس کی دوسری عادتیں بھی اتنی گھٹیا تھیں کہ گلیڈس کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ شدید نفرت۔ گلیڈس کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے شوٹ کر دے۔ وہ خود پھانسی کے تختے پر نہیں جانا چاہتی تھی۔

کام میں مصروفیت کے ساتھ ساتھ وہ ریڈیو سے نشر ہونے والی موسیقی کی لے پر گنگنا بھی رہی تھی۔ دفعتہً اسے موسیقی کے رُک جانے کا احساس ہوا۔ پھر ایک اناؤنسر کی آواز گونجنے لگی۔ ''سامعین! ہم ایک اہم اعلان کرنے کے لیے موسیقی کے پروگرام کو عارضی طور پر روک رہے ہیں۔ شیرف کے آفس سے اعلان کیا گیا ہے کہ جاروس بیکری کے ایک ملازم البرٹ مینلو نے آج صبح بیکری کی تیار ہونے والی چیری پائی میں ایک گیلن چوہے مار زہر ملانے کا اعتراف کیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ البرٹ مینلو کافی عرصے سے ذہنی مریض رہا ہے اور آج صبح اسی پاگل پن کے دورے کے تحت اس نے یہ حرکت کی ہے۔

جن خریداروں نے آج صبح جاروس بیکری کی

www.urdukorner.com

تیار کردہ چیری پائی کے پیکٹ خریدے ہیں انہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اس چیری پائی کو استعمال کرنا مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کے پاس اس قسم کا کوئی پیکٹ ہو تو براہ کرم فوری طور پر شیرف کے دفتر میں اطلاع دیں۔ جاروس بیکری کی چیری ان دکانوں اور سپر مارکیٹوں میں فروخت ہوتی ہے۔

اس کے بعد اناؤنسر نے جو کچھ کہا گلیڈس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اب مزید کچھ سننے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ چیری پائی کا جو پیکٹ وہ خرید کر لائی تھی وہ سامنے ہی پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جاروس بیکری ہی کا تیار کردہ تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ بالآخر اس کی خاموش دعائیں قبول ہو چکی تھیں۔ اسے کسی غیبی قوت نے اپنے شوہر سے نجات حاصل کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ منصوبہ فوری طور پر بن سکتا تھا۔ اناؤنسر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مہلک۔۔۔ ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا خبر میں نے جو پیکٹ خریدا ہے وہ کل تیار کیا گیا ہو اور اس میں زہر کی آمیزش نہ ہو! مجھے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے! اس نے ریڈیو بند کر دیا اور جلدی سے گیراج میں چلی گئی۔ وہاں ایک شیلف پر مختلف قسم کی کیڑے مار دواؤں، مصنوعی کھاد، مکھی مار پاؤڈر وغیرہ کے ڈبے پڑے ہوئے تھے اور وہیں ایک ڈبا چوہے مار زہر کا بھی تھا۔ وہ اس ڈبے کو لے کر تقریباً دوڑتی ہوئی واپس کچن میں آئی۔ ہربرٹ کے آنے میں اب بہت تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ وہ کبھی کبھار وقت سے دو چار منٹ پہلے تو آ پہنچتا تھا مگر تاخیر سے کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ گلیڈس کو اس کے آنے سے پہلے پہلے جاروس بیکری کے خریدے ہوئے پیکٹ کی چیری پائی تیار کرنا تھی۔ اس پاگل آدمی کے ملائے ہوئے چوہے مار زہر کی مقدار کے بارے میں شک ہونے کی وجہ سے وہ چیری پائی میں اپنی جانب سے بھی مزید زہر ملا دینا چاہتی تھی تاکہ ہربرٹ کے کیم شحیم بدن میں زہر کی وافر مقدار پہنچ سکے۔

اس نے جلدی جلدی اپنا کام مکمل کیا۔ باقی اشیاء تو پہلے ہی تیاری کے آخری مراحل میں تھیں۔ چیری پائی کا ایک سلائس نکالنے کے بعد اس نے جاروس بیکری کے پیکٹ کو الماری میں پیچھے رکھ دیا تاکہ ہربرٹ کی نظر اس پر نہ پڑے۔ یہ عین ممکن تھا کہ ہربرٹ نے بھی جاروس بیکری کی چیری پائی میں زہر ملنے کی خبر سن لی ہو۔ اس صورت میں پیکٹ پر نظر پڑتے ہی وہ سب کچھ سمجھ جاتا۔ اب تو وہ اس سے کہہ سکتی تھی کہ یہ پائی اس نے گھر پر ہی بنائی ہے۔ اچانک اس کی نظر چوہے مار زہر کے ڈبے پر پڑی تو وہ چونک اٹھی۔ اوہ! اس نے سوچا میں بھی کتنی احمق ہوں یہ ڈبا تو ضائع کر دینا چاہیے جلد از جلد اس نے اسے بلڈنگ کے گاربیج ڈسپوزل میں ڈال کر اس کا سوئچ آن کر دیا۔ چند ہی لمحوں بعد گٹر کے اندر لگے ہوئے تیز دھار آلے نے ڈبے کو بے شمار ناقابل شناخت ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا اور اپنی گہرائیوں میں ہضم کر لیا۔ جرم کا ثبوت مکمل طور پر ضائع ہو چکا تھا۔

ہربرٹ آیا تو حسب معمول اس کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ گلیڈس نے پرسکون رہنے کی پوری کوشش کی۔ دونوں کھانا کھانے بیٹھے۔ ہربرٹ نے عادت کے مطابق ہر ڈش میں کوئی نہ کوئی نقص ڈھونڈ نکالا اور گلیڈس پر طنز کرتا رہا۔ ہر لمحہ وہ گلیڈس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا گیا۔

گلیڈس سویٹ ڈش کھانے کی عادی نہیں تھی اس لیے ہربرٹ ساری چیری پائی کھا گیا اور اس نے چیری پائی میں کوئی نقص بھی نہیں نکالا۔

بے ذائقہ اور بے بو چوہے مار زہر سے چیری پائی کے مزے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ چٹخارے لے لے کر کھاتا رہا اور گلیڈس کا خون اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ اسے کوئی ڈھارس تھی تو یہ کہ آج ناقابل برداشت اذیت کا آخری دن ہے۔ ہربرٹ کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، باتیں کرنا، اس سے پیار محبت کرنا، یہ سب کچھ کیسی اذیت کا باعث بنتا تھا اور آج یہ اذیت ختم ہونے والی تھی۔

اس نے فوری طور پر کچن سے بلکہ اس گھر سے ہی باہر جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ہربرٹ سے اپنی تمام تر نفرت کے باوجود اسے مرتے ہوئے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ وہ ایسے وقت واپس آنا چاہتی تھی جب ہربرٹ مر چکا ہو۔ ممکن ہو تو وہ واپسی پر کسی اور فرد کو بھی اپنے ہمراہ لانا چاہتی تھی تاکہ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا ایک گواہ مہیا ہو سکے۔ پہلے تو اس نے جمی کے پاس جانے کے لیے سوچا مگر پھر فوراً ہی یہ خیال مسترد کر دیا۔ بھلا وہ کس بہانے اس کے پاس جاتی۔ ویسے بھی وہ اس معاملے سے جمی کو بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہتی تھی تاکہ جمی بھی حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔ ہربرٹ کا قتل اسے بھی حادثاتی موت ہی محسوس ہو اور بعد میں وہ اپنی محبوبہ کو سہارا دینے کی خاطر اس سے شادی کر لے۔ اس موقع پر جمی کے پاس جانے سے پولیس کی نظروں میں جمی بھی مشکوک بن سکتا تھا۔

میری این! مجھے اس کے پاس چلا جانا چاہیے! گلیڈس نے سوچا۔ میری این ان کی ہمسائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گلیڈس نے بارہ سال تک اپنی جان پر کیا کیا ستم سہے ہیں۔ اگر میری این کو معلوم ہو جاتا کہ گلیڈس نے ہربرٹ کو ہلاک کر دیا ہے تو شاید وہ خوش ہوتی مگر کسی کا کیا بھروسہ! اس نے میری این کو اپنے پاس [illegible] کی بھی ایسی نہ تھی جہاں جا کر وہ ہربرٹ کو مرتے ہوئے دیکھنے کی اذیت سے بچ سکتی۔

آخر اس نے سوچ سوچ کر ایک کام نکال ہی لیا۔ وہ لان میں جا کر پودوں کو پانی دینے لگی۔ اچانک اس کی نظر مکان کے اس حصے کی طرف اٹھی جہاں جمی کی رہائش تھی۔ اسے کچن نظر آ رہا تھا جہاں جمی کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ گلیڈس کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اس نے ایک ہوائی بوسہ اُچھالا اور پھر کسی کام سے چلا گیا۔ گلیڈس کو مایوسی ہوئی۔ اُف یہ ہرجائی مرد! پتہ نہیں جمی کیوں چلا گیا ہے؟ پتا نہیں ہربرٹ کی انشورنس پالیسی اور جاروس بیکری پر مقدمہ چلا کر ممکنہ طور پر وصول ہونے والا ہرجانہ جمی کو کب تک میرا ساتھ دینے کے قابل رکھے گا؟ تقریباً ایک لاکھ ڈالر ہوں گے۔ گلیڈس نے سوچا۔

کافی دیر بعد جب وہ کچن کی پچھلی دیوار کے پاس گلاب کے پودوں کو پانی دے رہی تھی کچن سے موسیقی کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھوں سے واٹر پائپ چھوٹ گیا۔ ہربرٹ نے ریڈیو آن کر دیا تھا۔ اگر اب وہ خصوصی بلیٹن دوبارہ نشر کیا گیا تو؟ یہ سوچ کر ہی اس کے اعصاب تن گئے۔ چیری پائی کا اثر تو اب تک شروع ہو چکا ہو گا۔ ہربرٹ حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد کیا کرے گا؟ ڈاکٹر؟ پولیس؟ یا وہ مجھے قتل کر دے گا؟

پھر اسے کچن سے ایک درد میں ڈوبی ہوئی کراہ کی آواز آئی۔ اس کے بعد دھم کی آواز آئی۔ ہربرٹ فرش پر گرا تھا۔

"گلیڈس۔۔۔ گلیڈس۔۔۔!" ہربرٹ نے اسے پکارا۔ چند لمحوں بعد وہ دردناک آواز خاموش ہو گئی۔

گلیڈس فوری طور پر اندر نہیں گئی۔ وہ واٹر پائپ اٹھا کر پودوں کو پانی دیتی رہی۔

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

کافی دیر بعد جب وہ کچن میں آئی تو ہربرٹ واقعی مر چکا تھا۔ اس نے ہربرٹ کی نبض ٹٹولی اور دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ ہربرٹ زندہ نہیں تھا۔ گلیڈس کے لیے نفرتوں اور طعنوں اور تحقیر کے الفاظ سے تحریر کردہ ایک کتاب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھی۔ اب سکون ہی سکون تھا، آرام ہی آرام، راحت ہی راحت۔ گلیڈس نے ریڈیو بند کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے وجود کو دو مضبوط توجوان بازوؤں کی گرفت میں محسوس کرنے لگی، تصوراتی طور پر! کاش مستقبل میں وہ مضبوط بازو ہمیشہ میرا سہارا بنے رہیں۔ پھر گلیڈس نے پولیس کو فون کر دیا۔

پولیس مین جو چھریرے بدن اور نیلی آنکھوں والا تھا بڑے غور سے اس کی داستان سنتا رہا۔ اس نے گلیڈس کی باتوں میں برائے نام مداخلت کی۔ اسے دیکھ کر گلیڈس کو بار بار اپنا محبوب جمی یاد آ رہا تھا۔

اس کا بیان مختصر اور واضح تھا اور انداز بیان بڑا برجستہ! اس کے کہنے کے مطابق ہربرٹ حسب معمول دفتر سے واپس آتے ہی ڈنر کھانے میں لگ گیا تھا۔ ہربرٹ دیر تک کھاتے رہنے کا عادی تھا۔ گلیڈس نے تھوڑا سا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا تھا اور پھر لان میں پانی دینے کے لیے باہر چلی گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ واپس اندر گئی تو اس کا شوہر مُردہ حالت میں فرش پر دراز تھا۔

''آپ نے فوری طور پر پولیس کو فون کر دیا؟'' پولیس مین نے کہا۔

''جی ہاں، اسی وقت!'' گلیڈس نے جواب دیا۔

''لیکن آپ نے پولیس سے پہلے ڈاکٹر کو فون کیوں نہیں کیا۔''

''ہربر۔۔۔ ہربرٹ سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔''

''یہ تو ضروری نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بھی فوری طور پر کسی کے مرنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' پولیس مین نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

گلیڈس نے نروس ہو کر نظر چرا لی۔ پتا نہیں یہ پولیس مین کیا سوچ رہا ہے گلیڈس کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔

''آپ کے شوہر کے چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ زہر خورانی کا کیس ہے، نیلا پڑا ہوا ہے چہرہ!''

گلیڈس کا بدن زور سے لرز اٹھا۔

''اوہ محترمہ! معاف کیجیے گا میرا مطلب آپ کو خوفزدہ کرنا نہیں تھا لیکن۔۔۔ لیکن چند سوالات کا جواب آپ ہی دے سکیں گی۔ کیا کسی وجہ سے آپ کے شوہر نے دانستہ طور پر تو زہر نہیں کھا لیا؟''

''اوہ نہیں، ہرگز نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں زہر موجود ہی نہیں ہے۔''

''کیا چوہے مار زہر بھی نہیں ہے؟'' پولیس مین نے سوال کیا۔ گلیڈس جواب دینے میں ہچکچائی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ شخص میرے لیے کسی قسم کا پھندا تیار کر رہا ہے۔ شاید اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ اس نے متذبذب ہو کر کہا۔ ''مجھے۔۔۔ مجھے اس بارے میں یقین نہیں ہے۔ ممکن ہے چوہے مار زہر کہیں پڑا بھی ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر نہیں! ہربرٹ گھر میں ایسی چیز نہیں رکھ سکتا تھا۔''

''تقریباً ہر گھر میں ہزاروں قسم کی زہریلی دوائیں موجود رہتی ہیں محترمہ!'' پولیس مین نے کہا۔ ''جراثیم کش ادویات، مصنوعی کھاد، نیند کی گولیاں! اس طرح کی چیزیں ہر گھر میں ہوتی ہیں۔'' پولیس مین نے خاموش رہ کر گلیڈس کے بولنے کا انتظار کیا۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو پولیس مین نے اچانک کہا۔ [illegible]

www.urdukorner.com

سنا تھا محترمہ؟''

''خصوصی بلیٹن؟ کس بارے میں؟'' گلیڈس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''جاروس بیکری کی گڑبڑ کے بارے میں!''

''نہیں تو، میں نے آج سارا دن ریڈیو آن ہی نہیں کیا۔'' گلیڈس نے کہا، اور پھر فوراً ہی گھبرا بھی گئی وہ سوچ رہی تھی، شاید ریڈیو کی باڈی پر ہاتھ لگا کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ وہ ابھی تک گرم ہے یا نہیں! اگر وہ اس طرح پکڑی گئی تو؟ مگر پولیس مین نے ریڈیو کی طرف دیکھا تک نہیں تھا جس سے گلیڈس کو قدرے اطمینان ہوا۔

''گویا آپ جاروس بیکری والی گڑبڑ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟''

''نہیں مجھے واقعی کچھ نہیں معلوم! آخر بات کیا ہے؟'' گلیڈس کی اداکاری عروج پر تھی۔

''میں بتاتا ہوں۔ آج سہ پہر سے شام تک ریڈیو پر وقفے وقفے کے ساتھ کئی خصوصی بلیٹن نشر کیے گئے تھے جن کے ذریعے لوگوں کو جاروس بیکری کی تیار کردہ چیری پائی میں چوہے مار زہر ملا ہونے کی خبر دے کر محتاط رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ آپ نے کوئی ایسا بلیٹن نہیں سنا؟''

''نہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ آج دن بھر میں نے ریڈیو سنا ہی نہیں۔'' گلیڈس نے کہا اور پھر اچانک مصنوعی طور پر متعجب ہو کر بولی ''مگر۔۔۔ مگر ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے؟ کہ۔۔۔ کہ چیری پائی میں زہر ملا ہوا تھا؟ آہ۔۔۔ ہربرٹ نے بھی تو چیری پائی ہی کھائی تھی، جاروس بیکری کی تیار کردہ! تو گویا۔۔۔ گویا آپ کا مطلب ہے کہ میرے شوہر کا انتقال اس بیکری کی بداحتیاطی کی وجہ سے ہوا ہے؟ آہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں ان پر مقدمہ دائر کر دوں گی۔۔۔ میں۔۔۔''

''محترمہ! آپ کے شوہر کی ہلاکت کا سبب ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔''

''نہیں ہوا؟ کیسے نہیں ہوا؟ ابھی آپ خود ہی تو۔۔۔''

''ہاں میں نے کہا تھا کہ چیری پائی میں زہر ملا ہونے کے بارے میں کئی خصوصی بلیٹن نشر کیے گئے ہیں لیکن ابھی ایک گھنٹے قبل صورتحال کی وضاحت کے لیے ایک اور خصوصی بلیٹن بھی نشر کیا گیا تھا۔ جس آدمی نے زہر ملانے کا اعتراف کیا تھا، شیرف کے خیال میں اس نے محض اپنی پبلسٹی کرانے اور اخبار میں اپنی تصویر چھپوانے کے لیے یہ جھوٹا بیان دیا تھا۔ شیرف کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس شخص کا تو چیری پائی بنانے والے کارکنوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور اس کے لیے ایسی کوئی حرکت کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ وہ شخص محض اپنی تصویر چھپوانے کی خاطر۔۔۔''

''مگر۔۔۔ مگر ریڈیو پر تو۔۔۔؟'' گلیڈس بیہوش ہونے کے قریب تھی۔ ''ہاں ریڈیو پر بلاشبہ فوراً ہی زہر کی آمیزش کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ دراصل تحقیقات کی تکمیل تک شیرف شہریوں کی جان کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ ہم اس بیکری کے بے شمار گاہکوں سے چیری پائی کے پیکٹ واپس حاصل کر کے اطمینان حاصل کر چکے ہیں کہ وہ شخص جھوٹا تھا۔ بہرحال ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے شوہر کی ہلاکت کا اصل سبب تو میڈیکل رپورٹ آنے پر ہی پتا چل سکے گا۔''

اس لمحے گلیڈس نے اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھ کر سوچا کہ یہ شخص جمی سے کس قدر ملتا ہے مگر اس کی آنکھیں تو مجھے قاتل قرار دے رہی ہیں۔۔۔ کاش۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

اشارہ

ستار طاہر

یوروگوائے سے ہوریسیو کیوروگا کی مختصر، دلچسپ کہانی
ایک خوش گل کی نامہ بری، اسے مردوں سے شکایت تھی

جناب! میں یہ چند سطور آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ انہیں اپنے نام سے شائع کرا دیں گے۔ میں نے یہ درخواست آپ سے اس لیے کی ہے کہ میں جانتی ہوں، اگر میں نے اپنے نام سے یہ تحریر بھیجی تو اسے کوئی شائع نہیں کرے گا۔

پچھلے پانچ برسوں سے میں ٹرام پر ملازم ہوں اور اپنی اس ملازمت کی وجہ سے مجھے دن میں ایک

www.urdukorner.com

مرد اور عورت کی نفسیات

ایک ماہر نفسیات نے مردوں اور عورتوں کے متعلق دلچسپ حقائق جمع کیے ہیں۔

☆ مرد دیا سلائی جلاتے وقت سلائی اپنی طرف رگڑتا ہے جبکہ عورت عموماً مخالف سمت میں رگڑتی ہے۔

☆ مرد لباس کے سلسلے میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں اور عورتیں لباس میں انفرادیت قائم رکھنے پر زور دیتی ہیں۔

☆ مرد اپنے ناخن دیکھنے کے لیے مٹھی بند کرتا ہے لیکن عورت اُلٹی طرف ہاتھ پھیلا کر دیکھتی ہے۔

☆ مرد نسوار استعمال کرنے کے بعد اسے تھوکتے ہیں جبکہ عورتیں انگلی سے منہ صاف کرتی ہیں۔

☆ مرد عموماً عورت کو ان کاموں سے روکتا ہے جو وہ کرتی ہے لیکن عورت مرد کو وہ کام کرنے کو کہتی ہے جو وہ نہیں کرتا۔

☆ عورت اگر راستہ بھول جائے تو کسی سے راستہ پوچھتی ہے مگر مرد خود ہی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(مرسلہ: تسنیم انور سلیمی)

ہی روٹ پر چلنے والی ٹرام پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ میری عمر بیس برس ہے۔ میں لمبے قد کی لڑکی ہوں اور دبلی بھی نہیں ہوں۔ میری جلد بھی زیادہ بھوری یا سیاہ نہیں ہے۔ میرا دہانہ چوڑا ہے لیکن بدنما نہیں اور آنکھیں بھی چھوٹی نہیں ہیں۔ آپ اچھی طرح مردوں کی عادت جانتے ہیں کہ وہ ٹرام پر سوار ہوتے وقت عورتوں کو ضرور گھورتے ہیں اور پھر سوار ہو کر ان کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں کیونکہ میں ان کے چہروں سے ان کے دل کی کتاب پڑھنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ پانچ برس کے مسلسل تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ بھانت بھانت کا مرد میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے اور ان کی آنکھوں نے جس طرح سے مجھے گھور گھور کر دیکھا ہے اس سے میں ہر چہرے اور نظر کو پہچان سکتی ہوں۔ اس لیے جب کوئی مرد ٹرام میں میرے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ارادے کو چھپانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو میں صاف بھانپ جاتی ہوں کہ وہ کیا چاہتا ہے اور یہ کہ جو مرد میری قربت حاصل کرنے کے ارادے سے میرے قریب آ رہا ہے وہ کون ہے، کوئی شرمیلا طالب علم یا کوئی جیب کترا۔

مرد بڑے چالاک اور حیلے باز ہوتے ہیں، پہلے تو وہ یہ حرکت کرتے ہیں کہ خود کو لڑکھڑاتے ہوئے دکھاتے ہیں جیسے ٹرام میں ان سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھا جا رہا یا پھر پھسلنے کا حیلہ بناتے ہیں کہ پاؤں پھسل گیا اور قریب آ گرے ہیں۔ میں تو مردوں کے ایک ایک قدم کی اٹھان سے ان کی فطرت کا اندازہ لگا لیتی ہوں کہ اب وہ قدم آگے بڑھا کر، پاؤں ملا کر ردعمل کا اندازہ کرنا چاہے گا، پھر ٹانگ سے ٹانگ ٹکراؤ اور پھر اس کے ردعمل کا انتظار۔ مردوں کے قدم تو اسی طرح کی عیاری میں مصروف رہتے ہیں۔

اور چہرہ! جی ہاں، مجال ہے کہ وہ اپنے چہرے سے یہ ثابت ہونے دیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں ارادی طور پر کر رہے ہیں۔ بلکہ تاثرات سے عاری احمقانہ سا چہرہ بنائے کھڑے نظر آئیں گے لیکن لڑکی نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا تو پھر وہ چوکنے ہو جائیں گے اور جیسی بھی صورتحال ہو گی سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ پہلے پہل میں مردوں کی ان حرکتوں سے بڑا لطف اٹھاتی رہی بے چارے رہتے تو ناکام ہی تھے کیونکہ میں نے [illegible]

حرکتوں سے بیزار ہونے لگی، مگر ان حرکتوں سے آنکھیں چرا بھی نہ سکتی تھی کہ ٹرام پر میں ملازم ہوں، اور یہ بات میں آپ کو بتا چکی ہوں۔

اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے دوران روزانہ ہی میں مردوں کی فطرت کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں اور میرے ساتھ سترہ بار ایسے واقعات ہوئے ہیں جب مردوں نے شبہ پا کر ذرا اور قریب آنے کی کوشش کی تو میں نے انہیں بڑی صفائی سے غچہ دے دیا۔ کسی کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر میں ہلکے سے مسکراتی رہی...... جب قدم نے چھوٹا سا فاصلہ اور بھی طے کر لیا تو میری مسکراہٹ تیز ہو گئی۔ اب مرد کیا کرتا ہے، وہ بے نیاز ہو کر اوپر دیکھتے ہوئے آنکھیں جھپکتا ہے، پھر ٹرام کے فرش پر نظر ڈالتا ہے، اس کے بعد عورت کی طرف دیکھتا ہے، یا یوں کہیے کہ ان سترہ مردوں میں سے کسی ایک نے یہ تمام حرکتیں کر کے میری طرف دیکھا ہے۔ میرے چہرے پر کسی قسم کی بیزاری یا ناراضی کو نہ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ اس کے پاؤں اور میرے پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور پھر اپنا پاؤں اس حساب سے اُٹھاتا اور آگے بڑھاتا ہے کہ اس کا پاؤں میرے پاؤں یا ٹانگ سے چھو بھی جائے اور میں یہ بھی سمجھوں کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے اور اس سے پہلے کہ جب مرد فاصلے کا اندازہ لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائے اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے تو میں اپنا پاؤں دور کھینچ چکی ہوتی ہوں، پھر نتیجے میں اس مرد کے چہرے کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ وہ نظریں اُٹھا کر مایوسی سے میری طرف دیکھتا ہے۔ ادھر میری آنکھوں میں اس کے لیے انتباہ ہوتا ہے۔ ایک واضح انتباہ! بعض مردوں کے چہرے اُتر جاتے ہیں، بعض کھسیا جاتے ہیں، بعض فوراً نظریں جھکا لیتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے غصے اور ناراضی سے گھورنے بھی لگتے ہیں اور بعض تو اس اہانت کا بھی برا نہیں مانتے اور بے دھڑک قدم آگے بڑھا دیتے ہیں۔

میں یہ سطور آپ کو اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ اسے اپنے نام سے بنا سنوار کر شائع کر دیں تاکہ مردوں کو کچھ عقل آ سکے اور وہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں۔ میں ٹرام کے محکمے میں ملازم ہوں اور میرے پاس خاصی نقدی بھی ہوتی ہے اور نقدی کی حفاظت کے لیے محافظوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ آپ کی تحریر میں جان ہے۔ آپ کا پرچہ کثیرالاشاعت ہے۔ ان مردوں کو مطلع کر دیجیے کہ وہ محافظ جو نقدی کی حفاظت کرتے ہیں وہ عورتوں کی حفاظت پر بھی مامور ہیں۔ وہ عورتیں جو میرے جیسی ہیں، لمبے قد کی، رنگ نہ زیادہ سیاہ نہ سفید، دہانہ چوڑا مگر بدنما نہیں، آنکھیں بھی چھوٹی نہیں۔

م ر

محترم خاتون! آپ نے جو مراسلہ بھیجا ہے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ سترہ بار آپ نے مردوں کو غچہ دیا اور ہر روز آپ کا سابقہ نت نئے مردوں اور ان کی حرکتوں سے پڑتا ہے۔ آپ کا مراسلہ پڑھ کر میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہے، کیا آپ اس کا جواب دینا پسند کریں گی؟ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کا اپنا بھی یہ جی نہیں چاہا کہ آپ کسی مرد کے پاؤں سے اپنا پاؤں بڑھائیں؟

ح ق

جناب! سچی بات یہ ہے کہ میری زندگی میں ایک بار ایسا ہوا کہ میرے دل نے مجھے ترغیب دی کہ میں ایک شخص کے پاؤں سے پاؤں بڑھا دوں۔ میں نے اپنا پاؤں اٹھایا اور اس مرد کے پاؤں سے بڑھا دیا۔ جناب، وہ مرد آپ تھے لیکن آپ نے میرے اشارے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

www.urdukorner.com

اقوالِ حضرت علی رضی اللہ عنہ

☆ کشادہ روی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے اور خندہ پیشانی سے رہنا شریف کی خصلت ہے۔
☆ شکر نعمتوں کا قلعہ اور حیا پوری شرافت اور لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اپنی نعمتوں کو بڑھانا ہے۔
☆ ہوشیاری نہایت مضبوط راہ ہے اور غفلت نہایت موذی دشمن ہے۔
☆ عقل فہم کا ذریعہ اور جہل مذمت کا باعث ہے۔
☆ عقل نہایت مستحکم اور مضبوط اساس اور پرہیزگاری نہایت بہترین لباس ہے۔
☆ بہشت ان لوگوں کو ملتی ہے جو نیک کاموں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔
☆ دوزخ ایسے لوگوں کا آخری مقام ہے جو نیک کاموں میں کوتاہی کرتے ہیں۔
☆ عقل نہایت بہترین نعمت اور جہالت سخت موذی دشمن ہے۔
☆ علم بہترین شرافت اور عملِ نیک، نہایت اچھا خلیفہ اور جانشین ہے۔
☆ نفاق شرک کا بھائی اور غیبت سخت برا جھوٹ ہے۔
☆ جہالت سے پاؤں پھسلتا ہے اور ظلم سے نعمتیں دور ہو جاتی ہیں۔
☆ زہد دین کی جڑ اور سچائی پرہیزگاروں کا لباس ہے۔
☆ دین نہایت مضبوط ستون، پرہیزگاری بہت اچھا توشہ ہے۔
☆ طاعت نہایت محفوظ سامان اور قدرت الٰہی میں فکر کرنا اچھا سہارا ہے۔
☆ پرہیزگاری اچھا ساتھی اور اجمل مضبوط قلعہ ہے۔
☆ عقل سوچ اور فکر کو درست کرتی اور عدل مخلوق کو سنوارتا ہے۔
☆ عذر پیش کرنا عقلمندی کی دلیل، بردباری فضیلت کا سرنامہ ہے اور معافی بزرگی کی نشانی ہے۔
☆ حماقت نہایت برا ساتھی اور برائی نہایت برا دروازہ ہے۔
☆ عقلمند وہ ہے جو اپنی زبان (لغویات سے) بند رکھے اور ہوشیار وہ ہے جو زمانے کی رفتار پر چلے۔
☆ بری بات کہنے کا انجام برا ہے اور جواب سے عاجز رہنے کی نسبت گنہگار اور بے زبان ہونا اچھا ہے۔
☆ طاعت عقلمندوں کیلئے گویا مال غنیمت ہے (کہ خوب شوق سے حاصل کرتے ہیں) اور علماء لوگوں کے حاکم ہیں۔
☆ مرد آدمی مال کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور مال وہی ہے جو آدمی کے کام آئے۔
☆ سخاوت شرافت طبع کا ثمرہ اور منت رکھنا نیکیوں کو برباد کرنا ہے۔
☆ زندگانی کبھی میٹھی اور کبھی کڑوی ہوتی ہے اور دنیا دھوکہ دیتی اور نقصان پہنچاتی ہے۔
☆ متوسط طور پر خرچ کرنے سے تھوڑا مال بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور فضول خرچی اور زیادہ خرچ کرنے سے بہت مال بھی ختم ہو جاتا ہے۔
☆ زہد یقین کی بنیاد اور راستی دین کا سر ہے۔

کوما کہانیاں

مرزا ظفر بیگ

اس نے اگلے پانچ روز آئی سی یو میں گہری بیہوشی کی حالت میں گزارے لیکن اس کے بعد ہی اس نے Mamma Mia کے الفاظ گنگنانے شروع کر دیئے۔ اس نے یہ فلم دیکھی تھی جس میں میرل اسٹریپ نے اداکاری کی تھی۔ جلد ہی Layla بغیر کسی امدادی چیز کے اپنے آپ سانس لینے لگی۔

کوما سے جاگ اُٹھنے والوں کی کہانیاں، جاگنے کے بعد اگلی زندگیاں بدل گئیں

کوما ایک ایسی کیفیت ہے جس میں متاثرہ فرد طویل اور گہری بیہوشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ عام طور سے یا تو کسی بیماری کا نتیجہ ہوتی ہے یا پھر کسی چوٹ وغیرہ کے باعث ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات کوما کے مریض کبھی اپنی نیند سے نہیں جاگتے اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں اور بعض اوقات کچھ

www.urdukorner.com

عرصے بعد وہ جاگ اُٹھتے ہیں۔ ذیل میں ہم کوما سے جاگ اُٹھنے والے کچھ افراد کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں جن میں کوما نے بہت اہم لیکن ناقابل یقین تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

کوما ایک یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ''گہری نیند''۔ طب میں کوما طویل بیہوشی کی ایک ایسی کیفیت کو کہا جاتا ہے جو چھ گھنٹے سے زیادہ مدت تک جاری رہ سکتی ہے۔ اس دوران متاثرہ فرد کو کسی بھی صورت جگایا نہیں جا سکتا۔ عام طور سے کومے میں جانے والا فرد جگانے کی کوشش کے جواب میں کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کرتا چاہے اسے تکلیف دہ انداز سے ہی جگانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ کومے میں جانے والا فرد نہ کسی تیز شور سے جاگ سکتا ہے اور نہ ہی تیز روشنی اسے بیدار کر سکتی ہے۔ اس کے سونے اور جاگنے کا نارمل سائیکل ختم ہو جاتا ہے اور وہ ارادی حرکات کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ کوما میں مبتلا فرد کو comatose کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

Scale Glasgow COma کے مطابق: ''کنفیوژن یا منتشر خیالی کے شکار فرد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوما کی ہلکی ترین شکل میں مبتلا ہے۔''

انسان کوما میں کیوں اور کیسے مبتلا ہوتا ہے؟ اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں، جن میں درج ذیل شامل ہیں: نشہ (جیسے شراب نوشی یا منشیات کا استعمال، عام دواؤں یا تجویز کردہ دواؤں کا غلط یا حد سے زیادہ استعمال) میٹابولک ابنارملٹیز، سینٹرل نروس سسٹم کی بیماریاں، عصبیاتی چوٹیں، جیسے اسٹروکس یا hemiations, hypoxis, hypothermia, hypoglycemia یا شدید ترین چوٹیں، جیسے سر پر لگنے والی شدید ضرب جو کسی گاڑی کے اُلٹنے یا بلندی سے گرنے سے لگی ہوں۔ بعض اوقات مریض کو جان بوجھ کر دواؤں کے ذریعے کوما کی کیفیت میں منتقل کیا جاتا ہے تاکہ دماغ کی شدید چوٹوں کے بعد دماغ کی کارکردگی کو تحفظ دیا جا سکے یا مریض یا مریضہ کو بیماری یا اس سے صحت یابی کے دوران مزید شدید ترین تکالیف سے بچایا جا سکے۔

متاثرہ فرد کے شعور و ادراک کو برقرار رکھنے کے لیے دو اہم عصبیاتی اجزاء کا بالکل ٹھیک ٹھیک کام کرنا ضروری ہے۔ پہلا cerebral cortex یا گرے یا خاکستری رنگ کا مادہ ہے جو دماغ کی بیرونی پرت کو ڈھکے رکھتا ہے اور دوسرا ایک اسٹرکچر ہے جو brainstem میں واقع ہے۔ اسے reticular activating system کہتے ہیں اور مختصراً اسے RAS کہا جاتا ہے۔ ان مذکورہ بالا اجزاء میں سے کسی ایک یا دونوں کی انجری متاثرہ فرد کو کومے کی حالت میں پہنچا سکتی ہے۔ انسانی cortex گہنے اور سخت خاکستری مادے کا گروپ ہے جو نیورونز کے نوڈلس پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے axons بعد میں سفید مادہ تشکیل دیتے ہیں اور یہ کائنات کے ادراک کا بھی ذمہ دار ہے اور یہ sensory input یا حساسیت کو thalamic pathway کے ذریعے ریلے کرتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام عصبیاتی افعال کا انچارج ہے، سادہ رفلیکسز سے لے کر پیچیدہ افکار تک۔ دوسری جانب Reticular activating system (RAS) برین اسٹیم میں ایک زیادہ ابتدائی اسٹرکچر ہے جو بہت مضبوطی کے ساتھ reticular formation (RF) سے منسلک ہے۔ یہ ایسا انٹیگریٹڈ اسٹرکچر ہے جو بیداری اور سونے جاگنے کے چکر اوور کے لیے اہم ہے۔

کوما میں جانے والے مریض کے لیے ضروری ہے کہ اس کے bilateral cerebral cortices کے اشتعال کو بھی چیک کیا جائے اور ساتھ ساتھ reticular activating system (RAS) پر بھی نظر رکھی جائے۔

☆☆☆

تین سالہ بچی گنگناتی ہوئی کوما سے جاگ اٹھی

تین سالہ Layla Towsey کو گردن توڑ بخار ہوا تو وہ کوما میں چلی گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹروں نے اس کی فیملی سے کہا کہ اسے الوداع کہنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ اس کے زندہ بچنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے مگر یہ تین سالہ بچی ابھی دنیا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ اچانک ہی کوما سے اس طرح جاگ اٹھی کہ اس نے Abba کا اپ ہٹ Mamma Mia گانا شروع کر دیا۔ اس نے پانچ روز کوما میں گزار دیے تھے جس کے بعد ہی اس میوزیکل ریکوری نے اسے جگا دیا۔ Layla کی ماں کیٹی ان اذیت ناک دنوں میں صرف یہی سوچتی رہی کہ اس کی معذور اور لاچار بیٹی کیسی ہو گی اور اس کی زندگی کیسے گزرے گی۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کے بعد بتایا تھا کہ Layla گردن توڑ بخار کا شکار ہوئی ہے اور ساتھ ہی وہ دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کی سوزش وجلن یعنی meningococcal septicamia میں بھی مبتلا ہے۔ اس کے بعد اس نے اگلے پانچ روز آئی سی یو میں گہری بیہوشی کی حالت میں گزارے لیکن اس کے بعد ہی اس نے Mamma Mia کے الفاظ گنگنانے شروع کر

دیئے۔ اس نے یہ فلم دیکھی تھی جس میں میرل اسٹریپ نے اداکاری کی تھی۔ جلد ہی Layla بغیر کسی امدادی چیز کے اپنے آپ سانس لینے لگی۔ اب اس خوفناک تجربے کی واحد یاداس کی ٹانگوں پر بلڈ پوائزننگ کے دھبے یا نشان ہیں۔

کوما سے جاگنے کے بعد اس بچی نے سگریٹ و شراب نوشی شروع کر دی

تین سالہ لڑکی Ya Wen کے ساتھ سڑک پر ایک حادثہ پیش آیا جس میں ایک تیز رفتار وین نے اسے ٹکر ماردی جس میں اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ کوما میں چلی گئی۔ اسے شدید چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پانچ روز تک کوما میں رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو ایک بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ نہ جانے کیوں اچانک ہی اسے سگریٹ نوشی کا شوق ہو گیا اور وہ شراب بھی خوب پینے لگی۔

Ya Wen کی ماں Gao کا کہنا ہے کہ وہ اچانک ہی کسی بڑے بالغ فرد کی طرح سلوک کرنے لگی تھی۔ اس کی ماں نے اسے دیکھا کہ وہ واش روم میں چھپ کر اپنے ڈیڈی کے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال نکال کر پی رہی تھی۔

شروع میں اس نے اپنے ڈیڈی کے سگریٹ چرا چرا کر کام چلایا اور بعد میں ایک مقامی دکان سے ادھار خریدنے لگی۔ اس کی ماں Gao ایک شیلٹر میں رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اب میری بیٹی کو سگریٹ نوشی کا عادی ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اب تو لباس کے حوالے سے اس کی پسند اور انتخاب بھی بدل چکا ہے۔ وہ صرف مردانہ (لڑکوں والے) کپڑے ہی پہنتی ہے۔ Ya Wen کے باپ نے اب سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے اور یہ فیملی شہر کی دوسری جانب نقل مکانی کر چکی ہے لیکن

www.urdukorner.com

آج بھی Ya Wen کی نظر جب کبھی سگریٹ پر پڑتی ہے تو وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے رونے اور مچلنے لگتی ہے۔

اس نے کوما سے نکلتے ہی ماں سے کہا: ''دفع ہو جاؤ''

ایک ماں نے پورے 41 دن تک اپنے شدید زخمی بیٹے کے کوما سے باہر آنے کا انتظار کیا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اس بدقسمت ماں کو یہ الفاظ سننے پڑے: ''دفع ہو جاؤ۔''

دراصل اس نوجوان کا بات کرنے کا یہی انداز تھا۔ اس طرح وہ یہ جتانا چاہتا تھا کہ میں ٹھیک ہوں اور مزید ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جوانے ہاپکنز نامی یہ ماں ہسپتال میں اپنے بیٹے Joey کے بستر کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ دن رات منتظر رہتی کہ شاید اس کا بیٹا کچھ بولے۔ جب سے اس کے بیٹے نے کار ایکسیڈنٹ میں موت کو شکست دی تھی، اس وقت سے وہ کوما میں تھا۔ آخر قدرت کو اس پر رحم آ گیا اور 22 سالہ Joey کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس کی زبان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

بے چین ماں جوانے ہاپکنز نے بے قراری کے عالم میں آگے جھک کر بیٹے کے الفاظ سننے کی کوشش کی۔ بیٹے نے جو الفاظ کہے، وہ ماں نے سن لیے لیکن ماں تھی ناں، یہاں بھی بیٹے کا بھرم رکھتے ہوئے بولی: ''یہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ابھی الفاظ کو صحیح طرح ادا نہیں کر پا رہا۔''

Joey کا ایکسیڈنٹ جون کے مہینے میں پوسٹ ماؤتھ میں ہوا تھا جس میں اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی تھی اور کمر کی ہڈی بھی۔ اس وقت وہ ہسپتال میں ہے، اس کا علاج جاری ہے۔ اس کی ماں کو پورا یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔

جب ماں نے کوما میں جا کر بیٹے کو جنم دیا

سبھی نئی ماؤں کے لیے ان کے نومولود بچے کے گلابی گلابی روشن روشن چہرے کی پہلی جھلک ایک ناقابل فراموش منظر ہوتا ہے لیکن Valerie Leah کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب اس نے اپنے بیٹے آلیور کو جنم دیا اس وقت Valerie کوما میں تھی۔ Valerie کی عمر 35 سال ہے۔ وہ ماں بننے جا رہی تھی۔ جب اس کے حمل کی مدت 27 ہفتے ہوئی تو وہ سوائن فلو کا شکار ہو گئی۔ ڈاکٹروں کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ ماں اور بچے دونوں کو بچا لیں چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ Valerie کو کوما میں رکھ کر اس کا cesarian section کریں گے لیکن تین ہفتے بعد Valerie نے واقعتاً بچے کو جنم دیا جسے بالآخر وہ اپنی گود میں لینے کے قابل ہو گئی۔ Valerie اور اس کے شوہر کے دو بیٹے پہلے بھی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری اصل مشکلات اس وقت شروع ہوئیں جب ہماری پوری ہی فیملی H1N1 وائرس کا شکار ہو گئی۔ Valerie سب سے آخر میں اس سے متاثر ہوئی لیکن اس کی حالت کافی تیزی سے بگڑنے لگی۔ اسے سانس لینے میں بھی مشکلات آنے لگیں تو آخر کار اسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ جب اس پر علاج کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسے مکمل طور پر مسکن دواؤں کے زیر اثر لا کر لائف سپورٹ پر رکھا جائے۔

اس کے بعد بے بی آلیور سی سیکشن کے ذریعے دنیا میں آ پہنچا۔ اس کا وزن دو پونڈ دس اونس تھا اور اسے خصوصی نگہداشت کے لیے فوری طور پر سپیشل کیئر نرسری بھیجا گیا۔ ایک ہفتے بعد جب ماں کو [illegible]

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے چپٹے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اس کے بعد جب اسے یہ پتہ چلا کہ اس نے بیٹے کو جنم دیا ہے تو وہ بہت حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

کوما میں رکھنے کے بعد وہ سب کچھ بھول گئی

لزسائیکس کئی ہفتوں سے کوما میں تھی۔ اس کا دماغ ڈیمج ہو گیا تھا لیکن بہادر اور باہمت لزسائیکس نہ صرف بچ گئی بلکہ وہ موت سے لڑتے لڑتے آخر کار اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی ناقابل فراموش کہانی 2008ء میں اس وقت شروع ہوئی جب وہ Linthwaite کے علاقے Golcar میں اپنے گھر سے ایک شارٹ روٹ پر اپنی گاڑی چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی زندگی گویا اوندھی ہو گئی اور وہ مکمل طور پر منتشر ہو کر بکھر گئی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور وہ کس طرح کیا کرے گی۔ ایک ہفتے بعد 23 سالہ لزسائیکس کا سابقہ نہایت شدید اور طویل دوروں سے پڑا۔ اس کا پارٹنر شیلٹن اسے فوری طور پر ہڈرز فیلڈ رائل انفرمری لے گیا جہاں اس نے کئی دن گزارے جبکہ ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص کی کوشش میں لگے رہے۔ پھر انہوں نے لزسائیکس کو ایک تین ہفتے پر مشتمل کوما میں منتقل کرنے کا طاقت ور قدم اٹھایا تا کہ اس کی زندگی بچائی جا سکے۔ آخر کار اسے encephalitis تشخیص کی گئی، یہ وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے دماغ میں حدت و جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک وائرس یا انفیکشن یا مچھر کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ جب لز کوما سے باہر نکلی تو اس کی یادداشت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ اب تو وہ سادہ ترین کام تک نہیں کر پا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے چلنا پھرنا اور باتیں کرنا بھی دوبارہ سیکھنا تھا۔

لز نے 11 ماہ لیڈز اور یارک کے سپیشل سینٹرز میں گزارے جہاں برین ڈیمج کے مریض بھی رکھے گئے تھے۔ ان میں حاضر پولیس افسر اور افغانستان کے فوجی بھی شامل تھے۔ لز آج بھی شارٹ ٹرم میموری لاس میں مبتلا ہے اور بعض معاملات میں اس میں اعتماد کی کمی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی ریکوری سٹیپس نے اس کے لیے Kirklees Community Adult Learning Awards کی نامزدگی جیت لی ہے۔

وہ ''آئی لو یو'' کہتے ہی کوما میں چلی جاتی ہے

ایک پرخلوص اور جاں نثار ماں ایک عجیب و غریب بیماری سے لڑ رہی ہے جس کی وجہ سے وہ جب بھی اپنے بچوں سے 'آئی لو یو' کہتی ہے تو کوما میں چلی جاتی ہے۔ اس ماں کا نام Wendy Richmond ہے اور اس کی عمر 53 سال ہے۔

وہ جب بھی جذباتی ہوتی ہے یا ہنسنا یا رونا چاہتی ہے تو ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے جسے "waking sleep" کہنا چاہیے۔ یہ کیفیت اسے ہر مرتبہ پیرالائزڈ کر دیتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے علاج میں دی جانے والی دوائیں کافی مہنگی ہیں اور ان کے لیے مقامی NHS trust بھی فنڈز فراہم نہیں کرتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے کولیپسنگ سے بچنے کے لیے اپنے جذبات و احساسات کو بلاک کرنا ہوگا۔

مسز رچمنڈ کا تعلق پٹرمور، شیفیلڈ سے ہے۔

اپنے لڑکپن سے ہی وہ نیند کی بیماریوں cataplexy اور narcolepsy میں مبتلا رہتی آئی ہے لیکن ان کی تشخیص اس وقت ہوئی جب

وہ اپنی عمر کے 30ویں عشرے میں تھی۔ متاثرین کے حوالے سے تفصیلی اعداد و شمار نادر ہیں کیونکہ اکثر کیسوں کی یا تو شناخت ہی نہیں ہو پاتی یا ان کی رپورٹ ہی نہیں ہوتی۔ تاہم ماہرین کا خیال ہے کہ برطانیہ میں narcoleptics کی تعداد 30,000 تک ہو سکتی ہے۔

کروشیائی لڑکی کوما سے جاگی تو جرمن زبان بولنے لگی

ساندرا ریلیک نامی 13 سالہ لڑکی کوما میں چلی گئی اور جب جاگی تو وہ ایک دوسری زبان بول رہی تھی۔ اس کیس نے ڈاکٹروں کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ کوما میں جانے سے پہلے وہ کروشیائی زبان بولتی تھی لیکن 24 گھنٹے کوما میں رہنے کے بعد جب وہ جاگی تو وہ کروشیائی زبان بولنے کے قابل نہیں رہی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ جرمن زبان نہایت عمدگی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول رہی تھی۔

اس کے ممی ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اس نے حال ہی میں اپنے سکول واقع Knin جنوبی کروشیا میں جرمن سیکھنی شروع کی ہی تھی۔ مقامی ہسپتال کے چیف Dujomir Marasovic نے اس حوالے سے کہا: ''ہم ابھی تک یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کوما میں کیوں گئی اور وہ بظاہر کروشیائی زبان بولنا کیسے بھول گئی۔''

دادا کوما سے نکلنے کے بعد جوان ہو گئے

Frail Angeio De Luca ایک پیار کرنے والے اور شفیق دادا ہیں جن کی عمر 81 سال ہے۔ Biasca سوئٹزر لینڈ میں رہتے ہیں۔ ایک روز وہ آلوچے کے درخت پر چڑھے

کراچی میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

گلستان نیوز ایجنسی

فریر مارکیٹ۔ فریر روڈ کراچی سے رابطہ کریں)۔ ☎:7733755,7762443

Email: sayyaradigest@gmail.com

لاہور آفس: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن۔ ☎: 042-7245412

www.urdukorner.com

ہوئے تھے کہ نہ جانے کیسے وہ نیچے زمین پر گر گئے جس کے فوری بعد وہ کوما میں چلے گئے اور پورے چار روز تک کوما میں رہے۔ ہسپتال میں ان کا علاج بھی ہوا اور غالباً ایک آپریشن بھی لیکن جب وہ اس کیفیت سے باہر نکلے تو ان کی فیملی میں خوف و ہراس پھیل گیا کیونکہ وہ ایک باوقار، مہذب اور شفیق دادا کے بجائے ایک ایسے اوباش نوجوان بن گئے تھے جو نوجوان لڑکیوں کے پیچھے گھومنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے جو طور طریقے اختیار کیے ان کی وجہ سے ان کی فیملی کو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنی پڑی۔ انہیں ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ عیاشی کے پیچھے پاگل دادا انجیلو نے اپنی بچت میں سے تین ہزار پاؤنڈ ایک قحبہ خانے میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر لٹا دیئے جو عمر میں ان کی پوتی کے برابر تھی۔ دادا انجیلو کے بیٹے ڈینیل نے مقامی عدالت میں درخواست دی جس کے بعد ججوں نے اس کے ڈیڈی کے دو مکانوں اور ان کے بینک اکاؤنٹس کو اس کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ ججوں نے یہ فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ ملزم انجیلو جس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہے اس صورت میں وہ اپنے مالیاتی امور خود نہیں چلا سکتا۔

وہ 19 سال بعد کوما سے جاگ اٹھا

ٹیری ولیس نامی شخص 19 سال بعد کوما سے جاگا، اپنی ماں کی طرف گھوما جو اس کے بستر سے لگی بیٹھی تھی اور کہا: ''موم!''

اس کے بعد ٹیری نے پیپسی کا لفظ ادا کیا جس کے بعد ایک اور لفظ ''ملک'' کہا۔ ٹیری ولیس کی عمر 19 سال تھی جب اس نے اپنی بیٹی کی سالگرہ منائی تھی کہ جمعہ 13 نومبر 1984ء کو اس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا۔ وہ جس ٹرک میں سفر کر رہا تھا وہ اچانک ہی گھوما اور سڑک کے کنارے لگی رکاوٹوں کو توڑتا ہوا 25 فٹ گہری کھائی میں جا گرا اور زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ 24 گھنٹے سے پہلے اس ٹرک کا پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ ٹیری ولیس کی کیفیت یہ تھی کہ اپنی گردن سے نیچے والے حصے میں وہ مکمل طور پر پیرالائزڈ ہو گیا تھا اور کوما میں چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر مایوس تھے اور ان کا خیال تھا کہ ٹیری کے ہوش میں آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ٹیری کے ممی ڈیڈی اور اس کی بیوی سینڈی نے اسے ایک rehabilitation سینٹر میں داخل کر دیا۔ اس کے گھر والے ہر دوسرے ویک اینڈ پر اپنے فارم ہاؤس پر لے جاتے اور اس سے باتیں کرتے اس امید پر کہ شاید جانی پہچانی جگہ، شناسا قرب و جوار اسے شعور میں واپس لے آئے۔ چار ہفتے قبل ٹیری کی ممی اپنے بیٹے سے ملنے سینٹر گئیں جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ ایک مشکل سفر ہوتا ہے اور پھر اچانک ہی ان کے بیٹے نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور باتیں کرنے لگا۔ ولیس کا تعلق آرکنساس سے ہے۔ وہ اب اپنی بیٹی امبر سے خوب باتیں کرتا ہے جس کی عمر اس وقت 19 سال ہو چکی ہے۔ اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کے دماغ کو جو چوٹ لگی اس کے باعث اس کی یادداشت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ وہ آج بھی 1984ء میں جی رہا ہے۔ جب اس کی ماں نے اس سے پوچھا کہ امریکہ کا صدر اس وقت کون ہے تو اس نے جواب دیا: ''رونالڈ ریگن۔''

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ جمعہ کو ہوا تھا اور مہینے کی 13 تاریخ تھی جبکہ جب وہ کوما سے واپس آیا تو بھی یہی دن اور یہی تاریخ تھی۔

(بشکریہ سنڈے میگزین روزنامہ ایکسپریس)

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com
www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: مریم فرحان)

ذیل کی سطور میں ہم آپ کو جس خاص ڈش کی ترکیب بتانے جا رہے ہیں وہ متحدہ عرب امارات کی تقریباً تمام ریاستوں میں انتہائی مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اس کو بنانا بھی بے حد آسان ہے اور ذائقہ میں اپنا جواب بھی نہیں رکھتی۔

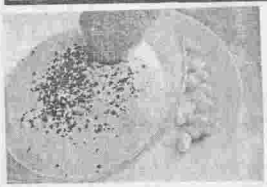

هومس چک پیز ڈپ
HOMMUS CHICK PEAS DIP

اجزاء:

ابلے ہوئے سفید چنے: 1½ کپ
نمک: ایک چائے کا چمچ
لہسن: 2 جوئے
[illegible]
لیموں کا رس: تقریباً نصف کپ
کٹے ہوئے پارسلے: 2 کھانے کے چمچ کٹے ہوئے گارنش کرنے کیلئے

ترکیب: تمام اجزاء کو بلینڈر میں ڈالیں اور اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ اس مکسچر کو اچھی طرح گاڑھا اور کریم کی طرح کا کر لیں۔ پھر اس میں حسب ذائقہ نمک اور تھوڑا سا لیموں کا رس شامل

www.urdukorner.com

کر کے پیش کریں۔

☆☆☆

ہنی مسٹرڈ گرلڈ چکن

اجزاء:

مسٹرڈ پیسٹ:	1/3 کپ
شہد:	1/4 کپ
میونیز:	2 کھانے کے چمچ
سٹیک ساس:	1 چائے کا چمچ
چکن بریسٹ پیس:	4 عدد (دو حصوں میں کٹے ہوئے)

ترکیب: گرل کو پہلے سے گرم کر لیں۔ پھر ایک باؤل لے کر مسٹرڈ پیسٹ، شہد، میونیز اور سٹیک ساس کو اچھی طرح مکس کر لیں اور اس آمیزہ کے دو تین چمچ گارنش کرنے کے لیے نکال لیں۔ اس کے بعد بقایا آمیزے میں چکن کو ڈال دیں اور کم از کم 30 منٹ تک میرینیٹ کریں۔

گرل پین پر ہلکا سا آئل لگائیں اور پھر 18 سے 20 منٹ تک چکن کو گرل کریں۔ اس دوران چکن کا رُخ تبدیل کرتے رہیں۔ آخری 10 منٹ میں تھوڑا تھوڑا شہد مسٹرڈ ساس سپون سے لگاتے جائیں۔ اُبلی سبزیوں اور آلو کی باریک کٹلیوں کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆☆

(تحریر: فاطمہ قیوم)

عیدالاضحی کی آمد آمد ہے اور گوشت سے بنے پکوان اس عید کا لازمی جزو ہیں، تاہم اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قربانی کا گوشت روایتی انداز میں پکانے کو نہ خواتین کا جی چاہتا ہے اور نہ ہی دیگر اہلخانہ روایتی ڈشز کو پسند کرتے ہیں۔ البتہ کباب وغیرہ خوب شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ سو ہم آپ کو کباب کی ایک خاص ترکیب بتا رہے ہیں۔ جو انتہائی مزیدار اور روایتی ڈشز سے ہٹ کر بھی ہے۔

گلاوٹ کے کباب

اجزاء:

قیمہ:	آدھا کلو
بیسن:	2 ٹیبل سپون (توے پر بھنا ہوا)
دہی:	1 پیالی
پیاز:	2 عدد فرائی
کچی پیاز:	1 باریک پسی ہوئی
پپیتا:	1 ٹیبل سپون
ادرک لہسن پیسٹ:	2 ٹی سپون
نمک:	1 ٹی سپون
ثابت دھنیا:	2 ٹی سپون (توے پر بھنا ہوا)
پسا گرم مصالحہ:	1 ٹی سپون
لال مرچ کٹی ہوئی:	2 ٹی سپون (توے پر بھنی ہوئی)

اس کے علاوہ [illegible]

ترکیب: قیمہ میں بیسن، کچی پیاز، پپیتا، آدھی فرائی پیاز، ادرک لہسن پیسٹ، پسا گرم مصالحہ، ثابت مرچ کٹی ہوئی، نمک، دہی 2 ٹیبل سپون ڈال کر ثابت دھنیا تھوڑا سا پسا ہوا ملا کر مکس کریں اور گول کباب بنا لیں۔ آئل میں پیاز فرائی کی ہوئی، دہی ایک پیالی، نمک، مرچ (ثابت مصالحہ چاہیں تو) ڈال کر گریوی بنا لیں اور اس میں کباب ڈال کر پکنے دیں۔ پھر ڈھک کر کیوڑہ ڈال دیں اور مزید کچھ دیر پکا لیں تاکہ اندر سے گل جائے۔ آخر میں کوئلے کی smoke دے لیں۔

ٹکڑے والا سوجی حلوہ

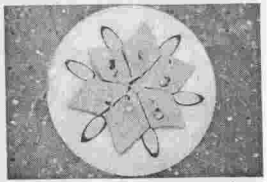

اجزاء:

چینی:	2 پیالی
سوجی:	500 گرام
گھی:	1/2 پیالی
عرق گلاب:	1 ٹی سپون
بڑی الائچی کے دانے:	2 عدد
کھوپرا پسا ہوا:	تھوڑا سا
میوے، بادام:	کٹے ہوئے
پستہ، ناریل:	کٹے ہوئے

ترکیب: پانی اور چینی سے شیرا بنا لیں۔ اب اس میں بچا ہوا تھوڑا سا گھی بھی مکس کر لیں۔ سوجی تھوڑے سے گھی میں بھون لیں لیکن اس کا رنگ نہ بدلے۔ اب اس کو ٹھنڈا کر کے اس میں کھوپرا اور بڑی الائچی کے دانے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب چولہا ہلکی آنچ پر رکھ کر شیرے میں سوجی اچھی طرح مکس کریں۔ یکجان کر کے چولہا بند کر لیں اور فلیٹ ڈش میں پھیلا کر اوپر میوہ جات ڈال دیں، پھر پولیتھین شیٹ رکھ کر ہاتھ سے ایک سا کر لیں۔ تھوڑا سا ٹھنڈا ہونے پر نشان (Cuts) لگا دیں اور پورا ٹھنڈا ہونے پر ٹکڑے کاٹ لیں۔

☆☆☆

(تحریر: صائمہ عمران)

میٹھی عید یعنی عیدالفطر پر ہم نے آپ کو نمکین اور میٹھی دونوں طرح کی منفرد ڈشز کی recipes بتائی تھیں۔ اب باری ہے عیدالاضحیٰ یعنی گوشت والی عید کی۔ بقرہ عید ہو اور گوشت سے بننے والی مزیدار ڈشز نہ ہوں ناممکن سی بات ہے۔

اس لیے اس بار ہم آپ کو دو طرح کے کباب بنانا سکھائیں گے جو دیکھنے میں بھی منفرد ہوں گے اور مزے میں بھی۔ یوں تو آپ نے بہت طرح کے سیخ کباب کھائے ہوں گے لیکن آج جو کباب ہم آپ کو سکھا رہے ہیں وہ ہیں roll کی شکل میں۔

سپائسی کباب رول

Spicy Kabab Rolls

اجزاء (سیخ کباب کیلئے)

www.urdukorner.com

تیل: 2 چائے کے چمچ
قیمہ (باریک): آدھا کلو
پیاز (باریک کٹا ہوا): 1 عدد
ادرک: 1 ٹکڑا
ہری مرچیں (کٹی ہوئی): 6 عدد
کچا پپیتہ: 1 چمچ
گرم مصالحہ: 1 چمچ
سرخ مرچ: 1 چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ
بھنا اور پسا زیرہ: 1 چائے کا چمچ

اجزاء (پیسٹری کے لیے)

میدہ: 2 کپ
مکھن: 4 اونس
نمک: 1 چائے کا چمچ
ٹھنڈا پانی: گوندھنے کیلئے

ترکیب: قیمہ میں سارے اجزاء ملا کر chopper میں پیس لیں اور اس کے لیے لمبے سیخ کباب بنالیں۔ اب ان کبابوں میں دو چمچ آئل میں ہلکا سا فرائی کرلیں۔

پیسٹری کیلئے میدہ میں مکھن اور نمک ملا لیں یہاں تک کہ وہ crumb کی طرح ہو جائے۔ اب ٹھنڈے پانی سے گوندھ لیں۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے فرج میں رکھیں۔ اب پیسٹری کو بیل کر تین تین انچ موٹائی کے ٹکڑوں کاٹ لیں۔ اب کباب کو ہر ٹکڑوں پر رکھیں۔ پانی سے ٹکڑوں کے کنارے نم کرلیں اور انہیں رول کرلیں۔ اب سارے رولز کو بیکنگ ٹرے میں رکھ دیں اور انڈے کی زردی لگا کر پہلے سے گرم اوون میں 200°C پر بیک کریں یہاں تک کہ وہ گولڈن براؤن ہو جائے۔

☆☆☆

لبنانی کباب

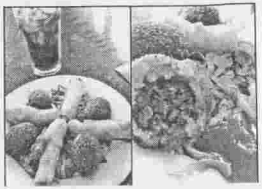

اجزاء:

قیمہ: آدھا کلو
نمک: آدھا چمچ
سرخ مرچ: آدھا چمچ
لہسن: آٹھ یا دس جوئے
پیاز: تین عدد
ادرک: 1 انچ کا ٹکڑا
آلو (اُبلے ہوئے): 2 عدد
مٹر (اُبلے ہوئے): آدھا کپ
میکرونی (اُبلے ہوئے): آدھا کپ
ہری مرچ: 2 عدد
انڈے: کوٹنگ کیلئے
بریڈ کرمز: کوٹنگ کیلئے

ترکیب: تمام مصالحوں اور قیمے کو پتیلی میں ڈالیں اور پانی خشک ہونے تک قیمے کو پکنے دیں۔ قیمہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں آلو، مٹر اور میکرونی ڈال کر گرینڈ کریں۔ اب کباب کی شکل دیں۔ کبابوں کو پہلے انڈے اور پھر بریڈ کرمز میں لپیٹیں۔ ان کو تیل میں تل لیں۔ گولڈن ہو جائیں تو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

عارفہ صبح خان

ہنسے تو پھنسے

مسکرانا اور ہنسنا صحت کیلئے مفید ہے مگر بعض اوقات ہنسی وبال بھی بن جاتی ہے اور انسان چاہ کر بھی اس بے وقت کی ہنسی کو روک نہیں پاتا، خوامخواہ میں مفت کی شرمندگی گلے پڑ جاتی ہے۔ خاصی دیر بعد اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے مگر خود کو کوسنے کاٹنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

طنز و مزاح کی چاشنی لیے، خوامخواہ ہنسنے کے نقصانات واضح کرتی شگفتہ تحریر

تحقیق بتاتی ہے کہ پاگلوں کے پاگل پن کی بڑی وجہ اخبار بینی ہے۔ اخبار کے دو صفحات تو جرائم سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اخبار کا بڑا حصہ اشتہارات اور سیاستدانوں کے بیانات سے پُر ہوتا ہے جبکہ باقی کے دو صفحات میں فلمی اداکاروں اور کھلاڑیوں کی خبریں ہوتی ہیں اور باقی اخبار سفارشی کالموں سے اٹا پڑا ہوتا ہے۔ اخبار پڑھنے کے بعد سوائے مینشن اور ڈپریشن کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل، پاگل ہونے کے بعد بھی اپنی عادت ترک نہیں کرتا اور اخبار پڑھتا رہتا ہے۔ اگر وہ اخبار کی جگہ کتاب پڑھنے کا عادی ہوتا تو کہیں ڈھنگ کی نوکری کر رہا ہوتا اور

www.urdukorner.com

پاگل خانے کے بجائے گھر میں عزت کی زندگی بسر کرتا۔ رضیہ بٹ کے ناول پڑھ لیں، دنیا حسین اور رنگین نظر آتی ہے۔ تمام خواتین کا ادب محبت کی چاشنی سے لبریز ہے آپ جس ادیب شاعر کو پڑھ لیں یوں لگتا ہے زندگی میں محبت اور عشق کی پھوار ہو رہی ہے۔ آپ کے چہرے پر دلآویز مسکراہٹ آتی ہے اور کبھی کبھی تو محبت کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ آپ بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ پاگلوں کے ضمن میں البتہ ایک بات اچھی ہے کہ وہ خود بخود ہنستے رہتے ہیں انہیں ہنسانا نہیں پڑتا کیونکہ کسی کو ہنسانا بذات خود ایک مشقت ہے جبکہ عام انسانوں کو ہنسانا پڑتا ہے کیونکہ وہ ازخود نہیں ہنستے۔ ویسے ہنسنے کے لیے کسی ایکسرسائز کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ''ہنسنا'' تو خود ایک ایکسرسائز ہے۔

مغرب میں سردی بہت ہوتی ہے۔ وہاں کے انسانوں کا خون اسی لیے جما رہتا ہے اور ہنسی منجمد رہتی ہے۔ ہنسنے کے معاملے میں سارے انگریز شیخ واقع ہوئے ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگ جتنا روتے ہیں اس سے زیادہ ہنستے ہیں۔ اکثر اوقات جو بندہ آپ کے سامنے کھلکھلا کر ہنس رہا ہوتا ہے وہ دس منٹ بعد باتھ روم میں جا کر رو رہا ہوتا ہے اور جو بندہ آپ کے سامنے بلک بلک کر رو رہا ہوتا ہے وہ رفع حاجت کے بہانے بیت الخلاء میں جا کر ہنس رہا ہوتا ہے کہ واہ کیسا الو بنایا...... ہمارے ہاں ''الو'' بیوقوف کو اور مغرب میں عقلمند جانور کو کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں سچ کیا ہے مگر یہ سچ ہے کہ الو بڑا بدشکل اور سڑیل جانور ہے۔ وہ واحد جانور ہے جسے ہنسا منع ہے مگر ہمارے ہاں ہر شخص دوسرے کو الو بنا کر خوش ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو ہنسنے کی خاطر الوؤں جیسی حرکتیں کر گزرتے ہیں اور اتنا ہنستے ہیں کہ ان کی مماثلت جانوروں میں آنے لگتی ہے۔

گاؤں کے ماسٹر جی اکثر کہا کرتے...... اوئے اشرف تو کیا گدھوں کی طرح ہنسے جا رہا ہے۔ اوئے شیدے...... تو باندر کی طرح بتیسی نکال رہا ہے۔ او بشریٰ...... تو کیا بطخ کی طرح قیں قیں کر رہی ہے...... تھوڑی دیر بعد خود ماسٹر جی کھسیانے ہو کر بھالو کی طرح ہنسنے لگتے۔ پتہ چلتا کہ ماسٹر جی کی دھوتی میں کھونتا لگ گیا ہے۔ یہ کام ہر تیسرے چوتھے روز ہوتا۔ بچے پیڑھے میں کیل پھنسا دیتے اور پھر ماسٹر کے جانے کے بعد بھی دیر تک ہنستے رہتے۔

ہنسنا انسانی زندگی کے لیے رونے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، ہنسی صحت بخش ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے پھیپھڑوں کے لیے مفید بتایا ہے۔ رونے اور ہنسنے دونوں سے ہی پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی غم کے بعد ہنسی سے عبارت ہے۔ ہنسی کو خوش مزاجی اور خوش اخلاقی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ ہنسی سے دوستیاں وجود میں آتی ہیں اور انسان اپنی ہنسنے والی عادت سے دوستوں کا ریوڑ آسانی سے پال سکتا ہے۔ ہنسنے والے لوگوں کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا ہے۔ ہنسی کو مبارک اور سعد تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت کچھ یوں ہے کہ ہنسی آپ کے لیے اکثر اوقات عذاب بن جاتی ہے۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ''ہنسی'' کے سبجیکٹ نے بھی خاطر خواہ ترقی کی ہے مثلاً کھلکھلا کے ہنسنا، طنزیہ ہنسنا، شرارتاً ہنسنا، اشارتاً ہنسنا، ارادتاً ہنسنا، کھوکھلا ہنسنا، بے معنی ہنسنا، لغو ہنسنا وغیرہ وغیرہ۔ ہنسنا یقیناً ایک اچھا فعل ہے لیکن آپ ہنس کر بری طرح پھنس بھی سکتے ہیں۔ اکثر اوقات آپ صرف اپنی ہنسی سے مارے جاتے ہیں۔ اس لیے جہاں ہنسنے کے چند اہم فوائد ہیں وہاں ہنسنے کے بے شمار مسائل بھی ہیں یعنی ہنسا تو

پھنسا اور ہنسی تو پھنسی!!

ہنسنے کا پہلا نقصان تو یہ ہے کہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ کل بہت ہنس رہے تھے آج منہ لٹکائے بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے نماز جنازہ پڑھا کر سیدھے دفتر آ گئے ہیں۔ پوچھو کہ بھائی کیا بات ہے تو فرمائیں گے...... بس کچھ دل مُردہ ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ بھائی دل مُردہ ہو رہا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ مر جاؤ گے اور ہم کل تمہارے قل پر چنے چبا رہے ہوں گے۔ شکر کرو کہ ضمیر مُردہ نہیں ہوا۔ پیچھے سے آواز آتی ہے...... ''اجی وہ تو پہلے ہی مُردہ ہو چکا تھا۔'' اس کے ساتھ ہی بریکوں والی ہنسی کی آواز آتی ہے اور دائیں بائیں سے گھٹی گھٹی ہنسی کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یہ ایسی آوازیں ہیں کہ کوئی روبوٹ یا پتلا بھی سنے تو اس کی ہنسی چھوٹ جائے۔ کھی کھی کھی...... پھس پھس...... ہی ہی ہی...... ہو...... ہا...... ہاؤ...... ہے ہی!! جس بندے نے مردہ دلی کا ذکر چھیڑا تھا اس کے چہرے پر غصہ ہے لیکن ان آوازوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بندہ ہاتھ میں پیپر ویٹ اٹھائے اصلی مجرم کو تاک رہا ہے۔ لوگ اسے کھولتا اور جلتا بھنتا دیکھ کر بے حال ہو رہے ہیں۔ کسی ایک کی ہنسی کا فوارہ اُبل پڑتا ہے اور پھر قہقہوں کا طوفان اُمڈ آتا ہے۔ قہقہوں کی آوازیں باس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ڈسپلن کی خرابی پر نوٹس آ جاتا۔ باس کو بالکل اچھا نہیں لگتا کہ وہ تو بیوقوفوں کی طرح سارا دن میٹنگیں بھگتائے، احکامات جاری کرے، فائلوں پر سائن کرے، فون پر مختلف کمپنیوں کو قائل کرے اور اس کے ماتحت کام کے بجائے ہنسی مذاق کریں اور ڈسپلن چھوڑ کر انجوائے کریں۔ چنانچہ نوٹس میں واضح طور پر درج ہوتا ہے کہ دفتری اوقات میں ہنسنا منع ہے۔ کچھ دن کے لیے سب کی ہنسی کو بریک لگ جاتی ہے مگر کب تک...... ماتحت عملہ لنچ ٹائم یا اوور ٹائم میں ہنس لیتا ہے...... باس کی عدم موجودگی میں ہنسی کا سارا خزانہ لٹا دیا جاتا ہے اور سب باس کی احمقانہ شخصیت پر دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ہر شخص بساط کے مطابق باس پر جملے کستا ہے جبکہ بعض باس پر لطیفے گھڑ کر سناتے ہیں۔ یہ وہ فحش لطیفے ہوتے ہیں جو صرف سنانے کے لیے ہوتے ہیں انہیں کسی بھی طرح احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ آپ صرف لطیفوں کی لطافت پر سوچ کر ہنس سکتے ہیں۔

ہنسنے کا ایک اور بھی نقصان ہے۔ وہ صرف ہنسنے والوں کو ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ بہت جلد موٹاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پتلے لوگ عموماً سڑیل اور چڑچڑے پائے گئے ہیں۔ یہ لوگ بہت کم ہنستے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر کی خراب ہوا باہر نہیں نکلتی لیکن صحت مند یا گول مٹول لوگ بہت ہنستے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی تازہ ہوا وافر مقدار میں ان کے اندر پہنچ جاتی ہے۔ شاید اسی لیے ان کے اعضاء کھل جاتے ہیں۔ جب ایک بار ہنسنے کی عادت پڑ جائے تو ہوا اندر جا کر پھیل جاتی ہے اور آپ کی سمارٹنس کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ کسی سوکھے سڑے کو آپ مریل یا تیلی کہہ دیں تو وہ فوراً بکنا جھکنا شروع کر دے گا لیکن آپ کسی موٹے کو ''موٹو'' کہیں تو وہ برا منائے بغیر ہنسنے لگے گا...... البتہ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ اپنی ہیئت کذائی پر ہنس رہا ہے یا آپ کی بدتہذیبی پر!!

ہنسنے کا نقصان یہ بھی ہے کہ آپ میں درگزر کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ لوگوں کا ہر وار ہنس ہنس کر سہہ جاتے ہیں کیونکہ آپ ہنس مکھ ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا فانی ہے، زندگی آنی جانی ہے اور

www.urdukorner.com

لڑنا بے معنی ہے۔ چنانچہ آپ زیادہ کھانے کمانے کی طرف مائل نہیں ہوتے بلکہ اس طرح آپ کی غیرت بالآخر سو جاتی ہے۔ آپ کا جوش مر جاتا ہے اور انا کھو جاتی ہے۔ آپ ہر ایک کی بری بھلی سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہنسنے کی وجہ سے کوئی آپ کی اہم بات کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ ایک دوست نے دوسرے دوست کو آ کر بتایا کہ یار تمہاری بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ دوسرے دوست نے کہا یار مذاق نہ کرو۔ وہ اتنی جلدی اللہ کو پیاری نہیں ہو سکتی۔ پہلے دوست کی ہنسی چھوٹ گئی...... وہ بولا کہ یار وہ تمہیں پیاری نہیں تھی اسی لیے جلدی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ہے تو افسوس کا مقام...... مگر یار کتنے خوش قسمت ہو کہ اب اپنی پسند کی دوسری شادی کا موقع مل جائے گا...... ویسے یار یہ تمہیں دل سے تو پسند نہیں تھی ناں...... چلو اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ کاش! یہ موقع مجھے بھی ملتا لیکن میری قسمت ایسی کہاں...... یہ کہہ کر اس نے اپنے دوست کو ایک رنڈوے کا قصہ سنایا اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بیوی مرنے کے لطیفے سناتے رہے۔ شام کو دوست کو یاد آیا کہ وہ تو اپنے دوست کو بتانے آیا تھا کہ اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔ دوسرے دوست نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا کہ یار تمہاری بیوی سچ مچ مر گئی ہے۔ مگر پہلے دوست نے یقین نہ کیا کہ ضرور تم مذاق کر رہے ہو۔ بڑی مشکل سے دوست گھر چلنے پر آمادہ ہوا۔ گھر جا کر دیکھا تو بیوی واقعی مر چکی تھی۔ پہلا دوست بچوں کی طرح رونے لگا...... ہائے یہ تم نے کیا کیا...... تم مجھ سے پہلے چلی گئیں۔ میں تو اکیلا رہ گیا۔ ارے اب لوگ مجھے بھی ''رنڈوا'' کہیں گے۔ یہ تو بالکل گالی جیسا لگتا ہے۔ میں رنڈوا نہیں بننا چاہتا۔ ارے کون مجھے سہارا دے گا، کون میرے بچوں کو پالے گا؟؟ ارے...... کوئی ہے؟؟؟

دوست کی فریاد ایسی تھی کہ دوسرا دوست اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور دوست کی فریاد میں چھپی ہوئی خواہش پر ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ لوگوں نے بہت برا منایا اور مرحومہ کے چاروں ہٹے کٹے بھائی اسے پاگل خانے داخل کر آئے۔ پاگل خانے آ کر وہ ڈاکٹروں کی جب باتیں سنتا تو اسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ جب ڈاکٹروں سے کہتا کہ بھائی مجھے خدا کے واسطے چھوڑ دو۔ میں بالکل ٹھیک اور صحیح الدماغ ہوں تو یہ بات سن کر ڈاکٹر ہنسنا شروع کر دیتے اور کہتے...... شروع میں سب ایسے ہی کہتے ہیں بعد میں اپنے ساتھیوں میں گھل مل کر باہر جانے کی ضد چھوڑ دیتے ہیں۔ دوست کو اپنی ہنسی کی وجہ سے اکتالیس دن پاگل خانے میں رہنا پڑا کیونکہ اس کا دوست اپنی پہلی بیوی کا چالیسواں منا کر اور دوسری بیوی کے ساتھ سہاگ رات گزار کر صبح اُٹھتے ہی پاگل خانے بھاگا چلا آیا اور بولا کہ یار معاف کرنا میں پہلی بیوی کے غم اور دوسری بیوی کی فکر میں تمہیں بھول ہی گیا۔ وہ تو رات کو میری نئی دلہن نے بڑے پیار سے کہا کہ اب میں آ گئی ہوں...... اب تو کوئی آپ کو ''رنڈوا'' نہیں کہے گا ناں؟

یہ سن کر مجھے اسی وقت تم یاد آ گئے لیکن وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں تمہیں پاگل خانے سے نکلوانے آتا۔ چلو آؤ...... آج میرا ولیمہ ہے۔

پہلے دوست نے کہا کہ یار میں تو پہلے ہی ہنسوڑ تھا۔ یہاں آ کر تو ہنسنا میری ہابی بن گیا ہے۔ یار یہاں پاگلوں کے ساتھ ڈاکٹر بھی بڑا ہنساتے ہیں۔ بہرحال تمہارے لیے بھی خوشخبری ہے۔ میں بھی مطلقہ ہو گیا ہوں۔ میری بیوی خلع لے کر چلی

گئی ہے۔ میں بھی اسی ہفتے دوسری شادی کر رہا ہوں۔ لیکن کس سے؟ پہلے دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

پاگل خانے کی لیڈی ڈاکٹر سے......

ہنسنا جزا بھی ہے اور سزا بھی...... لیکن یہ ہے کہ ہنسنے کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ آپ خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں اور یکا یک آپ کو کوئی دلچسپ واقعہ یا اپنی حماقت یاد آ جاتی ہے جسے یاد کر کے آپ بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں اور یہ ہنسی اس طرح پھوٹتی ہے جیسے شگوفہ پھوٹتا ہے کیونکہ ہنسی ایک غیر ارادی فعل ہے اس لیے بے موقع اور بے وقت ہنسی کا ریلہ بہہ نکلتا ہے۔ بعض دفعہ تو انتہائی نامناسب موقع پر آپ ہنسی کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور جونہی آپ کو مجھولی ہنسی کا ادراک ہوتا ہے۔ آپ اسے بریک لگانے کی سعی کرتے ہیں مگر بریک لگانے سے ہنسی کا میوزک ایک دم بے ڈھنگا ہو جاتا ہے۔ آپ ہنسی روکتے ہیں اور ہنسی ایک ایسی مضحکہ شکل اختیار کر لیتی ہے کہ دوسرے دانستہ متوجہ ہو جاتے ہیں اور عام طور پر لوگوں کا زاویہ نگاہ مشکوک اور ملعون ہوتا ہے۔ خوامخواہ میں مفت کی شرمندگی گلے پڑ جاتی ہے۔ آپ کو خاصی دیر بعد اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے اور آپ خود کو کوسنے کاٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر آپ کا دل چاہتا ہے کہ اپنے چہرے پر ہی کاٹ لیں کہ اسی پر ہنسی نمودار ہوئی تھی لیکن آپ کے اختیار میں یہ بھی نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کی دو رنگی کیفیت پر حیران اور محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ اچھا خاصا تماشہ لگ جاتا ہے، کوئی آپ کو دیوانہ یا من چلا سمجھ کر اُلٹا آپ پر ہنسنے لگتا ہے۔ اس کے پاس ہنسنے کا جواز ہوتا ہے مگر آپ ہنسنے کی وجوہات بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، اچھا بھلا آپ کا وقار اور رعب دبدبہ مٹی مٹی ہو جاتا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ آپ نوجوان ہی ہوں۔ آپ ایک ادھیڑ عمر آدمی یا باریش بزرگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ذرا اس لمحے کے متعلق سوچیے کہ جب آپ...... آپ ہی آپ مسکرا دیتے ہیں تو لوگ آپ کے بارے میں کیا کیا نہ سوچتے ہوں گے۔ پہلا خیال تو یہی آتا ہو گا کہ آپ ضرور کوئی خبطی یا ٹھرکی بڈھے ہیں یا ممکن ہے کہ آپ کسی پوتی کی عمر کی لڑکی کو چھیڑ کر آ رہے ہیں...... ایسے میں اگر کوئی کچھ پوچھ بیٹھے کہ...... ''کیوں میاں جی کیا چکر ہے...... نئی شادی کا ارادہ ہے کیا؟؟؟'' تو بتایئے اس وقت آپ کی حالت کیا ہو گی؟ عین ممکن ہے ہنسی فوراً قہر کا روپ دھار لے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی عزیز یا دوست کی مرگ میں شامل ہیں۔ سامنے آپ کا کالا بھجنگ دوست سفید براق کفن میں ابدی نیند سو رہا ہے، آپ اپنے دوست کے تمام سیاہ کارناموں اور سابقہ ناقابل بیان ماضی سے واقف ہیں۔ دوست کی ماں روتے ہوئے بار بار کہتی ہے...... ارے دیکھو تو میرے بیٹے پر کیسا نور آ رہا ہے۔ جنتی تھا جبھی تو اتنی سی عمر میں مر گیا...... میرا بچہ بڑا نمازی پرہیزگار تھا۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا...... دفتر سے سیدھا گھر آتا اور گھر سے سیدھا دفتر جاتا تھا...... ہائے خدایا تو نے میرے معصوم بچے کو اُٹھا لیا...... ابھی تو اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا...... یہ جملے سن کر بے ساختہ آپ کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ بات تو واقعی ہنسنے کی ہے مگر صورتحال رونے کی ہے۔ اس لیے یہ ہنسی آپ کی بے عزتی کا سامان کر دیتی ہے۔

بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے کسی انتہائی قریبی رشتہ دار کا جنازہ پڑا ہے مگر شومیٔ

www.urdukorner.com

قسمت آپ کو کوشش کے باوجود رونا نہیں آ رہا۔ آپ مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ایک آدھ آنسو ٹپک پڑے۔ آپ حسرت سے اپنی خالہ کا جنازہ دیکھ رہے ہیں جنہوں نے بڑی محبت سے آپ کو پالا تھا۔ اچانک آپ کو اپنی خالہ کی رقم بٹورنے کی بات یاد آ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے جملہ عیوب یاد آنے لگتے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کیونکہ خالہ میں عیوب کا تناسب زیادہ تھا۔ اچانک خالہ کے دانت میں پھنسی ہوئی بوٹی پر آپ کی نظر پڑتی ہے اور آپ کو خالہ کا پیٹو پن یاد آ جاتا ہے۔ خالہ مرنے سے پہلے ہنڈیا چٹ کر کے گئی ہیں۔ یہ سوچتے ہی آپ کو خیال آتا ہے کہ افسوس خالہ اپنے سوئم دسویں اور چالیسویں کے کھانے نہیں کھا سکیں گی اور قبر میں پڑی کڑھتی رہیں گی کہ ہائے میرے ہی نام کی دیگیں پک رہی ہیں اور میں ہی نہیں کھا سکتی...... یہ خیال آتے ہی آپ کو ہنسی آ جاتی ہے اور یہ ہنسی نان سٹاپ ہوتی ہے کیونکہ ہنسی کے ساتھ ہی خالہ کے پیٹو پن کے بہت سے واقعات گدگدانے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہنسی کا والیم بھی بڑھنے لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے نتائج و عواقب مرتے دم تک آپ کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کسی فوتگی میں تعزیت کے لیے پہنچتے ہیں۔ کوئی شخص روتے روتے ایسی بات کہہ دیتا ہے جو ہنسنے کا محرک بن جاتی ہے۔ آپ کو جونہی ہنسی آتی ہے آپ پوری قوتوں سے اس بدبخت کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جتنا ہنسی کو دباتے ہیں وہ اتنی ہی بے مہار ہوتی چلی جاتی ہے اور اتنی منہ زور ہو جاتی ہے کہ منہ پر ہاتھ رکھنے کے باوجود کھی کھی، ہو ہو، گھر گھر گھر کی آواز پیدا کر کے آپ کا راز فاش کر دیتی ہے۔ آپ بعد میں خفت اور ذلت اُٹھاتے تھک جاتے ہیں۔ ایسے غمناک ماحول میں آپ کی ہنسی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ لوگ خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہیں آپ کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ لوگ محفلوں، تقریبوں، گلیوں، بازاروں، گھروں میں اس بات کا چرچا کرتے ہیں اور شیطان سے زیادہ آپ پر نفرین بھیجتے ہیں۔

ہنسی سے کسی طرح فرار ممکن نہیں...... غصے سے فرار ممکن ہے مثلاً آپ کو شدید غصہ آتا ہے اور آپ کا دل چاہتا ہے کہ غصہ دلانے والے شخص کا سرمہ یا قیمہ نہ سہی، بھرتہ ضرور بنا دیں مگر جب آپ غصے میں لال پیلے برہمی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں تو غصہ دلانے والے سے کوئی مضحکہ خیز حرکت سرزد ہو جاتی ہے جس سے آپ کی ہنسی نکل آتی ہے۔ آپ فی الفور ہنسی پر قابو پانا چاہتے ہیں اور دوبارہ غصہ بحال کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں لیکن ہنسی غصے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ ہنسی کا فوارہ آپ کے لبوں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ آنکھوں کے لال لال ڈورے مسکراہٹوں کے جھولے جھولنے لگتے ہیں حالانکہ آپ کی پیشانی مارے غصے کے شکن آلود ہوتی ہے اور منہ سے کف جاری ہوتا ہے...... جونہی ہنسی کا غلبہ ہوتا ہے آپ بے بسی سے ہنس رہے ہوتے ہیں۔ یوں غصہ دلانے والے کو ڈھیل مل جاتی ہے اور وہ آپ کو چکمہ دے کر تو دو گیارہ ہو جاتا ہے یا پھر نہایت ڈھٹائی سے آپ کے ساتھ ہنسی کے موتی لٹانے لگتا ہے۔ آپ ہونٹ بھینچنے کے باوجود ہنستے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح غصہ دل کا دل میں رہ جاتا ہے اور بعد میں آپ بُری طرح سے خود کو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں کہ ہنسی کی وجہ سے آپ کا ہمیشہ کے لیے رعب بھی گیا اور غصہ اُ[illegible] اور موقع بھی [illegible]

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

مسکرائیے

ایک وکیل نے اپنے موکل کی وکالت کرتے ہوئے جج سے کہا حضور والا! میرے موکل کا مقدمہ بعینہ اس قسم کا ہے کہ جس قسم کے فلاں فلاں مقدمات تھے۔ ان مقدمات کے فیصلوں کی مثالیں آپ قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر 419 اور 420 پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

جج نے قانون کی کتاب کھولی اور وہ صفحات نکالے۔ ان صفحات کے درمیان سو سو کے چار نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ جج نے نوٹ احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے متانت سے کہا: اس مقدمے کے فیصلے کے لیے اس قسم کی تین اور مثالیں پیش کی جائیں۔

☆☆☆

بیوی شوہر سے: کہاں جا رہے ہو؟

شوہر: خودکشی کرنے۔

بیوی: زیورات کا ڈبہ کہاں لے جا رہے ہو؟

شوہر: میں کوئی بیوقوف ہوں جو دنیا سے خالی ہاتھ چلا جاؤں۔

☆☆☆

چالاک دشمن کے دام میں پھنسنے!!

ہنسی کا دورہ اس وقت بھی ضرور پڑتا ہے جب کسی لڑکی کو دیکھنے کے لیے لوگ آتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وغریب صورتحال ہوتی ہے۔ لڑکی خوش بھی ہوتی ہے اور روز روز کی رونمائی سے پریشان بھی..... پھر دیکھنے والے بھی اکثر بجوبے نکل آتے ہیں تاہم لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ جو بھی پارٹی آئے وہ اسے پسند کر کے ''ہاں'' کر جائے۔ لڑکی بڑی متانت سے آتی ہے۔ گلابی چہرے پر گلابی دوپٹہ اوڑھے وہ سچ مچ مشرق کا جیتا جاگتا شاہکار لگتی ہے۔ چہرے پر روایتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنے والے سہانے دنوں کے سپنے لئے وہ سب کو چائے پیش کرتی ہے۔ مہمان خواتین میں سے ایک ٹھوڈی تھام کر پیار سے ناقدانہ جائزہ لیتی ہے۔ خاتون کے اندر سے پسینے اور پرفیوم کی ملی جلی خوشبو آ رہی ہے۔ خاتون ہونے والی بہو کو متاثر کرنے کے لیے دھڑا دھڑ انگریزی کے الفاظ کا استعمال جاری رکھتی ہیں اور اسی دوران انگریزی لفظ کا تلفظ اتنا غلط بولتی ہیں کہ لڑکی کو ہنسی آ جاتی ہے۔ لڑکی ہنسی کنٹرول کرنے کے لیے منہ نیچے کر لیتی ہے جہاں اسے پرفیوم کی کم اور پسینے کی زیادہ بدبو آتی ہے۔ وہ پھڑکتے ہونٹوں کو سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کر لیتی ہے لیکن اس عمل سے ہنسی رخساروں اور آنکھوں میں ضدی بچوں کی طرح مچلنے لگتی ہے اور دفعتاً ہنسی تمام سرحدوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ ہونے والی ساس اچانک اپنے اوپر ہنسنے سے کھسیانی ہو کر خفگی سے چہرے جھٹکے سے چھوڑ دیتی ہے۔ اے ہے! کیا میرے سر پر سینگ دیکھ لئے جو ہنس رہی ہے۔ ارے بھئی ہمیں نہیں کرنی یہاں شادی..... ایسی لڑکی ہے بے شرمی سے ہنس رہی ہے توبہ توبہ!! یہ کہہ کر وہ یہ جا وہ جا!! گھر والے لڑکی کو اور لڑکی ہنسی کو کوستی رہ جاتی ہے۔

بہرحال ہنسی جسے لوگ چہرے کا حسن اور اخلاق کی جان قرار دیتے ہیں اکثر اوقات آپ کو اس بری طرح پھنسا دیتی ہے کہ آپ کے لیے عذاب جان بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہنسی آؤٹ آف کنٹرول رویہ ہے اور اکثر بلا اجازت یا بلاضرورت آ جاتی ہے اور جب آ جاتی ہے تو جاتی نہیں..... مگر جب جاتی ہے تو کباڑا کر کے ہی جاتی ہے۔

شاتم رسول (علیہ السلام) کو مفت مشورہ

لاکھوں کی ہے سکیورٹی ہر ''پھنے خاں'' کو
پھر بھی بچا سکے ہے نہ وہ اپنی جان کو
یہ مفت مشورہ ہے ہر اک حکمراں کو
قابو میں رکھو ذرا اپنی زبان کو

(میر وقار عزیز، راولپنڈی)

غزل

خنداں بنا دیا کبھی گریاں بنا دیا
دو دن کی زندگی نے پریشاں بنا دیا
اللہ رے سوز غم کی مسلسل نوازشیں
ہر داغ دل کو رشک چراغاں بنا دیا
حاضر تھے وہ تو روح دوراں حیات تھے
غائب ہوئے تو موت کا ساماں بنا دیا
اللہ رے زندگی کی پریشاں خیالیاں
دل کو حریف زلف پریشاں بنا دیا
رکھ لی جنوں نے آبلہ پائی کی میری لاج
کانٹوں کو رشک حسن گلستاں بنا دیا
اللہ چشم مخمور کا اثر امتیاز
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں بنا دیا

(ایس۔امتیاز احمد۔کراچی)

احوال وطن

فصل گل میں نوحہ کناں رنجیدہ ہیں بلبلیں
خزاں رسیدہ چمن میں صبح بہاراں آئے کہاں
موسم برشگال گرم و خشک ہواؤں نے چاٹ لیا
برسات بھرے بادل آسمان پہ نظر آئیں کہاں
چمن میں نام کے جانبازوں کی ٹولیاں نظر آتی رہیں
گھمسان کا رن پڑا ہو تب سچے جانثار نظر آئیں کہاں
خوب جانتے ہیں وہ جو کی غلائی کرتے رہے
وقت فصل گندم کے خوشے انہیں نظر آئیں کہاں
اوروں کے لیے جو کانٹوں کی سیج بچھاتے ہیں
خود پھولوں کی تمنا رکھتے ہیں پھول ان کیلئے آئیں کہاں
جھوٹ فریب افراتفری کا جہاں کھیل رچا ہو
انسانیت کی تذلیل ہو ہوتی رحمت کے فرشتے آئیں کہاں
قول وفعل میں فرق لوگ جھوٹ کی مالا جپتے ہوں
آپس میں اعتماد بھروسہ لوگوں میں پھر آئے کہاں
جس دیس میں جعلی پیر اور نقلی عالم بستے ہوں
پبلک میں اخلاق کا بندھن ناپختہ اسلام کی خوشبو آئے کہاں
میڈیا میں جہاں لکھنے والی کالی بھیڑیں بستی ہوں
کیے ہوئے ان جرم کے بندوں میں ضمیر کی چبھن آئے کہاں
قیادت جھوٹ پلندہ کرپشن ان کا دھندہ ہو
اپنے دامن داغدار اوروں پہ کیچڑ پھینکتے ہیں
ہر دن جھوٹے وعدوں پر پبلک کو دھوکہ دیتے ہیں
ہر عمل میں ان کے خیانت دغا فریب جھلکتے ہیں
بے بصیرت ہیں یہ لوگ خود کو دھوکہ دیتے ہیں
ایسی صفی قیادت میں ایماں کی حرارت آئے کہاں

(قاضی محمد یوسف، مستط)

محبت حرف اول ہے

محبت حرف اول ہے، محبت حرف آخر ہے
محبت زندگی کا، روشنی کا استعارہ ہے
محبت بے کنارہ ہے
محبت خالق اول کی ہستی کا
نظارہ ہے، اشارہ ہے
محبت نور اول ہے، محبت نور آخر ہے

www.urdukorner.com

محبت اک ستارہ ہے، محبت روزِ اول سے
محبت روزِ محشر تک، سہارا ہی سہارا ہے
کبھی فرہاد اور مجنوں، کبھی سسی کبھی پنوں
کبھی رانجھا کبھی لیلیٰ، کہیں پر ہیر اور شیریں
یہ بن کر گنگناتی ہے، حسین لمحات لاتی ہے
عجب سی گدگداتی ہے......
سہانے گیت گاتی ہے، کہیں نغمے سناتی ہے
کہیں پلکوں کی جھالر سے......
گرم آنسو بہاتی ہے
کہیں پر مرثیہ بن کر
کہیں نوحہ خوانی سے
دلوں سے سوز و اشک و درد کے
نالے بہاتی ہے، کہیں پر تلملاتی ہے
کبھی یہ ڈگمگاتی ہے
مگر اس کا سفر جو عشق ہے
جاری ہی رہتا ہے
محبت عکسِ خالق ہے
اگر خلقت کو دیکھو تم!
ذرا مخلوق کو سمجھو......
ذرا باطن میں تم جھانکو!
محبت ظاہر و باطن کا اک
حسین نظارہ ہے
محبت کیف و مستی ہے
محبت رازِ ہستی ہے
محبت ہر زمانے میں!
امر رہتی ہے، رکھتی ہے......
محبت میرا آہنگ ہے، محبت سب کا آہنگ ہے
کہیں یہ پھول سی کومل......
کہیں پر تیشہ و سنگ ہے
محبت ایک نعمت ہے
کہیں اُلفت، رفاقت ہے
کہیں رحمت، صداقت ہے
محبت حوصلہ دیتی ہے، دیتی ہے یہ جگر ابھی!
کہیں بے باک کرتی ہے
کہیں جری بناتی ہے، یہ سو سو زخم کھاتی ہے
ہمیشہ مسکراتی ہے
زمانے کے زخم کھا کر......
ہمیشہ مسکراتی ہے
محبت حرفِ اول ہے، محبت حرفِ آخر ہے
(ڈاکٹر سید نعیم احمد)

غزل

جب بھی وہ یاد مجھے آیا ہے
دل میں اک درد اُبھر آیا ہے
بے چینی، آسیب زدہ ماحول
اس شہر میں یہی کچھ پایا ہے
کڑی دھوپ کا سفر ہے لوگو!
چاروں طرف نہ کوئی سایہ ہے
رات کے پچھلے پہر کی خاموشی
پھر اپنا کوئی مجھے یاد آیا ہے
کتنے ظالم لوگوں سے واسطہ پڑا میرا
خود ہی قتل کیا خود ہی کندھا بھی دیا ہے
سولی پہ چڑھا دیا مجھے لوگوں نے
منصف اپنے شہر میں نہیں کوئی نظر آیا ہے
فصیلِ شہر پہ جا کے کون باہر دیکھے
شہر کے اندر نہ مجھے کچھ نظر آیا ہے
(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

بنا فقر سبھی چاہتے ہیں یہاں سرفرازی کیا
وہ پیر ہوں مرید ہوں یا نمازی کیا

عشق تو ہے منتہائے جذبۂ آفاقیت
پھر اس میں حقیقی کیا اور مجازی کیا
لذت اجل سے ہو نہ سکا آشنا جو خضر
چاہیے تھی اسے ایسی عمر درازی کیا
سکون لحد تو ترے اعمال میں ہے پنہاں
زمیں یہاں کی کیا اور خاک حجازی کیا
آتا نہیں لمحۂ ہجر و وصال دوبارہ کبھی
گئے دنوں کو دینی حیثیت امتیازی کیا
علم وہ جو دل میں سمائے پھر عمل بن جائے
بھلا کرے عارضی یادداشت علم کی غمازی کیا
کامل نہیں ایمان و یقیں اگر تو عبادت کیسی
اندیشہ ہائے دل ترا اور ظاہری پاک بازی کیا
دولت غم نے ہی بخشی ہے آہ سحرگاہی
دل عطار ہو رومی ہو یا رازی کیا
(عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم)

دسمبر اور تم

دسمبر پھر چلا آیا
ابھی تو کل گیا تھا یہ
یہ اتنی جلدی ”لوٹے“ گا
مجھے معلوم نہ تھا یہ
مجھے حیرت ہوئی ہے آج
ذہن میں برق سی دوڑی
ابھی کل کی ہی باتیں ہیں
بچھڑ کے تم گئے تھے جب
ابھی کل کی ہی راتیں ہیں
گزاری کروٹیں لے کر
یہ اتنی جلدی لوٹے گا
مجھے معلوم نہ تھا یہ
دسمبر پھر چلا آیا
ابھی تو کل گیا تھا یہ
دسمبر آ گیا ہے تو!
چلے آؤ کہاں ہو تم؟
تمہیں بھاتے تھے جو کپڑے
پہن کر آج بیٹھی ہوں
دسمبر لوٹ سکتا ہے تو!
تم بھی لوٹ سکتے ہو!
(یاسمین کنول، پسرور ضلع سیالکوٹ)

لوری

میری آنکھوں کا تارا
میرا منا پیارا
مرے دل کا سرور
مجھے کر دے مسرور
اس کے ہونٹوں کی ہنسی
غم کی کر دے نفی
اس کے چہرے پہ نور
جیسے رب کا ظہور
میرے گھر کی خوشی
ہے اسی سے جڑی
تو نہ ملتا مجھے
کیسے پاتی تجھے
تیرے لب کی غوں غوں
جیسے ہو اللہ ہو
ہے سکوں کا نشاں
پیار کا اک جہاں
”رہتا دل میں سدا
لب پہ ہے یہ دعا
گود میں نور ہے
چین کی نیند لے
میری تکمیل ہے تو ہاں
تو کہے تو میں ماں

www.urdukorner.com

(فریدہ خانم، لاہور)

لالچ

اک شخص نے سنائی
قصبے میں تھا قصائی
جب ہڈی اس نے پھینکی
کتے نے جھٹ..... اٹھائی
غرایا چل پڑا وہ
کتوں میں نہ کھڑا وہ
کچھ سوچ کر وہ دوڑا
قصبے کو پیچھے چھوڑا
تھا نہر کا کنارا
رستہ تھا لمبا چوڑا
اشجار جھومتے تھے
طیور گا رہے تھے
بہتا تھا تیز پانی
کتے کی تھی جوانی
رستہ میں رک گیا وہ
کھانے کو ہڈی نکالی
دیکھی کھجور کی پل
ترچھی قصور کی پل
اب کتا پل پہ آیا
پانی میں کتا پایا
ہڈی بڑی وہ سمجھا
تھا اس کا اپنا سایہ
فوراً زقند لگائی
ہڈی تھی جو گنوائی
لالچ کبھی نہ کرنا
قناعت میں تم ابھرنا
بن کر عظیم..... جینا
دنیا سے یوں گزرنا

کوئی تو کہہ گیا ہے
لالچ بری بلا ہے

(ظفر تنہا، ملتان)

غزل

گزر گئی شب غم، یار بھی دل دکھانے آئے
ہجر کی راتوں میں کوئی شمع جلانے آئے
جو کہتے تھے ہم تیرے ہیں آخر ہوئے بیگانے
دل خوش فہم کو امید وفا دلانے آئے
جو خفا ہے ہم سے گزرے موسموں کی طرح
کوئی تو میرے صحن گلشن میں پھول کھلانے آئے
خاموش ہے ساری فضا تیرے جانے سے
یار بھی پرانے قرض وفا کا چکانے آئے
ٹھوکر ایسی کھائی ہم نے تیرے عشق میں جاوید
داغ جدائیوں کے پھر سے کوئی مٹانے آئے

(محمد اسلم جاوید، فیصل آباد)

نظم

اپنا دکھ پنہاں رکھنا
اے دکھی لڑکی، اے بھولی بھالی لڑکی
تیرا دل دکھوں کی آماجگاہ ہے
مگر تو پھر بھی
اپنے دکھوں کی اس پٹاری کو
نہ کھولنا
اس کو ہمیشہ بند ہی رکھنا
کسی سے کچھ نہ کہنا
نہ ہواؤں سے
نہ فضاؤں سے
نہ پنچھیوں سے
نہ سکھیوں سے
نہ اڑتے پتوں سے
کہ یہ سب تمہارا

فاش کردیں گے
کیونکہ یہ کیا جانیں
تیرے اندر کی
بے تابیوں کو
تیری حساس طبیعت کو
تیری لحہ لحہ
بھیگتی پلکوں کو
تیری آنکھوں میں
تیرے ہر پل آنسوؤں
کے دھاروں کو
جو کسی بھی لمحے آنکھوں سے
بن برسات کے برسنے کو
تیار رہتے ہیں
اے دکھی لڑکی، بھولی بھالی لڑکی
بس خاموش رہ
کہ اگر تو نے
اپنا دکھ عیاں کردیا تو
زمانہ تو
پہلے ہی ناانصاف ہے
کیونکہ یہ کیا جانیں
تعصب سے بھرا پڑا ہے
یہ تیرا جینا دوبھر
کردے گا
بس خاموش رہ
بس خاموش رہ

(مہر نسیم، لاہور کینٹ)

غزل

محبت کا روگ لگا کے بہت پچھتائے
نیند اڑی راتوں کی، یاد تری ستائے
کاش کے محبت کی شدت اتنی ہوا!
دل اپنا ٹوٹ بھی ساتھی مری طرح جلائے
تقاضائے عشق ہے اب دید ہو تمہاری
بہت ہو گیا، جدائی میں بہت دن بتائے
تم آ بھی جاؤ دل کے سونے گلشن میں صدف
زمانے زہر میں بجھتے تیر گو بہت چلائے

(نسیم سکینہ صدف، ڈسکہ)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر چسپاں کریں

نام:..... تعلیمی قابلیت:.....
عمر:..... پسندیدہ شاعر:.....
پسندیدہ غزل/نظم:.....
مشاغل:..... تاریخ پیدائش/برج:.....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:..... پتہ:.....
ای میل:.....

نوٹ: اپنی پسندیدہ شاعری کا انتخاب، مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجیے۔

www.urdukorner.com

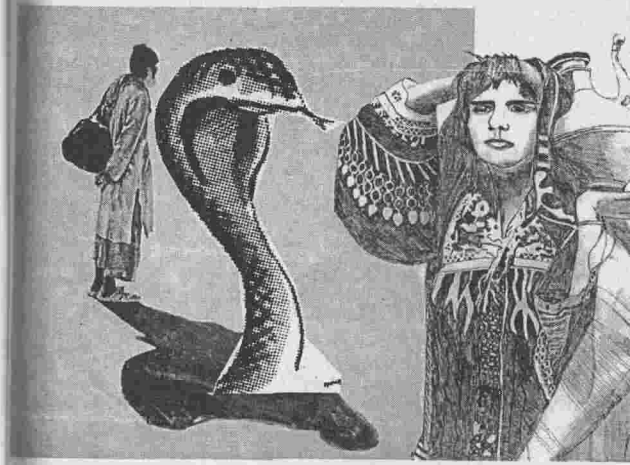

ناگ دیوتا کا شکار

یوسف علی

اگر اس ناگ کی جگہ کوئی شیر یا ہاتھی ہوتا تو بڑی مشکل سے میرا پہلا حملہ برداشت کرتا اور کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر اس ناگ نے مجھے مبہوت کر رکھا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ وہ میری شکاری زندگی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

ایک پراسرار سانپ کے شکار کا حیرت انگیز واقعہ، راوی کا اصرار ہے کہ تمام واقعات من وعن سچے ہیں!

آج بھی جب مجھے اس ناگ کا خیال آتا ہے تو کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ناگ جو انسان بن جاتا تھا، جس نے گاؤں والوں کا جینا حرام کر رکھا تھا، جو نہ جانے کس بات کا انتقام لے رہا تھا۔ اس کے وار گاؤں کی حسین اور نازک اندام دوشیزاؤں پر ہوتے۔ وہ جس لڑکی پر حملہ کرتا اس کا انجام بہت المناک ہوتا۔ وہ لڑکی بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتی مگر روحانی طور پر اس کے دل میں اس کی دہشت بیٹھ جاتی اور وہ آہستہ آہستہ سوکھ کر چپ دق کے مریض کی طرح دم توڑ دیتی۔

مجھے اب خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ تین ماہ مسلسل محنت اور جانفشانی کے بعد میں نے کس طرح اس ناگ کا سراغ لگا لیا۔

میں شیر کے شکار کا شوقین تھا۔ تمام شکاروں سے زیادہ دلچسپ اور خطرناک شکار شیر ہی کا ہوتا ہے لیکن اس ناگ کا شکار شیر کے شکار سے زیادہ دلچسپ اور خطرناک ثابت ہوا۔ رات کی تاریکی میں جب شیر جنگل میں دھاڑتا ہے تو بڑے بڑے سورماؤں اور بہادروں کا پانی کر دیتا ہے لیکن وہ ناگ جو اپنی ہیئت بدل لیتا تھا، شیروں سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ شیر کے شکار میں گزرا ہے۔ میں کبھی اتنا ہراساں نہ ہوا تھا جتنا اس ناگ سے ہوا۔ اس قسم کی واردات پہلے کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ میں بڑے بڑے خطرناک آدم خور شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مار چکا تھا، مگر اس ناگ کا نام سن کر تو مجھے پسینہ آ جاتا۔

میرے پاس میری رفیق تھری ناٹ تھری ہر وقت رہتی تھی۔ اس میں بیک وقت بارہ گولیاں بھرتی تھیں۔ وہ رائفل میں نے جرمنی سے منگوائی تھی۔ میں نے ہانگ کانگ کی بنی ہوئی ایک مضبوط ٹارچ لے کر اس کی نال پر فٹ کر رکھی تھی۔ میں رات کی تاریکی میں خونخوار سے خونخوار جنگل میں بھی جا سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری انگلی کی ذرا سی حرکت ہاتھی کو بھی موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

اپنے ایک عزیز کے بلانے پر میں اس گاؤں میں پہنچا۔ سانپ کے متعلق افواہ اڑ چکی تھی کہ ایک بہت بڑا سیاہ رنگ کا ناگ جنگل کی طرف رہتا ہے مگر کوئی اور خاص بات نہ ہوئی تھی۔ میرے جانے سے بیشتر دو تین عورتیں مر چکی تھیں، جن کی موت کا اصل سبب کسی کو معلوم نہ تھا۔ عام خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی موت تپ دق کی طرح کے کسی مرض سے ہوئی ہے۔ جب میں اس گاؤں میں پہنچا تو ناگ کا خوف چھایا ہوا تھا۔ ابھی تک اسے کسی نے انسانی روپ میں نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ سانپ عموماً ندی کی طرف دیکھا گیا ہے۔

میں اسی شام ندی کی طرف نکل گیا۔

گاؤں کے مشرق اور شمال میں جنگل تھا۔ مغرب میں ایک پہاڑ تھا جس کے دامن میں گاؤں واقع تھا۔ اس پہاڑ سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو دریائے نربدا کے کنارے تک واقع تھا اور جنوب میں ایک قطعۂ زمین تھا۔ حکومت نے پہاڑی ندی کاٹ کر زمین کے اس قطعے کو سیراب کر دیا تھا۔ گاؤں کے جنوب میں ایک سرکاری ڈاک بنگلہ تھا، جس میں چند سرکاری فارسٹ آفیسر رہتے تھے۔ میں شام کے وقت پل پر پہنچا۔ ندی پر ایک عارضی سا پل بنا ہوا تھا۔ وہ پل غالباً گاؤں والوں نے جنگل سے لکڑیاں لانے کے لیے بنایا ہوا تھا۔ جب میں پل پر پہنچا تو وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جنگل کی طرف بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی اور عجیب خوفناک تھیں۔ میں نے اپنے جسم میں کپکپاہٹ سی محسوس کی۔ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی اور خاموشی سے قریب سے گزر کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

سورج غروب ہونے سے نصف گھنٹہ بیشتر میں واپس لوٹا۔ وہ آدمی پل پر سے جا چکا تھا۔ میں چند لمحے پل پر کھڑا ہوا بہتے ہوئے شفاف پانی کو دیکھتا رہا۔ پانی چپکے چپکے بہہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پانی کی رفتار اور وقت کی رفتار میں کتنی یکسانیت ہے۔ جس طرح وقت واپس نہیں آتا اسی طرح

www.urdukorner.com

یہاں سے گزرا ہوا پانی بھی واپس نہیں آ سکتا۔ دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ جنگل میں بھیانک سناٹا چھا چکا ہے۔ تمام پرندے جو چند لمحے پیشتر چہچہا رہے تھے اچانک خاموش ہو گئے ہیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اچانک میری نظر بیس گز دور ایک سیاہ رنگ کے ناگ پر پڑی۔ وہ ناگ ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کپکپی محسوس کی۔ اس سے آنکھیں ملتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی انجانی قوت نے مجھے مفلوج کر دیا ہے۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میری نظریں ناگ پر تھیں۔ میں پوری قوت سے سنبھلا۔ میں نے رائفل کا رُخ ناگ کی طرف پھیرا۔ صرف دو سیکنڈ کے لیے میں نے ناگ سے نظریں ہٹا کر نشانہ لیا۔

جب میں نے دوبارہ وہاں دیکھا تو ناگ غائب تھا۔ میں حیران اور پریشان کھڑا رہ گیا۔ اس دن کے بعد ندی کی طرف جانا میرا معمول بن گیا۔ وہ ناگ مجھے پھر کبھی نہ دکھائی دیا البتہ اکثر اوقات مجھے وہ آدمی پل پر مل جاتا۔ وہ خاموش طبیعت اور پراسرار قسم کا انسان تھا۔ وہ باتیں بہت کم کرتا۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد وہ میرا خاصا بے تکلف دوست بن گیا۔ مجھے اس کا نام اور جائے رہائش کا علم نہ تھا اور نہ میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ مجھے جنگل میں ملتا اور وہیں جدا ہو جاتا۔

وہ پراسرار آدمی میرے ساتھ جنگل میں کافی دور تک چلا جاتا۔ اس کی قربت میں مجھے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہ ہوتا۔ میں اکثر شکار کی تلاش میں دریائے نربدا تک چلا جاتا۔ مجھے کسی قسم کا درندہ نہ ملتا۔ پھر بھی نہ جانے مجھے اس گاؤں سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی تھی۔ میرے عزیز رشتہ داروں نے مجھے ناگ مارنے کو بلایا تھا مگر اب ناگ کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھار اس کی کسی کو جھلک نظر آ جاتی۔ جب میں وہاں جاتا تو وہ غائب ہو چکا ہوتا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ناگ یہاں موجود ہے کیونکہ میں بذات خود اسے دیکھ چکا تھا۔

مجھے اس گاؤں میں پورا ہفتہ گزر گیا۔ ہمارے پڑوس میں ایک ہندو گھرانہ آباد تھا۔ ان کی ایک حسین اور نوجوان لڑکی کامنی تھی۔ کامنی کی آنکھوں میں بجلی کی چمک اور چہرے پر پھولوں کا نکھار تھا۔ وہ اکثر میرے عزیزوں کے ہاں آیا جایا کرتی تھی۔ چند دنوں سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ پریشان سی رہتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پریشانی کی وجہ پوچھنی چاہی مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ہفتے میں سوکھ کر کانٹا بن گئی۔ اس کے والدین پریشان تھے۔ انہوں نے بہت علاج کرایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ میرے چند دوستوں نے بتایا کہ اس بیماری سے پہلے بھی کئی عورتیں مر چکی ہیں۔ ایک ہفتہ بعد وہ سسک سسک کر موت کے منہ میں چلی گئی۔

مجھے کامنی کی جواں مرگی کا بہت افسوس تھا۔ افسوس تو سب کو تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی گہرا راز اپنے دل میں چھپا کر لے گئی ہے۔ میرے دل میں ایک بے چینی سی لگی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ مریضہ کے چہرے پر خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں نہ کہ بیماری کی رنگت۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا کہ وہ کون سا راز ہے جس نے کامنی کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ وہ کون سا درد ہے جس کے باعث کامنی نے وہ راز بتانے سے گریز کیا اور موت قبول کر لی لیکن مجھے اپنے ارادے میں کامیابی نہ ہوئی۔

کامنی کی موت کو ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ اب دیکھیے بیماری کس پر حملہ کرتی ہے۔ میں اس راز سے پردہ اٹھانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ وہ ناگ اب بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ کامنی کی موت کے بعد وہ پراسرار انسان میرے ساتھ گاؤں میں بھی آ جاتا۔ ایک ہفتہ انتظار کے بعد میں نے صفیہ کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے وہی آثار دیکھے جو کامنی کے چہرے پر تھے۔ کامنی کے بعد صفیہ گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور نازک اندام لڑکی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط بہت نازک تھے۔ جن عزیزوں کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہ ان کی رشتہ دار تھی۔

جب میں نے اس کی پریشانی بڑھتی دیکھی تو ایک دن پوچھ لیا مگر اس نے بات ٹال دی، جس سے میرا شوق تجسس بڑھتا گیا۔ میں نے صفیہ کی ہر حرکت کا جائزہ لینا شروع کر دیا لیکن میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ صفیہ بھی کچھ نہ بتا رہی تھی لیکن اس کی حالت تیزی سے ابتر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے رات کو صفیہ پر پہرا دینے کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن شام کے وقت میں جنگل سے واپس آ رہا تھا۔ وہ پراسرار آدمی بھی میرے ساتھ گاؤں میں آ گیا۔ جب ہم صفیہ کے مکان کے سامنے سے گزرے تو صفیہ دروازے پر کھڑی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر میرے ساتھ والے پراسرار آدمی پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا۔ وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ اس کی اس حرکت سے میرے دل میں شک سا پڑ گیا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں عشاء کے وقت گھر سے نکلا اور صفیہ کے دروازے کے سامنے باہر کی طرف ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اندھیری رات تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ میں صفیہ کے مکان پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آدھی رات تک مکان سے کوئی نہ نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور باہر نکلے گا۔ آدھی رات کے بعد میں اس طویل اور تلخ انتظار سے مایوس ہونے لگا۔ میں بیٹھا بیٹھا تھک چکا تھا۔ اب میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک مجھے جنگل کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ میں چونک کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے جنگل کی طرف سے ایک سفید سا سایہ آتا دکھائی دیا۔ جب وہ سایہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔

وہ صفیہ تھی۔

اگلے دن میں نے صفیہ کو گھر بلایا۔ اس کا چہرہ پہلے دن سے بھی زیادہ اداس اور غمزدہ تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے تپ دق کا مرض تیسرے درجے پر پہنچ چکا ہے۔

میں نے پوچھا ”صفیہ تمہیں کون سی بیماری ہے؟“ وہ بولی ”آپ کو وہم ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

میں نے کہا ”نادان نہ بنو، سچ سچ بتا دو تم کس مرض سے روز بروز گھلتی جاتی ہو۔“

وہ خاموش رہی۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا: ”صفیہ سچ بتانا تم کل رات کہاں سے آئی تھی۔“ وہ بولی ”بھائی میں کچھ نہیں بتا سکتی“

اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نامعلوم قوت سے دہشت زدہ ہے۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور رائفل دکھاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ دیکھو رائفل۔ اس میں بارہ گولیاں بیک وقت بھرتی

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com

ہیں۔ میں بڑے بڑے آدم خور شیروں کو مار چکا ہوں۔ تم بتاؤ تمہیں کیا خطرہ ہے تاکہ میں تمہاری جان بچا سکوں۔ اگر میں مارا بھی گیا تو میرے بعد پالی میرا اور تمہارا انتقام لے گی۔

صفیہ نے میری طرف دیکھا۔ کوئی غیر مرئی قوت اسے بولنے سے روک رہی تھی۔ میں نے پھر کہا، ”دیکھو صفیہ! اگر تم نے مجھے کچھ نہ بتایا تو تمہیں کامنی کی طرح سسک سسک کر مرنا پڑے گا۔ تمہارے بعد نہ جانے کس کی باری آئے۔ اب تم موت سے ڈر کر وہ راز چھپا رہی ہو جو تمہیں موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔ اگر تم مجھے بتا دو تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اور گاؤں والوں کو اس مصیبت سے بچا سکوں۔“

وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر بولی: اچھا سنو! میں زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر یہ راز بتانے لگی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور میرے قریب آ کر بولی:

”مجھے امید ہے کہ آپ کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ شاید مجھے تو نہ بچا سکیں لیکن گاؤں والوں کو ضرور بچا لیں گے اور پالی کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ میری خوبصورتی میرے لیے وبال جان بنی۔ ہاں تو میں آپ کو اصل راز بتاؤں۔ وہ یہ کہ کل شام آپ کے ساتھ جو آدمی آ رہا تھا ......وہ انسان نہیں ناگ ہے۔“

یہ الفاظ ابھی اس کی زبان ہی پر تھے کہ یکایک دروازہ کھل گیا۔ میں نے اور صفیہ نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔ صفیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ بولی ”ناگ آ گیا۔“ میں نے رائفل اٹھائی، اسی لمحے چھت سے ایک باریک سانپ صفیہ کے سر پر گرا۔ اس نے چیخ ماری اور گر کر تڑپنے لگی۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں بھاگ کر دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ باریک سانپ نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ گھر کے تمام افراد جمع ہو گئے۔ صفیہ دم توڑ رہی تھی۔ میں خوف سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے دم توڑ دیا۔

میں زندگی میں کبھی اتنا خوفزدہ اور ہراساں نہیں ہوا تھا جتنا اس ناگ سے ہوا۔ صفیہ کی موت کوئی ایسی موت نہ تھی جسے میں جلد فراموش کر دیتا۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ ضرور اس ناگ سے نپٹوں گا۔ میں کبھی آدم خور شیروں سے نہ گھبرایا تھا۔ بے شمار شیروں کا شکار کیا تھا لیکن اس ناگ نے میرے حواس کھو دیے۔ اگر وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اندھا دھند بارہ گولیاں اس کے وجود میں گزار کر دوبارہ رائفل بھر لیتا۔

دوسرے دن میں بڑی مستقل مزاجی سے ناگ کے مقابلے کو نکلا۔ میں ندی پر پہنچ گیا۔ پل پر وہ آدمی نہ تھا جسے صفیہ نے ناگ بتایا تھا۔ پہلے وہ ہر روز ہوا کرتا تھا۔ غالباً اسے میرے ارادے کا علم ہو چکا تھا۔ اس کو علم تو پہلے ہی تھا۔ اس کے باوجود وہ میرے ساتھ رہتا۔ میں اس کو کئی بار بتا چکا تھا کہ میں ایک ناگ کو مارنے آیا ہوں۔ جب میں اس کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں مجھے ایک چمک اور کشش نظر آتی اور مجھے اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ میرا مضحکہ اڑا رہا ہے لیکن میں نے کبھی توجہ نہ دی۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کو دوست بنا چکا ہوں اور اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں اسی کی خاطر آیا ہوں۔

آج میں سوچ رہا تھا کہ میری بے وقوفی سے

www.urdukorner.com

میرے دشمن کو میرے عزائم کا علم ہو چکا ہے۔ اس انکشاف کے بعد مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ میرا بدترین دشمن بن چکا ہوگا۔ اب وہ کبھی میرے سامنے نہ آئے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اپنا وار بچا کر مجھ پر حملہ کر دے۔ میں نے اس ناگ کی نسل کے متعلق لوگوں سے بہت حیرت انگیز اور عجیب و غریب باتیں سنی تھیں۔ سانپوں کی یہ خاص نسل جنوبی ہندوستان کے ان پہاڑوں اور جنگلوں میں پائی جاتی تھی جو بمبئی سے لے کر جبل پور تک دریائے نربدا کے دونوں طرف ہیں۔ یہ سانپ عمر کے خاص حصے پر پہنچ کر اپنی مرضی کے مطابق خود کو ہر حجم کے وجود میں ڈھال لیتا ہے، ہر بھیس بدل سکتا ہے۔ جوں جوں میں ان ناگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میرا خوف بڑھ رہا تھا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ناگ دوبارہ کہیں دکھائی نہ دیا البتہ اس نے گاؤں کے بہت سے افراد لقمہ بنا لیے۔ گاؤں خوف و ہراس کی لپیٹ میں تھا۔ ان حادثات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میرے خلاف ناگ کا یہ اعلان جنگ تھا۔ وہ ناگ مجھے دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ میری راتوں کی نیند اور دل کا سکون تباہ ہو گیا۔ مجھے اس ناگ کی جستجو تھی۔ فریقین میں باقاعدہ اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ میں ہر وقت محتاط رہتا۔ میں نے گاؤں والوں کا بھی بہت انتظام کر دیا لیکن اس کے باوجود ایک لڑکا اس کی زد میں آ گیا۔

ہوا یوں کہ ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں کلہاڑی لے کر جنگل کی طرف لکڑیاں لینے کی غرض سے نکل گیا۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ بے فکری سے ندی کا پل عبور کر کے جنگل میں جا داخل ہوا۔ جب وہ جنگل میں پل سے دس قدم دور گیا تو اسے ناگ کی پھنکار سنائی دی۔ وہ خوفزدہ ہو کر واپس پلٹا۔ جب اس نے ایک پاؤں پل پر رکھا تو ناگ قریب کی گھنی جھاڑی سے پھنکارتا ہوا نکلا۔ لڑکے کی نظر اس پر پڑی تو وہ سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس میں اتنی ہمت نہ پیدا ہو سکی کہ وہ بھاگ کر پل عبور کرتا یا چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلاتا۔ ناگ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ناگ نے جب اسے منہ میں دبایا تو اس کے منہ سے صرف ایک ہی دلدوز چیخ نکلی جو ڈیڑھ فرلانگ دور گاؤں میں سنائی دی۔

میں جب وہاں پہنچا تو بہت سے لوگ افسردہ اور ملول چہرے لیے واپس آ رہے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تمام واقعہ مجھے سنایا۔ میں خود جائے واردات پر پہنچا۔ چند آدمی میرے ساتھ تھے۔ میں نے وہاں نشانات دیکھنے کی کوشش کی۔ پل سے تین قدم دور تک لڑکے کے گھسٹنے کے نشانوں کے علاوہ صرف سانپ کی لکیر تھی، جو تعاقب کرنے پر چند گھنی جھاڑیوں سے گزر کر گھاس پر غائب ہو گئی۔

ناگ زیادہ تر لوگوں کو اپنی ایک جھلک دکھا کر بدحواس کر دیتا۔ اگر کوئی اکیلا دکیلا مل جاتا تو حملہ کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ جب میں وہاں جاتا تو وہ غائب ہو چکا ہوتا۔ ایک دن میں شام کے وقت بندوق صاف کر رہا تھا کہ دو نوجوان لڑکے بدحواسی سے بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے ان کی حالت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے وہ بولے ''ناگ ہمارے پیچھے بھاگا۔''

''کہاں؟'' میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا ''ہم کھیتوں سے واپس آ رہے تھے۔ جب ہم

راستے میں ٹیلے والی جھاڑیوں کے قریب پہنچے تو وہ وہاں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ ہم نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو وہ پھنکار کر ہماری طرف لپکا لیکن ہم بھاگ نکلے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سیدھے یہیں آئے ہیں۔'' میں نے جلدی سے بندوق ٹھیک کی۔ اس میں گولیاں بھریں اور ان کو لے کر اس جگہ پہنچا جہاں ان کے کہنے کے مطابق ناگ ان کے پیچھے بھاگا تھا۔ میں نے سراغ لگانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی لکیر اس محدود ٹیلے سے آگے نہ گئی۔ میں نے وہ چند جھاڑیاں اچھی طرح دیکھیں مگر ناگ وہاں نہ تھا۔

قریباً ایک ماہ اور گزر گیا۔ مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اتنا بڑا جنگل ہونے کے باوجود ندی کے پل کے قریب محدود علاقے میں رہتا۔ کبھی کبھی وہ کسانوں کے کھیتوں کی طرف جا نکلتا۔ کسانوں نے منہ اندھیرے باہر نکلنا بند کر دیا۔ ادھر سرشام گھروں میں دبک جاتے۔ ایک دن میں صبح سویرے چاند کی مدھم روشنی میں کھیتوں سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ ہوا ساکن ہونے کی وجہ سے جنگل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ درختوں کے نیچے فضا پرسکون اور فرحت بخش تھی۔ میں ندی کے کنارے کنارے پل کی طرف آ رہا تھا۔ پل سے قریباً تیس قدم دور دو گھنے درختوں کے نیچے مجھے ناگ کی خفیف سی جھلک دکھائی دی۔ میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ درختوں کی وجہ سے وہاں خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک جھاڑی کی اوٹ لی۔ پہلے میں نے اپنا وہم اور فریب نظر سمجھا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے جھاڑی کے ایک طرف سے دیکھا۔ مجھے ناگ کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے اپنے جسم میں کپکپاہٹ سی محسوس کی اور رائفل سیدھی کی۔

اچانک رائفل سے دو شعلے نکلے۔ فائروں کی آواز سے جنگل لرز اٹھا۔ پرندوں نے شور مچا دیا۔ میں نے ٹارچ جلا کر دیکھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ میری پریشانی اور بدحواسی کی حد نہ رہی۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں حیران اور پریشان تھا کہ اس نئے دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اگر وہ کوئی درندہ ہوتا تو کبھی کا جہنم واصل ہو چکا ہوتا لیکن اس ناگ نے میری قوت فیصلہ سلب کر لی۔ جب میری قوت فیصلہ نے جواب دے دیا تو میں نے چند بزرگوں اور جوگیوں سے مشورہ کیا۔

انہوں نے کہا ''تم پہلے اس کی جائے رہائش معلوم کرو۔ پل کے قریب ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ یہ ندی کے پل کے قریب محدود علاقے میں رہتا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ اگر تم نے اس کا سکن تلاش کر لیا تو سمجھو اس موذی کو مار لیا۔ یہ نیند کی حالت میں قابو آئے گا نیز یہ بھی خیال رکھو تمہاری ذرا سی غلطی یا لغزش تمہارے تمام منصوبے خاک میں ملا سکتی ہے۔ وہ بہت ہوشیار ہو چکا ہے۔ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اس کو تلاش کرنا۔''

گاؤں والے اب اس قدر خوفزدہ ہو چکے تھے کہ سرشام ہی گھروں میں گھس جاتے اور گاؤں میں بے کراں سناٹا چھا جاتا۔ رات کی تاریکی میں ناگ کی خوفناک پھنکاریں سنائی دیتیں، جن سے بچے بوڑھے اور جوان سبھی خوف کھاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا دل بھی خوف سے کانپ اٹھتا۔ روز بروز ناگ کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں بھی آ جاتا۔ یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں ہوتا۔ روشنی ہونے سے قبل وہ چلا جاتا۔ میں چاندنی راتوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے حکومت کو درخواستیں بھی دیں مگر شنوائی نہ ہوئی۔ گاؤں والے

www.urdukorner.com

میرے دم دلاسے سے ابھی تک وہاں تھے ورنہ کبھی کے بھاگ چکے ہوتے۔ میں نے ان سب کے سامنے ناگ کو مارنے کا عہد کیا تھا۔

رات کو جب ماحول پرسکون ہو جاتا تو جنگل کی طرف سے خوفناک چنگاڑیں سنائی دیتیں۔ وہ بتدریج بڑھتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو جاتیں۔ کبھی کبھی میں اندھیرے میں اس کی آواز قریب سے سن کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا مگر میں اس کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا دل چاہتا کہ ابھی جا کر اس کو مار ڈالوں مگر رات کی خوفناک تاریکی میں باہر نکل کر اس کا مقابلہ کرنا سراسر حماقت ہی نہیں بلکہ اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ میں صرف اس کو دن کے اُجالے میں تلاش کرتا۔ اس کی لکیر پل سے تھوڑی دور تک میری رہنمائی کرتی۔ آگے جا کر گم ہو جاتی۔

ایک دن علی الصباح میں ندی سے گزر کر جنگل میں داخل ہوا۔ اچانک میری نظر ناگ کی لکیر پر پڑی۔ میں نے جھک کر غور سے دیکھا اور فوراً پہچان لیا کہ یہ اسی موذی کی لکیر ہے۔ میں لکیر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ لکیر کا ایک سرا جنگل میں جاتا تھا اور دوسرا پل کے قریب ندی کے کنارے پر اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں جاتا تھا۔ میں جنگل کی طرف ہو لیا۔ لکیر تازہ اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے واضح تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ناگ چند منٹ پہلے یہاں سے گزرا ہے۔ میں لکیر کے ساتھ ساتھ جنگل میں بہت دور تک چلا گیا۔ وہاں سے گھوم کر لکیر اسی ندی کے کنارے پر پل سے نصف میل دور آ گئی۔ اب میرا رخ پل کی طرف تھا۔

پل کے جنوب میں ایک فرلانگ دور ایک فرلانگ مربع جگہ میں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں سے پل کی طرف وہ لکیر نکلی تھی اور اب دوسری طرف سے ان جھاڑیوں ہی میں داخل ہو رہی تھی۔ میں ان جھاڑیوں کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اب ناگ سے سامنا ہو گا۔ میں پوری طرح مستعد تھا۔ تھوڑی دیر گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد میں خدا کا نام لے کر جھاڑیوں میں داخل ہوا۔ میں دھڑکتے دل اور کسی نامعلوم خوف سے لرزتا ہوا آگے بڑھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ دھوپ بڑھ رہی تھی میں دن کی روشنی میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آگے بڑھا۔ قریباً پانچ قدم چلنے کے بعد پانچ مربع گز زمین صاف نظر آئی۔ وہاں لکیر کے نشان صاف اور گہرے تھے۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔ وہاں جو منظر میں نے دیکھا اس سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے حواس گم ہونے لگے۔ ناگ کی لکیر اچانک غائب تھی۔ اس سے آگے کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگ کسی نامعلوم شکل میں مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں بدحواس ہو کر واپس مڑا۔

ابھی میں ان جھاڑیوں ہی میں تھا کہ مجھے ناگ کی خوفناک پھنکار سنائی دی جس سے میری روح لرز گئی۔ درختوں سے پرندے شور مچاتے ہوئے اُڑ گئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ جھاڑیوں کو توڑتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ میں بھاگ کر باہر نکلا۔ جب میں نے باہر آ کر اپنا جائزہ لیا تو دیکھا کہ میرے تمام کپڑے پسینے سے بھیگ چکے ہیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کانوں میں تیز سیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ندی کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مجھے کچھ دیر بعد ہوش آیا۔ جب میرے حواس درست ہوئے تو میں کچھ سوچتا ہوا پل کی طرف بڑھا۔

میں سوچ رہا تھا ”ناگ کا ٹھکانہ ان جھاڑیوں میں ہے لیکن دن کے وقت ناگ کی موجودگی میں وہاں پہنچنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر کسی وقت ناگ یہاں سے باہر دیکھا تو اس کی عدم موجودگی میں اس کا ٹھکانہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ذرا ہوشیاری اور پھرتی کی ضرورت ہے۔“

اگر اس ناگ کی جگہ کوئی شیر یا ہاتھی ہوتا تو بڑی مشکل سے میرا پہلا حملہ برداشت کرتا اور کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر اس ناگ نے مجھے مبہوت کر رکھا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ وہ میری شکاری زندگی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ وہ جوں جوں مجھے خوفزدہ کر رہا تھا میرے دل میں اس کو مارنے کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ نہ جانے میرا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا کہ اتنا خوف بھی مجھے باز نہ رکھ سکا۔ مجھے اس قسم کے خطرات سے ایک لذت سی محسوس ہوتی تھی جو شرابیوں کو شراب سے ہوا کرتی ہے!

اب اس ناگ کے ٹھکانے کا پتا لگانا آسان تھا۔ میں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اتفاق سے تیسرے دن مجھے موقع مل گیا۔ شام سے پہلے کوئی تین بجے کے قریب ایک آدمی میرے پاس آیا اور بولا ”حضور ناگ اس ٹیلے پر ہے جہاں ان دو لڑکوں کے پیچھے بھاگا تھا۔“

میں نے کہا ”تمہیں یقین ہے؟“

اس نے جواب دیا ”ہاں میں نے خود دیکھا ہے وہ مجھے دیکھ کر پھنکار اٹھا۔“

میں اتنا سنتے ہی اُٹھ کر بھاگ نکلا۔ وہ ٹیلہ گاؤں کی دوسری طرف تھا۔ سانپ کا ٹھکانہ دوسری طرف ندی کے پار تھا۔ میرا رُخ ندی کی طرف دیکھ کر اس آدمی نے کہا ”حضور! ٹیلہ ادھر ہے۔“ میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور جلد ہی ندی عبور کر کے جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔

میری آنکھیں تیزی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں کانوں سے اُلجھنوں میں پھنستا ہوا جلدی جلدی آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جھاڑیاں کافی پرانی معلوم ہوتی تھیں۔ تھوڑی دور جا کر آگے ایک ڈھلوان آ گئی جسے جھاڑیوں کے علاوہ جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اُتر کر آگے بڑھا۔

چند قدم نشیب میں چلنے کے بعد میں کافی گہرائی میں اُتر چکا تھا۔ اب میرے سامنے اور دائیں ہاتھ عمودی دیوار تھی، میرے عقب میں وہی ڈھلان تھی جسے عبور کر کے میں یہاں آیا تھا۔ بائیں ہاتھ بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ میں عمودی دیوار کے قریب جا کر رُک گیا۔ میں نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ رائفل احتیاط سے پکڑی اور چاروں طرف دیکھ کر ہر قسم کی آہٹ سے خبردار ہو کر آگے بڑھا۔ خوش قسمتی سے ہوا بند تھی۔ فضا میں حبس تھا، جس سے دور کی آہٹ با آسانی سنائی دے سکتی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا تاہم میں جرأت سے کام لے کر آگے بڑھا۔ دیوار کے ساتھ چار قدم دائیں طرف چلنے کے بعد مجھے ایک غار دکھائی دیا جس کا منہ کافی بڑا تھا۔ اس غار میں کافی آدمی سما سکتے تھے۔ میں آگے بڑھا۔ اس میں اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ جلا کر دیکھا وہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا لیکن میرے کان باہر سے ہر آہٹ کے منتظر تھے۔ میں دو تین قدم غار کے اندر آگے بڑھا۔

اس بڑے غار کے اندر ایک طرف مجھے ایک اور چھوٹا سا غار دکھائی دیا جسے ہم ناگ کا بل کہہ سکتے ہیں۔ چند لمحے جائزہ لینے کے بعد میں ناگ کے آ جانے کے ڈر سے واپس لوٹا۔ غار سے باہر نکل کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور واپس لوٹا۔ آتے وقت میں

www.urdukorner.com

نے ایک ٹہنی توڑ کر غار پر سے اپنے پیروں کے تمام نشان مٹا ڈالے اور مطمئن ہو کر واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں نے کھانا کھایا اور ناگ کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ زندگی کا موت کا فیصلہ! میں نے اُٹھ کر بندوق اور ٹارچ دوبارہ ٹیسٹ کی۔ آیا وہ صحیح کام کر رہی ہیں یا نہیں۔ کہیں وقت پر دھوکہ تو نہ دے جائیں گی۔ بہرحال ان کی طرف سے مطمئن ہو کر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر علی الصبح چاند کی مدھم اور دلفریب روشنی میں موت کے منہ کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا چل رہی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ جانوروں کے علاوہ انسانوں کو بھی تھپک تھپک کر سلایا کرتی ہے۔ میں نے ربڑ کے فلیٹ پہن رکھے تھے، جن کی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی۔ پھر بھی میں دبے قدموں سے چلتا ہوا ان جھاڑیوں میں داخل ہوا جہاں ایک دن قبل ناگ کا غار دیکھ چکا تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ نشیب عبور کر چکا تھا۔ عمودی دیوار کے قریب پہنچ کر مجھے کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ ہوا ساکن تھی۔ جنگل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ دور کہیں جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ میرے قدم رُک گئے۔ میں نے ستائیسویں رات کے چاند کی طرف دیکھا۔ مجھے خیال آیا شاید میں دوبارہ یہ چاند اور ستارے نہ دیکھ سکوں۔ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔

میں جلد ہی سنبھل گیا۔ اس قسم کے خیالات اکثر انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ میں نے ذہن سے بزدلانہ خیالات کو جھٹک دیا اور سنبھل کر غار کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد میں غار کے منہ کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اچانک سانسوں کی آواز بند ہو گئی۔ ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو چکا ہے۔ فضا میں خاصی خنکی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد غار سے مجھے دوبارہ انسانی خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ان خراٹوں کا مطلب تھا کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور غار کے عین سامنے کھڑا ہو کر اندر جھانکنے لگا۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا۔ رائفل پر فٹ کی ہوئی ٹارچ سے روشنی کی تیز لکیر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے فائر کر دیئے۔ وہ ناگ بن کر تڑپنے لگا۔ چند لمحے تڑپا، پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے بدحواسی میں بہت سے فائر جھونک دیئے۔ وہ مجھ سے دو تین قدم دور گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ بندوق کی آواز سے تمام جنگل جاگ اُٹھا تھا۔ پرندے شور مچا رہے تھے اور میرے سر پر چکر لگا رہے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مشرق سے سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ ستارے ماند پڑ رہے تھے۔ چاند کا حسن پھیکا ہو رہا تھا۔ کائنات کے خاموش وجود میں زندگی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں فوراً واپس گاؤں کی طرف پلٹا۔ گاؤں والے امید و بیم میں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جب انہیں یہ خوشخبری سنائی تو انہوں نے خوشی سے مجھے کندھوں پر اُٹھا لیا اور اُچھلنے لگے۔ اس طرح پہاڑی گاؤں والوں کو خوفناک بلا سے نجات ملی۔

ملگجی عورت

فہمیدہ کوثر

''ارے وہ دیکھ'' ایک عورت نے اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا ملگجی عورت جست لگا کر اس کنویں میں چلی گئی جس کو شعلوں نے گھیر رکھا تھا۔ ملگجی عورت کے سامنے تو اس کا بھائی تھا۔ وہ آوازیں دے رہی تھی۔ ''برکت تُو کہاں ہے۔''

ایک عورت کی کہانی جس کے وجود سے سب تنگ تھے

''جب سے وہ اس بستی میں آئی ہے بستی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔'' زلیخا نے دبے دبے لہجے میں حاجرہ کے کان میں کہا۔

''ہاں کچھ یونہی لگتا ہے'' حاجرہ نے تائید کی۔

''صورت دیکھ کتنی معصوم اور بھولی بھالی ہے لیکن حرکتیں دیکھ توبہ توبہ'' زلیخا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ملگجے کپڑوں میں ملبوس عورت نے ایک نظر ان دونوں کی طرف دوڑائی اور اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔

''سنا ہے! اس کا سائیں بہت عرصہ پہلے اس

www.urdukorner.com

کو چھوڑ کر چلا گیا تھا"

قریب بیٹھی ایک عورت نے کہا۔

"رب نواز کے گھر سارا دن کام کرتی ہے اس نے ترس کھا کر یہ کٹیا اس کو دے دی ہے۔" ایک اور عورت نے وضاحت کی۔

"توبہ توبہ مجھے تو اس کے چھن بھی صحیح نہیں لگتے۔" سب عورتوں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

سب عورتیں آہستہ آہستہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ ملکی عورت نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنی کٹیا سے باہر نکل آئی۔ وہ کافی دیر وہاں بیٹھی رہی جہاں کچھ دیر قبل عورتیں اس پر الزام تراشی کر رہی تھیں۔

وہ حق نواز کے گھر سارا دن کام کرتی اور تھکی ماندی اس کٹیا میں آ کر سو جاتی۔ آج پہلی مرتبہ وہ گھر سے باہر نکل کر اس میدان میں آ بیٹھی تھی جہاں کام کاج سے فراغت کے بعد اکثر عورتیں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ وہ ان سب عورتوں سے بہت ڈرتی تھی۔ ان کے طعنے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیتے تھے لہٰذا وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھی۔

ملکی عورت وہاں بیٹھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی وہ نو سال کی تھی کہ اس کی ماں مر گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے برکت کی ساری ذمہ داری سنبھال لی۔ برکت اس کا چھوٹا بھائی تھا وہ دن رات اس کی خدمت میں جتی رہتی۔

"ریشماں گڑیا سے کھیلے گی" اور اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

وہ برکت کو گود میں بٹھائے پروین کی گڑیا سے کھیلتی رہی۔ اسے احساس ہی نہ رہا اور سورج غروب ہونے کو آ گیا۔

"یہ تو یہاں کیا کر رہی ہے" ابا نے کرخت آواز میں کہا اور وہ بھائی کو اپنے وجود سے لپٹائے اندر آ گئی۔ وہ ساری رات خواب میں پروین کی گڑیا سے کھیلتی رہی۔

پھر ایک روز ابا نئی دلہن لے آیا۔ ریشماں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ہر وقت ماں کے حکم کی منتظر رہتی۔ اس پر بھی نئی ماں اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی۔ اسے نئی ماں بہت بُری لگتی تھی۔

"اسے یہاں سے لے جاؤ" ایک دن نئی ماں نے اس کے بھائی کو پاؤں سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے اندر باغی ریشماں نے سر اُبھارا اور وہ وہیں کھڑی رہی۔

"تجھے سنائی نہیں دیا۔" نئی ماں غصے سے بولی۔ وہ بے دلی سے وہاں سے چلی آئی۔

اسے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب نئی ماں نے ابا کے سامنے اسے برا بھلا کہا۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ وہ ابا کے دست شفقت کی منتظر رہی لیکن ابا نے اس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ نہ رکھا۔ وہ اپنی ذات میں گم کر رہ گئی۔ نہ وہ اب پروین کے ساتھ گڑیوں سے کھیلتی تھی اور نہ ہی کسی سے بات کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں وہ سانحہ بھی آ گیا جس نے زندگی کے تپتے صحرا میں اسے بالکل اکیلا کر دیا۔ چھوٹے بھائی کو ملیریا نے آ لیا اور وہ چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔

"بھائی مر گیا" اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

اب اسے نئی ماں کے ساتھ ساتھ ابا کے وجود سے نفرت ہو گئی۔ اس کے دماغ نے ایک رات سنگین فیصلہ کیا اور وہ اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی جہاں سے اب اسے خوف محسوس ہوا کرتا تھا لیکن باہر کی دنیا میں ابا سے زیادہ خوفناک چہرے والے مردوں نے اسے سہمی ہوئی لڑکی بنا دیا۔

اسے مردوں سے نفرت ہو گئی۔

"یہ کلموہی آج باہر آ کر بیٹھ گئی" زلیخا کی آواز پر وہ خیالوں سے لوٹ آئی۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کچے مکان میں آ گئی۔

"سارا محلہ اس سے تنگ ہے۔" صغریٰ نے کہا۔

باقی عورتوں نے بھی تائید کی جو آہستہ آہستہ اس کے اردگرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔

.....

بستی میں عجیب کہرام برپا تھا۔ سب عورتیں آگے بڑھیں۔

"زلیخا کی کٹیا میں آگ لگ گئی۔" صغریٰ چیخ رہی تھی۔

"میرا بچہ برکت" زلیخا نے سینہ کوبی شروع کر دی۔

"مجھے اندر جانے دو" زلیخا نے بازو چھڑا کر اندر کی طرف بھاگنا چاہا۔

"بی بی حماقت نہ کرو ابھی آگ بجھانے والا عملہ پہنچنے والا ہے۔" ایک مرد نے اسے آگے بڑھنے سے روک لیا۔

"کوئی میرے برکت کو بچائے۔" زلیخا نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

"ارے وہ دیکھ" ایک عورت نے اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا ملکی عورت جست لگا کر اس کٹیا میں چلی گئی جس کو شعلوں نے گھیر رکھا تھا۔ ملکی عورت کے سامنے تو اس کا بھائی تھا۔ وہ آوازیں دے رہی تھی۔

"برکت تُو کہاں ہے۔"

چند ساعتوں میں وہ اس بچے کو گود میں چھپائے باہر نکل آئی۔ کٹیا سے باہر آتے ہی وہ زمین پر گر گئی۔ سب اس کی طرف لپکے۔

زلیخا نے اس کی گود سے بچہ چھین لیا۔

"شکر ہے برکت صحیح سلامت ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"اسے تو دیکھو" کسی نے کہا۔

اچانک سب کی نظریں ملکی عورت کی طرف اُٹھ گئیں۔

"اُف خدایا" ایک عورت کی چیخ نکل گئی۔

ملکی عورت کا جسم بری طرح جھلس چکا تھا۔

سب عورتیں اس کے اردگرد اکٹھی ہو گئیں۔

"برکت بچ گیا" ملکی عورت نے بمشکل کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

.....

"ماں کیسی ہے تُو" برکت نے ماں کو بازوؤں میں لے لیا۔

"تُو ٹھیک ہے شہر میں تیری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔" زلیخا نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہے" برکت نے کہا۔

وہ ماں کے ہمراہ اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو اس کے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔

کچھ ہی فاصلے پر زلیخا رُک گئی۔

"ماں کیا ہوا" برکھ نے ماں سے پوچھا۔

"ادھر آ جا" وہ اسے بازو سے کھینچتی ہوئی ایک پرانی سی قبر کے پاس لے گئے۔

"ماں یہ کس کی قبر ہے؟" برکت نے حیرانگی سے پوچھا۔

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ زلیخا کے آنسو اس کی ہتھیلیوں کو بھگو رہے تھے۔ قریب ہی کھڑا ہوا برکت حیرت سے ماں اور پرانی قبر کو دیکھ رہا تھا۔

www.urdukorner.com

شوکت افضل

کھلتی ہے آرزو کی کلی

شوکت افضل صاحبہ حسبِ معمول ایک اور یادگار تحریر قارئین کے لیے لائی ہیں جو انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے اور معاشرتی بگاڑ میں بہتری کا جذبہ بھی جگاتی ہے۔ شوکت افضل کی زیرِ نظر تحریر ایک زندہ دل خوش گفتار لڑکی کی کہانی جس کی زندگی میں آنیوالے نشیب وفراز اُسے اک عجیب دوراہے پر لاکھڑا کرتے ہیں۔ زمانے کی چیرہ دستیاں اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹتی ہیں اور کبھی اپنوں کے بچھڑنے اور ذمہ داریوں کا طوق اس کی خوشیوں اور مزاج کی شگفتگی کا قاتل بن جاتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے قارئین اُن کی اس تحریر کو بھی پذیرائی بخشیں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

(ایڈیٹر)

جونہی پہلا پیریڈ ختم ہوا اور ٹیچر کلاس روم سے باہر نکلی، شمسہ اپنی سیٹ پر سے ہرنی کی طرح قلانچ بھر کر یاسمین کے ڈیسک کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''تم...... تم یاسمین ہو نا؟'' اور دیکھو! میں شمسہ ہوں۔ شمسہ تمہاری کلاس فیلو۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے نرمی سے دبا کر نہایت لجاجت اور اشتیاق بھرے لہجے میں بولی:

یار ذرا گا کر تو سناؤ۔ جس وقت سے آئی ہوں ان کم بخت لڑکیوں سے تمہارے گانے کی تعریف سن سن کر میں تو اُف بس تباہ ہی ہو کر رہ گئی ہوں۔

یاسمین نے حیرت زدہ ہو کر شمسہ کو دیکھا جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھی لیکن کس طرح موقع محل سے بے نیاز ہو کر غایت درجہ بے تکلفی برتتے ہوئے اس کے ڈیسک پر ہاتھ ٹیکے اپنی چمکتی ہوئی مسحور کر دینے والی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی...... جبکہ دوسرا پیریڈ لینے کے لیے کسی بھی لمحے دوسری میڈم کلاس روم میں قدم رکھنے والی تھی۔

یاسمین کو تک تک دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق اپنے چہرے کی طرف دیکھتے پا کر خود ہی شمسہ بے کل سی ہو کر اس کے ڈیسک پر ایک ہاتھ سے تال دیتے ہوئے گنگنانے لگی تھی۔ اس کی نظریں یاسمین کے چہرے کا طواف کیے جا رہی تھیں اور وہ اپنے گول مٹول سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے نہایت جذب و سرمستی کے عالم میں کوئی گیت مدہم مدہم لے میں الاپے جا رہی تھی۔

ادھر تمام کلا [illegible] کو آنکھوں آنکھوں

www.urdukorner.com

میں اشارے کر کے مسکرائے جا رہی تھی۔

یاسمین نے نہایت دلچسپی اور انہاک سے اس پیاری مگر آفت کی پرکالہ سی لڑکی شمسہ کو دیکھا۔ صاف رنگ، گول گول چہرہ، ٹھوڑی میں ننھا سا گڑھا، چھوٹی سی پیاری سی ناک، باریک گلابی ہونٹ اور دوسروں کو بے بس کر دینے والی مسکراتی ہوئی مقناطیسی نگاہیں، تقریباً سوا گز لمبی چٹیا، آدھی کھلی، آدھی گندھی، شان بے نیازی سے پیٹھ پر پڑی تھی۔

جونہی میڈم کمرے میں داخل ہوئی لڑکیوں کے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوتے شمسہ زقند بھر کر اس طرح اپنی سیٹ پر جا کھڑی ہوئی جیسے وہاں سے کبھی ہٹی ہی نہ تھی۔

یاسمین کے ابو کا تبادلہ حال ہی میں اس شہر میں ہوا تھا اور وہ دو تین دن بیشتر ہی شمسہ کے سکول میں آٹھویں گریڈ میں داخل ہوئی تھی۔ جب یاسمین پہلے دن سکول آئی تو شمسہ کسی کزن کی شادی کے سلسلے میں سکول سے چھٹی پر تھی۔ چونکہ یاسمین نئی نئی تھی اس لیے فی الحال وہ اپنی پرانی سہیلیوں کے لیے ہی اداس اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ اس نئی کلاس کی لڑکیوں کی اکثریت گانے بجانے کی شوقین تھی جن کی لیڈر شمسہ سمجھی جاتی تھی لیکن اس کی غیر حاضری میں جب دوسری لڑکیوں کو بہت زیادہ موسیقی کا جوش اُٹھتا تو وہ فرخندہ کو گھیر لیتیں جو کہ ڈیسک پر تال دیتے ہوئے اپنی کرخت بے سری آواز میں ڈکرا ڈکرا کر لتا کو بھی شرمندہ کر دیتی۔ اس دن یاسمین اس کے قریب ہی بیٹھی ان کی محفل موسیقی کی ہیئت کذائی پر مسکرائے جا رہی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنی چنڈال چوکڑی میں اسے بھی گھسیٹ لیا اور تان ملانے کو کہا۔ اس نے جھجکتے شرماتے ہوئے آواز نکالی۔ شور مچاتی ہوئی لڑکیاں یکدم چپ ہو گئیں تو وہ بھی تھوڑی سی آواز نکالنے کے بعد رُک گئی مگر تمام لڑکیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سریلا جھرنا بہتے بہتے تھم گیا ہو۔ پھر تو وہ شور مچا، ڈیسک پیٹے گئے، تالیوں اور چیخوں نے کمرہ سر پر اُٹھا لیا کہ......

''اُف، ہائے، گاؤ نا، رُک کیوں گئیں؟''

''ہائے پلیز میں تو اچھا نہیں گا سکتی۔'' وہ گھبرائی۔

''اچھا چلو جیسا گا سکتی ہو۔ سنا دو پلیز۔''

اور پھر یاسمین کو گا کے سنانا پڑا۔ اس کی آواز میں بلا کا سُر اور لوچ تھا۔ بس اب تو جس دم بھی لڑکیوں کو وقت ملتا، یاسمین کو حصار میں لے کر گانا سننے بیٹھ جاتیں اور پھر جب شمسہ چھٹیاں گزار کر آئی تو وہ یہ سنتے ہی کہ یاسمین خوب گاتی ہے اس کا پروانہ وار طواف کرنے لگی اور پھر یاسمین کی صورت بھی اس کے دل کو بے حد پیاری لگی۔ وہ ہزاروں میں تو سینکڑوں میں سے ایک تھی اور شمسہ تو خوبصورتی کی ہمیشہ سے دیوانی تھی اور یہیں سے دونوں کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ سالانہ بورڈ کے امتحان میں بھی دونوں سہیلیوں کے ایک جیسے نمبر آئے اور یہ چیز دونوں کی دوستی میں مزید مضبوطی کا باعث بنی۔ وہ اپنی دوستی کی اجارہ داری میں کسی اور فرد کا اضافہ پسند نہ کرتی تھیں تاہم اس کے باوجود لڑکیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ان کا مداح تھا۔ یاسمین کی طبیعت میں شوخی اور زندہ دلی کا عنصر نمایاں تھا مگر وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھی لیکن شمسہ شوخ و شنگ ہونے کے ساتھ ساتھ بذلہ سنج بھی تھی اور کسی بھی ناگوار بات کو کہنے والے کے منہ پر ہی مذاق بنا کر چٹکیوں میں اُڑا دیتی اور اگلا خود بخود شرمندہ ہو کر راہ فرار اختیار کرتا۔

ـ یوں اچانک تیری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کر جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ

آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے

اکثر شمسہ کلاس میں ٹیچر کی کسی بات کو نوٹ کر کے چہرے کا ایک مخصوص انداز بنا کر خاموشی سے آنکھیں ذرا کی ذرا اٹھا کر سر جھکائے ایسے تمسخر بھرے انداز میں سامنے سے یاسمین کی طرف دیکھتی کہ یاسمین کی ہنسی نکل جاتی اور شمسہ خود ایسا سنجیدہ منہ بنا لیتی جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو اور پھر جھڑکیاں صرف یاسمین کو پڑتیں۔ اس دن ان کی اینگلو انڈین پرنسپل صاحبہ خود ان کی کلاس لے رہی تھیں۔ انہوں نے پوئٹری پڑھاتے ہوئے ایک لڑکی کو کھڑا کر کے Ocean کے معنی پوچھے۔ وہ لڑکی نہ بتا سکی تو دوسری لڑکی سے پوچھا۔ وہ بھی نہ بتا سکی تو تیسری سے پوچھا۔ اتفاق سے وہ بھی نہ بتا سکی تو پھر یاسمین کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ''یو!''

''جی، سمندر۔'' یاسمین نے کھڑے ہو کر کہا۔

''یائیس.......... (Ye---e---ss)، سامندر۔''

اینگلو انڈین پرنسپل صاحبہ نے زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارتے ہوئے چلا کر باریک آواز میں کہا۔ واپس بیٹھتے ہوئے جب یاسمین کی نظر سامنے بیٹھی شمسہ پر پڑی تو اس نے حسب سابق مضحکہ خیز سرخ چہرہ بنائے اسے ایسی ہنستی ہوئی مستانی آنکھوں سے دیکھا کہ پھر یاسمین کی ہنسی نکل گئی۔ باوجود ضبط اور چھپانے کے پرنسپل صاحبہ نے یاسمین کو ہنستا دیکھ ہی لیا۔ اس وقت تو وہ خاموش رہیں کیونکہ وہ ان کے مضمون انگلش میں ہمیشہ فرسٹ آتی تھی مگر چھٹی کے وقت جب وہ کتابیں سنبھال رہی تھی، تو مائی نے آ کر بتایا کہ یاسمین کو آفس میں طلب کیا گیا ہے۔

مہینوں اور سالوں کا چکر چلتا رہا۔ وہ آزاد پرندوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ دیئے زندگی کے ہر غم سے بے نیاز تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے کالج کی فضا میں آ گئیں۔ اسی دوران دونوں سہیلیوں نے بھرپور شباب کی وادیوں میں قدم رکھا۔ ان کے چہروں پر تازہ کھلے پھولوں کا گمان ہوتا تھا اور آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک لہراتی تھی۔ ان کے جسم پکے ہوئے پھلوں جیسی خوشبو سے مہکتے تھے۔ اب تو ان کے اکا دکا شادی کے پیغامات بھی آنے لگے تھے۔

ایک دن شمسہ نے یاسمین کو بتایا کہ اس کے لیے اس کے ایک دور پار کے کزن کا جس کا سیالکوٹ میں بزنس ہے، پیغام آیا ہے۔

''تو پھر؟'' یاسمین نے دل سے اُٹھی ہوئی حسد و رقابت کی لہر کو دباتے ہوئے کہا۔ ''کیا جواب دیا تمہاری امی نے؟''

''ارے میں کیا جانوں۔ جواب شواب کے بارے میں؟'' شمسہ نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

''پتہ ہے۔ کل میرے ہاتھ سے دو پلیٹیں گر کر کیا ٹوٹ گئیں کہ بس غضب ہی ہو گیا۔ امی تو لگیں خالہ کے سامنے ہی مجھے کوسنے، جو کہ پیغام لائی تھیں۔ ان کو کہنے لگیں...... ''دیکھ لو آپا! خبر نہیں اس کمبخت کے ہاتھوں میں کیا بلا گھس گئی ہے۔ جس برتن کو ہاتھ لگاتی ہے توڑ ہی ڈالتی ہے۔ کتنے سیٹ خراب کر دیئے اس نے میرے۔ میں تو سوچتی ہوں اس کا ابا رخنہ نہ ڈالے تو اس کو شادی کر کے جلد دفعان کر دوں مگر وہ اُلٹی کھوپڑی کا ٹھہرا۔ جیسے کسی جن یا دیو کی کسی طوطے میں جان ہوتی ہے نا۔ تو اس شخص کی اس مردار شمسہ میں جان ہے۔ بتیرا اس کو سر پر چڑھا رکھا ہے اس نے...... بس یہی کہتا ہے کہ کوئی کچھ نہ کہے میری بیٹی کو۔''

یاسمین نے دیکھا کہ بات کرتے کرتے شمسہ کا چہرہ گلنار ہو گیا، اور مخمور آنکھیں انجانے میں جیسے کوئی خواب سا دیکھتے ہوئے بھیگی بھیگی لگنے لگیں۔ چنانچہ

www.urdukorner.com

وہ سب سمجھ گئی۔

''ہاں تو پھر یہ کوسنا بہت بھایا دل کو تیرے؟'' یاسمین جل کر کٹتے ہوئے لہجہ میں بولی تو شمسہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتے ہوئے سنبھل کر بولی۔

''ہیں......؟ اوہ نہیں! ارے بھئی یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ وہ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ...... کہ......'' وہ جھینپ کر کچھ کہتے ہوئے رُک گئی۔

''اب بات مت بناؤ ری بٹیا۔ ورنہ کھینچ ڈالوں گی تمہاری چٹیا۔'' یاسمین اس کی ناگن کی سی سوا گز چٹیا کو اپنے بازو پر کئی بل دیتے ہوئے بولی۔

''ابھی اس دن بھی تم کہہ رہی تھیں کہ میری امی کہتی ہیں مجھے تو نوعمر چھوٹی چھوٹی دلہنیں اچھی لگتی ہیں جن کو خاوند جدھر چاہے موڑ لے، لچکیلی سبز شاخ کی طرح۔ زیادہ عمر کی لڑکیاں تو سوکھی ٹہنی بن جاتی ہیں جس کو جھکاؤ تو جھکنے کی بجائے چٹخ کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ بی بی رانی تمہارے تیور بھی ٹھیک نظر نہیں آتے...... ٹھیک ہے کر لو شادی...... کون روکتا ہے تمہیں، اکیلا چھوڑ جاؤ گی تو ہم بھی مر نہ جائیں گے اک تمہارے بغیر۔'' یاسمین بے بسی سے ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

''ارے میری جان یاسمین، کیسے چھوڑ سکتی ہوں تمہیں۔ یہ وعدہ پکا ہی رہے گا کہ اکٹھی ہی باراتیں آئیں گی دونوں کی۔ ڈن! لاؤ ہاتھ ملاؤ۔'' شمسہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وہ کس خوشی میں؟'' یاسمین نے بدستور خفگی سے تنگ آ کر اپنے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''اسی خوشی میں!'' شمسہ نے زبردستی یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے اپنی مقناطیسی نگاہیں یاسمین کی آنکھوں میں گڑاتے ہوئے کہا تو اس نے لاجواب سی ہو کر اپنے موتی کی لڑیوں جیسے دانت چمکا دیئے۔

''اُف تباہ کر دیا کمبخت نے۔'' شمسہ نے اسے دیکھ کر اپنا تکیہ کلام دہرایا۔ اور پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے کلاس روم کی طرف چل دیں۔

لیکن یاسمین نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے بعد بھی جس وقت شمسہ فارغ ہوتی، یاسمین کو لے کر تنہا درختوں کے کنج میں پڑے بینچ پر جا بیٹھتی اور پھر...... ادھر ادھر سے بات کو گھما کر پھر اپنے پیغامات کے موضوع پر لے آتی۔ اس ذکر سے اس کے شاداب رخسار تمتما اُٹھتے، ہونٹ کپکپانے لگتے اور آنکھوں میں خمار آلود نمی سی آ جاتی۔ اب تو وہ ہر دم خوبصورت رسیلے گیت الاپتی۔ اسے ملکۂ ترنم نور جہاں کے نغمے بے حد پسند تھے۔ وہ گاتے وقت اپنی آواز کو بالکل اس کی آواز میں ڈھال لیتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنا اچھا گانے لگی کہ یاسمین کے گانے کو پیچھے چھوڑ گئی۔ جب وہ اپنے، بڑھائے ہوئے لمبے لمبے رنگین ناخنوں والی مخروطی انگلیوں سے ڈیسک پر دھیمی دھیمی تھاپ دیتے ہوئے کسی اور ہی جہاں میں کھوئی ہوئی گاتی تو بالکل کوئی منجھی ہوئی مشاق گلوکارہ معلوم ہوتی۔ وہ اپنے سوا گز لمبے بالوں کی اب دو چٹیاں باندھتی جو اس کے آگے آ گرتیں اور جب وہ اونچی ہیل والی جوتی پر ٹھمک ٹھمک کر چلتی تو یہ چوٹیاں اس کے دائیں بائیں مست ناگنوں کی طرح لہراتیں۔ اب تو اس کی چال میں بھی عجیب بانکپن اور مدماتی آنکھوں میں ان دیکھے خوابوں کا خمار سما کر رہ گیا تھا۔ اسے ہر چیز پہلے سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی۔ اب وہ کبھی ریڈیو کے ان دیکھے اناؤنسر کی خوبصورت آواز پر مرمٹتی اور کبھی کسی فلمی اداکار یا مشہور شاعر کی باتیں کیے جاتی اور ان میں سے کسی کا نام آتے ہی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سر کو جھٹکاتے ہوئے مخصوص نعرہ لگاتی۔

''اُف تباہ کر دیا کمبخت نے۔''

اب تو وہ اپنے لباس کا بھی خیال رکھتی۔ بڑی جان لیوا قسم کی خوشبو اس کے آس پاس اُڑتی رہتی۔ اس کے کالج کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ پہنچ گئی ہے۔ وہ سکول بس سے اُتر کر اندر پہنچتے ہی سیٹی نما چیخ مار کر کسی بنی سنوری خوبرو لڑکی پر آوازہ کستی، دور سے اس کے تازگی بخش قہقہے سنائی دیتے اور ہر طبقہ ہر خیال سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں، جن کو اس کا انتظار سا ہوتا، مڑ مڑ کر اس کو دیکھنے لگتیں اور جب وہ لچکتی مٹکتی، اٹھکھیلیاں کرتی، بہار کے اولین مشکبار جھونکے کی طرح ان کے قریب سے گزرتی تو وہ نہایت دلچسپی اور پیار سے اس زندہ دلی کے پیکر کو لطف اندوز ہونے والی نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھتیں۔ اس کی مرنجاں مرنج طبیعت نے سب کے دل موہ رکھے تھے۔ سب کے دل میں اس کے لیے انجانا سا انتظار رہتا۔

اور پھر اچانک ایک دن شمسہ کالج نہ آئی۔ اس کی بس کی لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ اس کے والد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال میں دم توڑ گئے ہیں اور اب ان کی میت ان کے گاؤں لے گئے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد شمسہ کالج آئی تو تمام لڑکیوں نے اسے گھیر لیا اور افسوس کرنے لگیں مگر وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ خالی پیریڈ میں وہ اسی طرح یاسمین کے ساتھ درختوں کے کنج میں گھرے بینچ پر جا بیٹھی۔ مگر لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود یاسمین اس کا غم دور نہ کر سکی۔

''میرا جی چاہتا ہے، میں بھی کچھ کھا کر سو رہوں یاسمین...... جیسے میرے ابو قبر میں جا کر سوئے ہیں۔ وہ تو میری کل کائنات تھے۔ ان کے بغیر تو بالکل تہی دست ہو کر رہ گئی ہوں۔ میں تو اپنے ابو کے سہارے ہی زندہ تھی یاسمین۔ اب میں کس سے فریاد کروں کہ میرے ابو لوٹ آئیں۔ ہائے ابو! میں آپ کو کہاں تلاش کروں۔ کہاں جاؤں کیا کروں؟'' یہ کہتے کہتے شمسہ کے دل سے اُٹھنے والے غم کے بگولوں نے اسکے ضبط کے بندھن توڑ دیئے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی...... ''ابو چلے گئے۔ یاسمین ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ میں یہاں آرام سے بیٹھی ہوں اور وہ منوں مٹی کے تلے بے بس اور اکیلے پڑے ہیں۔''

یکدم شمسہ ایسے تڑپنے لگی جیسے اسے آگ کے شعلوں نے اپنے نرغے میں لے لیا ہو۔ یاسمین نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور پھر یاسمین کے بھی آنسو بہنے لگے...... وہ آہستگی سے شمسہ کا سر سہلاتی اور روتی رہی۔

دن گزرتے رہے لیکن اب شمسہ وہ پہلی سی شمسہ نہ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پہلی شمسہ کو وہیں کہیں اپنے ابو کے پاس پیچھے ہی چھوڑ آئی ہے۔ وہ تو شاید کوئی اور ہی چلبلی روح تھی جس نے پہلے شمسہ کے پیکر میں پناہ لے رکھی تھی۔ اب تو کسی کو شمسہ کے نہ وہ خوش باش و چست فقرے اور گفتگو سنائی دیتی اور نہ ہی اس کے کھنکتے ہوئے قہقہے کالج کی چار دیواری میں گونجتے۔ اب تو اس کے مدھ بھرے گیتوں کے لیے لڑکیوں کے کان ترس ہی گئے تھے۔

باپ کی بے وقت موت نے شمسہ کو عمر سے پہلے ہی بے حد سنجیدہ بنا دیا تھا کیونکہ اب اسے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ گھر میں تمام بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ تین بہنیں تھیں اور دو کمسن بھائی تھے۔ سب میں بڑی ہونے کی وجہ سے وہ ماں کے زیادہ قریب آ گئی۔ وہی شمسہ کی امی جو اس کی جلد شادی کر دینے کے خواب دیکھ رہی تھی اب سہارے کے لیے شمسہ کی مرہون منت تھی۔ شمسہ کا باپ ایک قناعت پسند اور صابر شاکر قسم کا آدمی تھا جس نے کبھی اپنے موجودہ حالات کے خول سے نکل کر اوپر جانے کی خواہش یا کوشش نہ کی تھی۔ وہ زیادہ

www.urdukorner.com

ہاتھ پاؤں مار کر دولت سمیٹنے کا قائل ہی نہ تھا۔ جو عزت سے مل جاتا اسی کو غنیمت جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کے دوسرے لوگوں نے وقت کا ساتھ دے کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے مگر شمسہ کے باپ نے کسی جھوٹے کلیم (Claim) کے سہارے نہ تو جائیداد بنائی نہ ہی اپنے چھ بچوں کے لیے لمبا چوڑا بینک بیلنس چھوڑا۔

شمسہ کا خاندان کافی اونچا اور جدی پشتی شرفا میں سے تھا۔ وقتی طور پر کبھی رشتہ داروں نے ہمدردیاں دکھائیں مگر ان ماں بیٹیوں کو پتہ تھا کہ زندگی بھر کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ شمسہ نے خودداری اور نجابت کا ورثہ اپنے آباء واجداد سے پایا تھا اور قدرت نے اسے ذہانت کے زیور سے آراستہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عزم کرلیا اور پھر اس نے خود کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال کر خود کو پڑھائی میں گم کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں تعلیم اور صرف تعلیم ہی ایک ایسا سہارا تھا جو آگے چل کر چلد ہی اس کے گھریلو مسائل کا ایک آسودہ حل ہو سکتا تھا اور وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی سرپرستی کر سکتی تھی۔

زندگی نے شمسہ ایسی جذباتی اور زندہ دل لڑکی سے کیا مذاق کیا تھا۔ دنیا کی رعنائیاں حسب سابق اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں مگر اس کے لیے اب زندگی محض جدوجہد اور عمل کا نام بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی دوست یاسمین جو کہ پہلے پہل شمسہ کے منہ سے اس کی شادی کے پیغامات کا نام سن کر ہی جل کر کوئلہ ہو جایا کرتی تھی اب اپنے آنے والے پیغامات کی بات شمسہ سے چھپا جاتی۔ ان دونوں نے تو ساتھ ساتھ شادی کرنے کا عہد کر رکھا تھا اور جبکہ یہ عہد اب پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا تو یاسمین خود کو شمسہ کے سامنے مجرم محسوس کرتی تھی۔ شمسہ کی سب خوشیاں تو اپنے ابو کے دم قدم سے تھیں۔ وہ اس کے سر پر سایہ دار شجر کی طرح قائم تھے اور اب جب سے یہ سایہ اُٹھ گیا تھا، شمسہ کی زندگی تو محض ایک تپتے ہوئے ریگستان کی مانند تھی۔ چنانچہ شمسہ کو بھی اور کالج کی باقی لڑکیوں کو بھی پتہ تب ہی چلا تھا جب یاسمین کے شادی کے دعوتی کارڈز کالج میں تقسیم ہونے لگے تھے۔

شمسہ نے نہایت صبر اور سکون سے یاسمین کے شگن منائے، اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی، دلہن بنایا اور خشک آنکھوں سے رخصت کیا۔ یاسمین روتی سسکتی مستقبل کے موہوم خواب آنکھوں میں سمائے پیا کے دیس سدھار گئی اور پھر ان سہیلیوں کے درمیان کچھ عرصہ ملاقات کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہی رہ گیا۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک ساتھ کھیلی ہوئی سہیلیاں بیاہ ہو جانے کے بعد اور کشتی کے مسافر کنارے لگنے کے بعد قسمت سے ہی ملتے ہیں۔

خطوط کے ذریعے ہی یاسمین کو معلوم ہوتا کہ اب شمسہ اپنے ذہن کے وہ دریچے بند کر چکی ہے جہاں سے ماضی کی مسکراتی رنگ بکھیرتی بہاروں کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے ماضی کے بیش بہا لمحات کی یاد کو کسی بے حد انمول چیز کی طرح دل کے دور دراز کونوں میں مقید کر کے رکھ دیا ہے تاکہ وہ پھر یہ حصار توڑ کر اسے اپنے مقصد سے دور نہ کریں۔ اب وہ اپنی تحریروں میں ایک جذباتی دوشیزہ نظر نہ آتی تھی بلکہ ایسے معلوم ہوتا جیسے اسکے اندر مامتا کا نور روشن ہے۔ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو ماں سے کم نہ چاہتی تھی اور ان کے مستقبل کے لیے اتنی فکرمند رہتی تھی کہ ان کی نگہداشت میں اپنے آپ کو یکسر بھلائے بیٹھی تھی۔

بی اے کرنے کے بعد بینک لے کر شمسہ نے

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

درس و تدریس کا پیشہ اپنا لیا کیونکہ جلد سے جلد اس کے اختیار میں یہی بات تھی جس سے وہ معاشی طور پر بالکل تہی دست ہونے سے پہلے پہلے خود کفیل ہو سکتی تھی۔ اب تک تو انشورنس پالیسی اور پراویڈنٹ فنڈ نے کافی ساتھ نبھایا تھا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی مزید تعلیم بھی پرائیویٹ طور پر جاری رکھی اور پھر چند سالہ تجربے کے بعد اسے ایک سرکاری جونیئر سکول کی پرنسپل بنا دیا گیا اور یہ اس کی عملی مہارت اور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت اور انعام تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے اتنے مدارج طے کر لیے۔ اس دوران اس کی ایک چھوٹی بہن کی شادی ہوگئی اور دوسری بہن بھی کوالیفائیڈ ہو کر لوکل باڈیز کے آفس میں ڈویلپمنٹ آفیسر کی پوسٹ پر لگ گئی۔ چھوٹے دو بھائی اب مختلف درجوں میں پڑھ رہے تھے۔

انسان معاشی مسائل سے دوچار ہو تو دنیا میں جیسے اکیلا رہ جاتا ہے۔ ہر چیز پھیکی اور بے روح نظر آتی ہے لیکن اب جا کر جو شمسہ نے آسودگی کا سانس لیا اور جس خول میں وہ کئی سالوں سے دبکی ہوئی تھی اس خول سے قدرے سر نکال کر باہر جھانکا تو دنیا اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آئی۔ وہ تو بدصورتی میں سے بھی حسن تلاش کر لیتی اور بقول اس کے یہ دنیا تو ہمیشہ سے پیارے پیارے لوگوں اور پیاری پیاری حسین چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ اصلی فطرت کو انسان جتنا بھی دبا کر اس پر مصنوعی خول چڑھا دے وہ سامنے آنے سے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ذرا سی مہلت پاتے ہی شمسہ کا پرانا ذوق لطیف پھر ایک بار انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ اب جب بھی یاسمین میکے آتی، اس کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ اکادکا فنکشنز پر چلی جاتی۔

اور آج وہ ایک مشاعرے میں بیٹھی ملک کے مشہور نوجوان خوبرو شاعر طارق کا کلام سن رہی تھی۔ طارق اپنی خوبصورت آواز میں ترنم سے شعر سناتے ہوئے فضا میں ایک سحر بھری رومانیت بکھیر رہا تھا۔ یاسمین بار بار تحسین سے شمسہ کو دیکھے جا رہی تھی جس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی ساری کی ساری روح کھنچ کر اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں میں سما گئی ہو۔ شمسہ کا چہرہ وفورِ جذبات سے تمتما رہا تھا اور آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے وہ طارق کو جیسے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی کوئی صاحب بیٹھے اپنی بھاری بدمست آواز میں بار بار داد دیتے ہوئے اس طرح داغ داغ (واہ، واہ) کہتے، جس طرح کوئی کتا نیند میں بھونک رہا ہو۔ یاسمین بار بار ہلکی ضبط کرتے ہوئے شمسہ کی توجہ اس کی طرف دلاتی مگر وہ تو جیسے گرد و پیش سے بے نیاز ایک ہی چہرے اور ایک ہی آواز میں گم تھی۔

غزل ختم ہوئی اور تالیوں کی زبردست گونج جونہی اسے ہوش و حواس کی منزل پر لائی اسکے لبوں سے یہ فقرہ بچھلجڑی کی طرح پھوٹا۔

''اُف تباہ کر دیا کمبخت نے۔''

اور یاسمین کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

مشاعرہ ختم ہوتے ہی لڑکے لڑکیوں نے طارق کو آٹوگراف کے لیے اپنے نرغے میں لے لیا۔ شمسہ بھی ادھر ہی کو لپکی مگر اتنے رش میں طارق تک پہنچنا محال تھا۔ آخر یاسمین نے شمسہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اب واپس چلو شمسہ..... پھر سہی۔ یہاں تو ہماری دال گلتی نظر نہیں آتی اور منا رو رہا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

شمسہ نے اس طرح چونک کر یاسمین کو دیکھا جیسے اسکی آنکھیں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل تو دی لیکن اس کی

چال سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ اس رات شمسہ کو دیر تک نیند نہ آئی۔ اسے اس شاعر طارق کا کلام بے حد پسند تھا اور اسکے پاس اس کے چند مجموعہ کلام بھی تھے لیکن آج اسے پہلی دفعہ بنفس نفیس دیکھنے کے بعد وہ بری طرح اس کے دل و دماغ پر چھا کر رہ گیا تھا۔ اس کے مجموعہ کلام کو سینے پر رکھے وہ نجانے کتنی دیر پورے چاند کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کے بارے میں یہ سوچتی رہی۔

''کیا وہ بھی اس وقت چاند کو دیکھ رہا ہوگا۔''

طرح طرح کے رنگین خیالات اسے خوابوں کے ان دیکھے جزیروں میں لیے لیے پھرتے رہے اور پھر شمسہ کے شوق کی دنیا ایسی بدلی کہ وہ ہر دم طارق کے بارے میں سوچتی رہتی۔ آخر اس کے دل نے صلاح دی کہ طارق کو خط لکھے۔ راتوں کو وہ کتنی کتنی دیر تک ٹیبل لیمپ جلا کر کھوئے کھوئے تلے ہاتھ ٹکائے سوچ سوچ کر کچھ طارق کے نام لکھتی مگر پھر پاڑ ڈالتی۔ آخر کار تھک کر بستر پر جا گرتی اور سو جاتی۔ گڑیا کی طرح پلکوں کو رخسار پر گراتے اٹھاتے ہوئے نہایت دل سوز لے میں اس کے شعر گنگناتی رہتی۔

اور پھر ایک دن وہ دل و جان میں اُتر جانے والی ایک نازک سی تحریر لکھ کر پوسٹ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

طارق کا تعلق ایک نہایت خوشحال کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس کے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں تھیں اور ایک اعلیٰ گزٹڈ پوسٹ پر فائز بھی تھا لیکن طبیعت میں مزاح، زندہ دلی اور رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور پھر اسے شاعر بنانے میں ذہانت اور غیر معمولی حافظے کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ دنیا کی ہر خوبصورت چیز اسے متاثر کرتی۔ حسین نظارے، حسین چہرے اس کے تخیل میں ایک ناقابل بیان سی کیفیت پیدا کر دیتے اور یہی کیفیت اس کے شاہکار شعروں میں ڈھلنے کا باعث بنتی۔ والدین، بہنوں اور دوستوں کے والہانہ پیار نے اسے احساس تفاخر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کی معمولی سی مزاحیہ بات کو بھی اس قدر سراہا جاتا، اتنی اہمیت دی جاتی کہ وہ خود پسند ہو کر رہ گیا۔

وہ ہر محفل اور مجلس کی جان تھا اور صورت شکل بھی خدا نے خوب بنائی تھی..... لڑکیاں تو ویسے بھی اس کی مردانہ جاذب شخصیت سے متاثر رہتی تھیں مگر اس کے معیار پر کوئی پوری نہ اُترتی۔ جب بھی کوئی اس کی نئی غزل چھپتی یا وہ مشاعرے میں منظر عام پر آتا اس کی مداح لڑکیوں کے خطوط کے ڈھیر لگ جاتے۔ اب وہ شادی کی عمر پر آ چکا تھا۔ مگر ماں، بہنوں کے اصرار کے باوجود اپنے ذہن کو شادی کے نقطہ پر مرتکز نہ کر پاتا۔

شمسہ کا خط کھولتے ہی طارق نے جیسے آگہی کا ساتواں آسمان چھو لیا۔ وہ نازک سی تحریر ایک تیز نیم کش کی طرح اس کے جگر میں ترازو ہو کر رہ گئی۔ اس نے بے تابی سے خط کو الٹ پلٹ کر لکھنے والی کا اتہ پتہ ڈھونڈا مگر مایوسی ہوئی۔ داد بیداد بن گئی۔ ہزار چاہا کہ خط کا جواب دے، کوئی ملاقات ہو، کوئی بات ہو مگر بات نہ بن سکی۔ چنانچہ ہر غزل دل بے زبان بن گئی۔ داد و تحسین کے ڈنگرے برستے رہے مگر وہ تحریر جس کو نگاہ ترستی تھی پھر نظر نہ آئی۔ طارق کی تمام زندہ دلی ہوا ہو کر رہ گئی اور ایک ہی دھن ذہن میں سما گئی۔ اس ایک خط نے اس کی پرسکون زندگی کے سارے نظم و ضبط کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی اب تک اپنے مرغوب ترین مشاغل اور معمولات کے بنے تلے انداز میں بڑے سکون و طمانیت سے گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں وہ سب کچھ تھا جس کا انسان اپنے حال یا مستقبل کے

www.urdukorner.com

لیے تصور کر سکتا تھا مگر شمسہ کی تحریر ایک طوفان بلاخیز ثابت ہوئی جس نے اس کا سب کچھ تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ وہ دن بدن اس کے خیال میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہوتا گیا۔ زندگی ادھوری نظر آنے لگی۔

یہی طارق تھا کہ جیسے ہی وہ خاندان کے کسی فنکشن میں جا نکلتا، کزنز کی بیویاں اسے دیکھتے ہی پہلو بدلنے اور کسمسانے لگتیں اور اس میں دلچسپی لینے والی نظروں سے دیکھتیں۔ طارق ان کے وہ لتے لیتا کہ وہ کانوں تک سرخ ہو جاتیں۔ اسے چھیڑ، اسے طنز کے تیر مار، لڑکیوں بالیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکنے لگتے اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگ جاتیں۔ کوئی بھابھی چھیڑتی۔

''ارے طارق بھائی! کر لو نا تم بھی شادی، کیوں نہیں کر لیتے شادی؟''

''ارے بھئی کرتا کیوں نہیں شادی۔ کوئی کروائے تو کروں نا شادی۔'' وہ مصنوعی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہتا۔

''تو پھر ہم ہی ڈھونڈیں تمہارے لیے کوئی؟'' وہ کہتیں۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، مگر اتنا خیال رہے۔ ادھیڑ عمر کی پکی عورت ہو۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور ایماندار ہو، چور چکار نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ میں دفتر سے واپس آؤں تو آگے سے گھر کا صفایا۔'' طارق دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتا۔

''اور ہاں یہ دھیان بھی ضرور رکھنا۔ آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ تاکہ کچھ دن تو تسلی رہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہتا۔

''ارے ارے یہ تم اپنی بیوی کا نقشہ کھینچ رہے ہو یا ملازمہ کا؟'' کزن باجی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی۔

''یہ تو اس دن تمہاری امی مجھے ملازمہ کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ ایسی کوئی عورت نظر میں ہو تو میری طرف بھیج دینا کیونکہ میری نوکرانی چلی گئی ہے۔''

ساری محفل ہنسنے لگ جاتی اور وہ منہ پکا کیے مردوں کے پاس جا بیٹھتا لیکن اب وہی طارق تھا کہ محفلوں میں بھی کھویا کھویا رہتا۔ یہی نہیں اب تو اس کا اثر اس کی افسرانہ کارکردگی پر بھی پڑنے لگا۔ توجہ اور یکسوئی جس سے وہ دفتری امور سرانجام دیتا تھا، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی۔ وہ فون پر بھی بات کرتے کرتے یا سنتے سنتے کسی اور تصور میں اس طرح گم ہو جاتا کہ بعض دفعہ اپنی اس خود فراموشی پر خود ہی حیران رہ جاتا۔ وہ اکثر راتوں کو چونک چونک کر اٹھتا اور آہ بھر کر قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔

؎ کیا خبر تھی ایسے موسم بھی آئیں گے
نیند کی پریاں اڑ جائیں گی
خواب سہانے بکھر جائیں گے

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ آج پھر وہ رنگین قمقموں سے آراستہ سٹیج پر مائیک کے سامنے اپنے دل سوختہ کی آواز فضا میں بکھیر رہا تھا۔ آج وہ شمسہ کے شہر میں دوبارہ آیا تھا۔ شمسہ کے خط والے لفافہ پر لگے ٹکٹ کو غور غور سے دیکھنے کے بعد جو نام اس کی سمجھ میں آیا تھا وہ یہ کہ وہ اسی شہر سے آیا تھا اور اس کے دل کو ایک بے نام سی آس تھی کہ اس کے دل کی آواز آج ضرور اس تک پہنچے گی۔ وہ بے تابی سے بھرے پنڈال کی طرف بار بار نگاہیں دوڑاتا تھا۔ اس کی خوبصورت و افسردہ آنکھیں بار بار شمسہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون شمسہ شمسہ پکار رہا تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے شمسہ، شمسہ کی صدا آ رہی تھی۔ وہی اس کا درد تھی، وہی اس کا درماں تھی۔ طارق کی روح پکار رہی تھی۔

''تم میری رگِ جاں سے بھی قریب ہو کر مجھ سے کس قدر دور ہو شمسہ! کیا میں تمہارے شہر سے

ناکام و نامراد ہی چلا جاؤں گا؟ کیا یہ جدائی کے کانٹے جو میری روح میں کھب چکے ہیں کبھی پھول نہ بن سکیں گے؟'' اس کی آواز میں آنسو اور سسکیاں مستور تھیں۔ شمسہ بھی وہیں موجود تھی لیکن وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ سب کچھ طارق اسے ہی مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ وہ تو ویسے بھی اس کی شیدائی تھی۔ اس کا رواں رواں آنکھیں بن گئی تھیں جن کے راستے وہ اپنے شاعر، اپنے محبوب طارق کو اپنے آپ میں سمو لینا چاہتی تھی۔

آج وہ اکیلی آئی تھی اور یہ عزم کر کے ہی آئی تھی کہ طارق سے ملے بغیر نہ جائے گی۔ جب اس کے مداحوں کی بھیڑ چھٹ گئی تو وہ چائے کی میز پر اسے اکیلا پا کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آٹو گراف بک اسکے سامنے بڑھا کر بولی۔

''میرا نام شمسہ ہے جی! اور میں آپ کی پرانی مداح ہوں۔''

جونہی طارق نے نظر اٹھا کر شمسہ کی طرف دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا ہو۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اس کی اُٹھی ہوئی نگاہیں دوبارہ پھر نہ اٹھ سکیں۔

''اف! یہ تو اپنی تحریر سے بھی زیادہ خوبصورت نکلی۔'' طارق زیر لب بڑبڑایا۔

اپنی طرف دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے دیکھ کر شمسہ گھبرا کر پلکیں جھپکانے لگی۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ شمسہ! کہیں اور۔ بتاؤ کہاں ملو گی؟'' وہ سرگوشی میں انتہائی بے قراری سے بولا۔

''جلدی بولو...... پلیز!''

شمسہ نے نروس سی ہو کر اپنا پرس کھولا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے گھر کا ایڈریس والا ایک پرانا لفافہ نکال کر اسے تھمایا اور بولا۔

''آپ اس ایڈریس پر میرے گھر چلے آیئے گا۔ کل کسی وقت...... میں انتظار کروں گی۔''

دوسرے دن چھٹی تھی۔ شمسہ ذرا دیر سے اُٹھی تھی۔ باتھ روم سے نہا کر نکلی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس کا دل دھڑک اُٹھا اور وہ تیر کی طرح لپکی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی طارق کھڑا تھا...... اس کے بے چین خوابوں کی تعبیر!

وہ اسے اندر لے آئی۔ غسل کے بعد گلابی رنگ کے جوڑے میں وہ خود بھی مجسم ایک تر و تازہ گلاب نظر آ رہی تھی۔ پیٹھ پر گیلے سیاہ بالوں کے ریشمی لچھوں کا ایک الجھا ہوا ڈھیر پڑا تھا جس میں سے پانی کے قطرے شبنم کی طرح ٹپک رہے تھے۔ طارق نے ان بالوں کی حیران کن لمبائی کو دلچسپی سے دیکھا۔ اب تک طارق نے سینکڑوں چہرے دیکھے تھے جو حسن کا شاہکار ہوں گے لیکن اس لڑکی کا انداز ہی نرالا تھا جس کی تحریر نے ہی مقناطیس کی طرح طارق کو اس کے خول سے باہر کھینچ نکالا تھا۔ اس کی سادگی میں، اس کے ہر انداز، ہر نقش میں...... اس کی شوخی، اس کی متانت میں، اس کی مسکراہٹ، اس کی گفتگو میں اسے وہی لڑکی نظر آ رہی تھی جس کی تلاش میں آج تک اس نے کئی قریب آئی ہوئی لڑکیوں کو ٹھکرایا تھا۔ اسے دیکھ کر طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے قدرت نے اسکے صبر کا میٹھا پھل عطا کیا ہے اور اس کی عمر بھر کی تلاش آج مکمل ہو گئی ہے۔

''اوہ! تم اتنا عرصہ مجھ سے کیوں چھپی رہیں؟'' طارق نے بے تابی سے کہا۔

''شش......!'' شمسہ چھلکاتی آنکھوں سے شرگین مسکراہٹ والے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی۔

سامنے بیٹھی شمسہ کو طارق نہایت وارفتگی سے کتنی ہی دیر دیکھتا رہا اور وہ سرخ ہو کر پسینے پسینے ہوتی

www.urdukorner.com

رہی۔ اتنے میں شمسہ کی چھوٹی بہن سیما کولڈ ڈرنک کے دو گلاس ٹرے میں رکھے اندر آئی اور قریبی میز پر رکھ کر چلی گئی۔

''لیجیے نا!'' شمسہ ان نگاہوں کی تپش سے گھبراتے ہوئے بولی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔ کیا میں کوئی عجائب گھر کی چیز ہوں؟''

''دراصل مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سچ مچ تم ہی میرے سامنے ہو۔ میں تو راتوں کی سلگتی تنہائیوں میں جاگ جاگ کر کہا کرتا تھا۔

؎ کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، انہیں پیا ملن کی آس

شمسہ کے سینے میں ایک نئے احساس کی دکھ بھری ٹیس سی اٹھی اور اس کے تن بدن کو جھنجوڑ گئی، دل نے جیسے ٹھوکر کھائی ہو۔ اس کی آنکھوں میں شدت جذبات سے آنسو آ گئے جنہیں شعور نے پلکوں کی دہلیز پر ہی روک لیا مگر اس نے اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ طارق تشکیوں سے شمسہ کے ردعمل کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے شمسہ کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ وہ مضطرب سا ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک وسوسے نے سر اٹھایا اور پھر کسی ان دیکھی قوت نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''کیا یہ کسی اور سے وابستہ تو نہیں ہو چکی؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہیں انجانے میں میں نے تمہاری ذات سے کچھ غلط توقعات تو نہیں وابستہ کر لیں؟'' طارق نے جھجکتے ہوئے شمسہ کو مخاطب کیا۔

''کیا مطلب؟'' شمسہ خشک گلے سے آنسوؤں کا گھونٹ نگل کر بولی۔

''بعض باتیں خود بخود ہی سمجھ جانے کی ہوتی ہیں۔ وہ کہی نہیں جاتیں۔ اس طرح انکا حسن کھو جاتا ہے۔'' طارق سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

''اوہ میں سمجھ گئی۔'' شمسہ کچھ مسکرا کر بولی۔

''لیکن میں کیا سمجھوں، جناب عالی؟'' طارق نے ذرا جھک کر کہا۔

''بس سمجھ لیجیے، جو دل میں آئے۔'' شمسہ قدرے شوخی سے بولی۔

''دل کی کیا بات کرتی ہو تم، یہ تو دیوانہ ہے۔'' طارق نے قدرے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تم بتاؤ نا.....؟''

طارق کی اس بات پر شمسہ ایک نقرئی گھنٹیوں کی سی ہنسی ہنس پڑی اور پھر شرما کر سرخ ہوتے ہوئے بولی۔

''اُف! میں نے کہہ جو دیا۔ جو جی میں آئے سمجھ لیجیے۔'' شمسہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کہا۔

''پھر پتہ ہے، میرے جی میں کیا آتا ہے؟'' طارق اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا آتا ہے؟'' شمسہ کچھ شرما کر کچھ خوفزدہ سی ہو کر بولی۔

''میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں تمام زندگی تمہارے شانوں پر بکھری ہوئی ان سیاہ گھٹاؤں کی رم جھم میں بھیگے ہوئے گزار دوں۔'' طارق نے قریب آ کر شمسہ کی طرف جھکتے ہوئے انگلی سے اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''آپ بڑے خراب ہیں۔'' شمسہ ناز سے اُٹھلا کر بولی۔

''میں بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں شمسہ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بیتے لمحوں میں سے وہی لمحے اپنے ہیں جو اپنے پیاروں کے لمس سے آشنا ہوں۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولا۔

''زندگی بڑی ظالم شے ہے شمسہ۔ اسے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اگر انسان

www.urdukorner.com
www.urdukorner.com

کو اس کا آئیڈیل بھی مل جائے تو اسے دیر نہ کرنی چاہیے...... ٹھیک؟"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں آج ہی واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ ویسے میں دوبارہ جلد ہی آؤں گا۔"

شمسہ کے سینے سے کرب کی ایک لہر اُٹھ کر اس کے وجود کے ساحل سے ٹکرا کر بکھر گئی۔ اس کا چہرہ بے حد اداس اور کملایا سا نظر آنے لگا۔ طارق کا جی بھی کب جانے کو چاہ رہا تھا لیکن پہلی ملاقات تھی اور ایک اجنبی گھر میں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی درست نہ تھا۔ دروازے کے قریب رُک کر اس نے ایک بار پھر غور سے شمسہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے یاد رکھنا شمسہ! اور بھول نہ جانا کہ راہ وفا میں ارمانوں کے وہ پھول کھلتے ہیں جو کبھی نہیں مرجھاتے اور جن کی خوشبو دائمی ہوتی ہے۔"

"مگر آپ نے تو میری آٹوگراف بک پر بھی کچھ نہیں لکھا۔" شمسہ بھرائے ہوئے لہجے میں ہونٹ قدرے بسور کر بولی۔

"پگلی اب اس کی بھی کوئی ضرورت ہے۔ میں نے کہہ دیا نا۔ میں پھر...... پھر آؤں گا۔ اچھا چلو جاؤ، لے آؤ اس کو۔ میں لکھے دیتا ہوں۔" طارق جیب سے پین نکالتے ہوئے بولا۔

شمسہ بھاگ کر آٹوگراف بک لے آئی۔ طارق نے جلدی سے لکھ کر آٹوگراف بک اس کے ہاتھ میں تھما دی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ شمسہ نے اس کے چلے جانے کے بعد آٹوگراف بک کھول کر دیکھی۔ طارق نے لکھا تھا:

؎ اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

تمام شب شمسہ نیند کی مہربان آغوش میں مسکراتی رہی۔ ایک بار پھر زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اس کے دل کے آنگن میں رقص کرنے لگی۔ ہنسنا، کھیلنا، قہقہے لگانا، گانا بجانا، اسی پرانی زندگی کی تمنا پوری شدت سے اس کے دل کے بند دروازوں پر دستک دینے لگی۔ اسکی امی چند دنوں سے اپنی چھوٹی بیٹی کی ڈلیوری کے سلسلے میں اس کے پاس گئی ہوئی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو شمسہ کے ذہنی انقلاب پر حیران رہ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی سرور آگیں احساس شمسہ کو اپنے دوش پر کسی سیل رواں کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اسے کائنات میں رنگ ہی رنگ نظر آتے اور وہ سارا دن طارق کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔ جب بھی فارغ ہوتی، طارق کا تازہ مجموعہ کلام، "خوشبو کا سفر" پڑھتی رہتی۔ سوتے ہوئے بھی یہ کتاب اس کے سینے پر پڑی ہوتی۔ اس میں طارق کی تخلیق کی ہوئی وہ غزلیں تھیں جو تخیل کی رفعت اور جولانی میں اپنا جواب آپ تھیں اور اب تو اس کی ہر نظم، ہر غزل میں شمسہ کو اپنا ہی سراپا نظر آتا۔

؎ میرے نین کنوارے، تیری اکھیاں دیکھ کے ہارے
او جنم جنم کے ساتھی میری مانگ میں بھر دے تارے

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوارتے ہوئے شمسہ دھیمے سروں میں گنگنائے جا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ طارق بول رہا تھا۔

"شمسہ...... ہاں بھئی میں طارق بول رہا ہوں۔"

"کہاں سے بول رہے ہیں؟" شمسہ نے وفور جذبات سے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"دیکھو میں تھوڑی دیر تک تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ تم تیار رہنا آج باہر کہیں چل کر چائے پئیں گے۔ اوکے؟ طارق نے کہا۔

"اچھ...... چھا۔" شمسہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اور ہاں دیکھو...... اس دن والا گلابی جوڑا

پہننا آں۔ سمجھیں؟" طارق نے ریسیور رکھ دیا اور کانوں تک سرخ ہوتی شمسہ کے انگ انگ سے خوشی و سرمستی ٹپکنے لگی۔ وہ رقص کے سے انداز میں پاؤں اٹھاتی وارڈ روب تک آئی اور گلابی جوڑے والا ہینگر نکال کر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے گنگنانے لگی۔ اس کی چھوٹی بہن سیما جو پاس ہی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی پہلے تو خاموشی سے شمسہ کو دیکھتی رہی اور پھر اسے اپنی دنیا میں واپس لانے کے لیے گلا کھنکار کر کتاب بند کر کے زور سے میز پر پٹخ دی۔ شمسہ نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو سیما کو اپنی جانب دیکھتے اور مسکراتے پایا۔

"باجی! امی کہہ رہی تھیں اب سب کام چھوڑ کر شمسہ کا جہیز بنانا شروع کر دینا چاہیے۔" سیما نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟" شمسہ نے چہرہ پھیرتے ہوئے اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔

"باجی ایک بات تو بتاؤ...... پر...... سچی...... سچی...... وہ وہ میرا مطلب ہے وہ شاعر...... طارق صاحب کیسے لگتے ہیں آپ کو؟" سیما نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ مجھے کیا پتہ کیسے لگتے ہیں؟ کیا تم نے نہیں دیکھے؟" شمسہ مصنوعی خفگی سے تنک کر بولی۔

"ہاں میں نے بھی دیکھا ہے انہیں۔ کولڈ ڈرنک میں ہی لے کر آئی تھی اور پھر میں نے بالکونی سے انہیں کار میں بیٹھتے ہوئے بھی دیکھا۔" سیما ہنس کر بولی۔

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتی ہو۔ خود ہی بتاؤ نا کیسے لگتے ہیں؟" شمسہ نے ذرا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے......؟ مجھے تو ان پر بڑا پیار آنے لگا ہے اب تو...... سچی۔ بالکل ہی اپنے جیجا جی...... لگتے ہیں مجھے تو وہ......!" سیما نے آنکھیں مٹکا کر چھیڑتے ہوئے کہا۔ شمسہ اسے مارنے کو لپکی تو وہ ہنستی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

سہ پہر چار بجے کے قریب طارق وہاں پہنچا تو شمسہ باہر کمپاؤنڈ میں کھڑی اسے اپنی منتظر ملی۔ کئی میلوں کی مسافت کے بعد جب کار "ٹورسٹ ان" کے سامنے جا کھڑی ہوئی تب شمسہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ تو تمام راستہ طارق کے ساتھ والی سیٹ سے سر ٹکائے کار کے کیسٹ ریکارڈر پر بجتی ہوئی خوابناک مست دھن میں ایسی مدغم رہی کہ اسے اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں کار سے اُتر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس پہاڑی پر بنی عمارت کی بالکونی پر جا کھڑے ہوئے جہاں نشیب میں دریائے سندھ کی منہ زور موجیں کناروں پر بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر کف اُڑا رہی تھیں۔ تیز ہوائیں شمسہ کا گلابی آنچل اُڑائے لئے جا رہی تھیں اور اس کے پونی ٹیل میں بندھے بال بار بار اُفق سے اُمنڈتے سیاہ بادلوں کی طرح اُڑ اُڑ کر اس کے چہرے پر آ جاتے اور وہ ہر دفعہ انہیں ہٹاتی۔ فضا میں ایک عجیب طرح کی طمانیت اور خوشگوار کیفیت رچی بسی ہوئی تھی۔ اندر ہال میں سہ پہر کی چائے کی پُرمسرت ہماہمی تھی۔ چوک بارز اور برگرز کے لیے ٹھنکتے اور آئس کریم کھاتے بچوں کی آوازوں اور کسی قریبی گاؤں میں کسی مشین کے چلنے کی گُو گُو گُو گُو کی صداؤں میں، اس وقت دنیا بڑی خوبصورت، بڑی روشن اور مزے کی معلوم ہو رہی تھی۔ شمسہ اور طارق ہاتھ میں ہاتھ دیئے ڈھلوان پر اُترتے چلے گئے۔ دریا کے پایاب کناروں پر بڑی بڑی چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے دریا کے ایک قریبی پتھر پر بیٹھ گئے اور جوتے اُتار کر نرم لہروں میں پاؤں ڈبوئے۔ انہوں نے دنیا کے ہر موضوع پر

www.urdukorner.com

بات کی۔ طارق نے اپنے تمام خاندان اور گھر والوں کے بارے میں بتایا اور شمسہ نے اپنے تمام حالات بلاکم وکاست طارق کو بتائے۔ یونہی باتیں کرتے کرتے طارق نے شمسہ سے کہا۔

''شمسہ ایک بات بتاؤ۔ تم جو اس طرح میرے ساتھ چلی آئی ہو اگر میں کوئی بہروپیا ہی ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟''

''کیا مطلب؟'' شمسہ زرد پڑتی بولی۔

''بھئی اگر میں کوئی بُرا آدمی ہوتا۔ ارے بھئی منہ کھولے میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میری بات کی سمجھ نہیں آ رہی؟ دیکھو! میں اصل میں ڈریکولا ہوں اور اب اس وقت انسانی روپ بدل کر تمہیں بہلا کر ساتھ لے آیا ہوں۔ اور اب بڑے مزے مزے سے تمہاری مرمریں راج ہنس کی سی گردن میں دانت گاڑھ کر تمہارا میٹھا میٹھا گرم خون پینے والا ہوں۔'' طارق نے یکلخت دونوں ہاتھوں کے پنجے اوپر اٹھائے۔ دانت نکوسے اور منہ سے خوفناک آواز نکالتے ہوئے جھپٹ کر شمسہ کو کندھوں سے پکڑ لیا اور اس کی گردن کی طرف منہ بڑھانے لگا۔ شمسہ کی چیخ نکل گئی اور وہ اپنی پوری قوت سے اس کی گرفت سے نکل بھاگی اور قدرے دور جا کر دوسرے پتھر پر جا بیٹھی۔ طارق نہایت شگفتگی سے قہقہے لگانے لگا۔

''ڈر گئیں نا۔ بس یہی ساری ہمت تھی۔ ارے آ جاؤ کچھ نہیں کہتا۔'' طارق نے اسے بلایا۔

''اوں ہوں۔ نہیں آتی۔ آپ کھا جائیں گے۔'' شمسہ نے ناراضگی سے کہا۔

''ارے بھئی نہیں کھاتا واتا۔ پگلی دیکھو۔ میں بالکل بندہ ہوں۔ کچھ اور نہیں ہوں۔''

وہ آہستہ سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور شمسہ نے نڈھال سی ہو کر طارق کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ہوا میں مدھم گیتوں کی گونج تھی اور وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں کچھ کہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ پا رہی تھیں۔

''شمسہ......!'' طارق نے پکارا۔

''ہوں۔۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

''میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں شمسہ جو عورت کو محض دل بہلاوے کا سامان سمجھتے ہیں، نہ ہی میرے پاس وہ رنگین و مرصع الفاظ ہیں جن کے تانوں بانوں میں میں تمہیں اُلجھا سکوں لیکن اتنا ضرور سمجھ لو کہ میری زندگی میں آنے والی تم وہ واحد لڑکی ہو جسے میں اپنے دل کی سچائیوں سے اپنے ساتھ اس تنہا جگہ پر لایا ہوں تاکہ ہم قریب سے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ یقین کرو ہم شاعر وغیرہ کی قسم کے اکثر لوگ درحقیقت ویسے نہیں ہوتے جیسے دیکھنے میں نظر آتے ہیں۔ ہم میں زیادہ تر وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے خوبصورت شعروں کے جال میں بھولی بھالی جذباتی لڑکیوں کو پھانس کر ان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی کا ایک دوسرا روپ بھی ہوتا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے میں نے یہ خبر ریڈرز ڈائجسٹ میں پڑھی تھی کہ ایک نہایت اچھے عہدے پر فائز خوبصورت مہذب جوان آدمی لڑکیوں سے محبت کی پینگیں بڑھاتا اور پھر انہیں کسی ویرانے میں قتل کر کے پھینک دیتا۔ پولیس چوکنی ہو کر حرکت میں آئی ہوئی تھی۔ آخر ایک دن وہ ایک نرس کو گاڑی میں بٹھا کر لے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کی بیوی نے رو رو کر بتایا کہ آج تک روئے زمین پر اتنا اچھا خاوند، اتنا شفیق باپ کوئی نہ ہوگا۔ اس کے محکمے والے کہتے تھے کہ اب تک ایسا آفیسر نہ ملا ہوگا جو اپنی شرافت اور کارکردگی میں بے مثال ہوگا۔''

''لیکن جس لڑکی نے آپ کو ستارے کی طرح چاہا ہو، دیکھا ہو، وہ تو ایسا آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، طارق صاحب! جھوٹ کے بادل سچ کے سورج کو ہمیشہ چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔ کبھی نہ کبھی تو سچ ظاہر ہو ہی جاتا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نجات کی راہ ہمیشہ سچ بولنے میں ہی ملتی ہے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں یونہی الہڑ پنے کی وجہ سے آپ کے ساتھ اُٹھ کر آ گئی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے طارق صاحب! میں نے اتنی چھوٹی سی عمر میں دنیا کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ابوجی کی وفات کے بعد میں بیٹا بن کر اپنی گرہستی کی گرتی ہوئی چھت کا ستون بنی ہوئی ہوں۔ میں ایک کیریئر گرل ہوں۔ میرا دن میں کئی مردوں سے واسطہ پڑتا ہے اور اب میں مختلف مدارج طے کر کے شعور کی ایسی منزل پر آ کھڑی ہوئی ہوں جو کھرے کھوٹے میں تمیز سکھاتی ہے۔ زندگی نے مجھ سے بہت کچھ چھین کر شعور کی دولت، شناخت کی قوت عطا کی ہے۔ میں نے اپنے طور پر غلط انسان کا انتخاب نہیں کیا ہے لیکن اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میری منزل بنیں یا راستے کا وہ سنگ میل جس پر انسان تھک کر چند لمحے سستا لیتا ہے یا وہ سایہ دار درخت جس کے نیچے کوئی راہ چلتا مسافر چلچلاتی دھوپ سے بچ کر پناہ لے لے، تھوڑی دیر کے لیے۔''

''شمسہ۔'' طارق نے والہانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی؟''

''غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہی ہو؟''

''ہوں۔''

''پتہ ہے تمہارے نام کا کیا مطلب ہے؟''

''ہاں!'' ''شمس، سورج ہی کو تو کہتے ہیں۔''

''تم مجھ سے جدا نہ ہونا، ورنہ دیکھ رہی ہو نا یہ سورج کی رخصتی کا منظر۔ کس طرح ہر طرف لہو سا بکھرا نظر آ رہا ہے۔ اگر ہم ایک نہ ہو سکے تو میرے ارمانوں کا بھی ایسے ہی خون ہو جائے گا۔''

''خدا کے لیے طارق ایسی بات منہ سے مت نکالیں۔''

شمسہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اور پتہ ہے طارق کا کیا مطلب ہے؟''

''رات کو آنے والا تارا، جس کی قسم خداوند کریم نے قرآن مجید کی سورۃ طارق میں کھائی ہے۔''

''اُف تباہ کر دیا مجھے آپ نے تارے! بس آج کے بعد میں آپ کو تارا ہی کہوں گی۔ تارا...... میری قسمت کا تارا...... جگمگ کرتا روشن تارا!'' شمسہ آنکھیں بند کر کے کھو سی گئی۔

سورج اب اپنا سفر تمام کر کے اُفق میں سر چھپا رہا تھا اور شفق کی لالہ رنگ پریاں دریا کی لہروں پر ناچ رہی تھیں۔ اب اندھیرا ہونے ہی والا تھا۔ طارق اور شمسہ نگاہوں میں پیار کے ہزاروں چراغ روشن کئے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ جدائی کا یہ مرحلہ انتہائی تکلیف دہ تھا تاہم دھڑکتے دلوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ساتھ گزارے ہوئے ان بیش بہا لمحات کو اپنی روح کے گوشوں میں کسی مقدس امانت کی طرح سنبھالے پتھروں پر پاؤں رکھتے، ڈگمگاتے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ اوپر ''ٹورسٹ ان'' کی طرف چل دیئے۔

جن دنوں طارق شمسہ کی تلاش میں سرگرداں و پریشان تھا اس کے گھر والے بھی سخت حیران و پریشان تھے۔ ان کے استفسار پر وہ کبھی ان کو خاطر خواہ جواب نہ دے پایا تھا۔ آخر انہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید شادی کے بعد طارق کی اداسی ختم ہو سکے اس کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا اور آخر کار ایک امیر کبیر گھرانے کی لڑکی جو ابھی ابھی ہاؤس

www.urdukorner.com

جاب ختم کر کے ڈاکٹر بنی تھی انہیں پسند آ ہی گئی اور انہوں نے طارق کی بات وہاں ٹھہرا دی...... جب وہ شمسہ سے مل کر آیا تو بے حد خوش تھا۔ اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر بہنوں نے اسے گھیر لیا اور یہ خوشخبری سنائی جسے سنتے ہی اس کی دنیا تہہ و بالا ہوگئی اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ ابھی تو اس نے ارمانوں کے مہکتے بہار آفرین شبستان میں قدم ہی رکھا تھا کہ خزاں بھی دبے پاؤں چلی آئی۔

''نہیں۔۔۔۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔'' طارق نے دل سے فیصلہ کیا اور دونوں بہنوں کو ساتھ لیے سیدھا اپنی امی کے پاس جا بیٹھا......

''امی آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے آپ کی بتائی ہوئی کسی بھی لڑکی کی اب تک حامی نہیں بھری کیونکہ وہ میرے معیار پر پورا نہ اُترتی تھی اور شادی تمام زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔ کوئی ایک دو دن کی بات تو ہوتی نہیں چنانچہ میں اپنے معیار کی لڑکی تلاش کرتا رہا۔ میں خود اس کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ خوش قسمتی سے وہ لڑکی مجھے مل گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر کسی لیڈی ڈاکٹر سے میری بات طے کر دی ہے۔ امی میں ہرگز اس سے شادی نہیں کروں گا۔'' طارق نے حتمی انداز میں کہا۔

ماں نے پہلے تو تعجب سے بیٹے کی بات سنی اور پھر تحمل سے مسکرا کر بولی۔

''آخر ہمیں بھی تو پتہ چلے تمہاری پسند کی لڑکی ہے کون؟ کیسی ہے اور کس خاندان سے ہے وہ۔''

''وہی تو آج میں آپ کو بتانے لگا تھا۔ قدیم شرفا کا خاندان ہے اگرچہ زیادہ دولت مند گھرانہ نہیں لیکن باعزت گزارا ہے۔ لڑکی بے حد حسین ہے، ذہین ہے۔ آج کل ایک جونیئر سکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔'' طارق نے بتایا۔

ہاں آں...... ماں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''خاندان تو پھر یہیں سے معلوم ہو گیا کہ بیٹی سے استانی گیری کروائی جا رہی ہے۔''

''امی آپ کو تو کم از کم اس طرح نہ کہنا چاہیے۔ برا وقت تو بادشاہوں پر بھی آ جاتا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس لڑکی کا اخلاق اور بلند حوصلگی ہے کہ اس نے باپ کی اچانک بے وقت موت کے بعد اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اپنا آپ قربان کر کے اپنی تعلیمی استعداد اور سمجھ داری سے گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک۔ اس نے تو اپنے کنبے کے لیے قربانی دی مگر بیٹا ہم کیوں ایک بڑے گھرانے کی ڈاکٹر لڑکی اور اتنا بڑا جہیز چھوڑ کر اس کے لیے قربانی دیں۔ دیکھو طارق تمہیں ہمارے ساتھ ہر حال میں تعاون کرنا ہوگا۔'' امی نے رعب سے کہا۔

طارق کا سر گھومنے لگا۔

وہ بولا ''دیکھئے امی جی! اگر آپ اس وقت کو قربانی سمجھتی ہیں تو پھر میں بھی آپ کے اس لالچ اور خودغرضی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے کو تیار نہیں۔ میں اپنی مرضی کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ یہی تو ہمارے معاشرے کی برائی ہے کہ دولت اور جہیز کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ نو دولتیے رؤسا نے سفید پوش قدیم شرفا کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رکھا ہے اور ان کی بچیوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ ذہانت، شرافت کو تو آپ جیسے لوگ کوئی وقعت ہی نہیں دیتے۔ جبھی تو برائیاں اور غلط رسمیں رواج پا رہی ہیں۔'' طارق نے سنجیدگی اختیار کر کے کہا۔

''اوہو! تو کیا تم نے ہی معاشرے کی غلط رسمیں اور تمام برائیاں دور کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟'' ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ایک آدمی دنیا سے تمام برائیاں ختم نہیں کر سکتا

www.urdukorner.com

مگر اپنی کوشش سے کم از کم ایک برائی کو تو وہ ختم کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔'' طارق نے کہا۔

''مگر بیٹے یہ مت بھولو کہ دنیا دولت اور طاقت کے آگے جھکتی ہے۔'' ماں نے لاجواب سی ہو کر کہا۔

''مگر آپ بھی یہ بات مت بھولیں کہ دولت اور طاقت مستقل رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ آج کل کے نو دولتیے لوگ مال و دولت کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے کو مقصد حیات خیال کرتے ہیں۔ ان کے دل سیم و زر کو سجدے کرتے ہیں۔ ان کے ضمیر کی روشنی بجھ گئی ہے لیکن ایک انٹلکچوئل آدمی کے احساس مختلف ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک مال و دولت کی کوئی قدر و حیثیت نہیں ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''امی جان کر لینے دیں نا شادی بھائی جان کو جہاں ان کی مرضی ہے۔ ہمارے لیے تو جو بھی آئی ہماری پیاری بھابی ہی ہوگی اور پھر آخر ایک استانی سے شادی کر لینے میں عیب ہی کیا ہے؟'' طارق کی چھوٹی بہن فرزانہ نے ٹھکتے ہوئے کہا۔

''تم چپ رہو جی!'' دوسری بہن رخسانہ بولی۔ ''تمہاری وہ بات ہے، آپا جی سلام، ہم تمہاری جوتی کے غلام۔ اور اگر اس نے بات بے بات پر انگلی اٹھا کر کہہ دیا سٹینڈ اپ آن دا بینچ! تو پھر کیا کرو گی...... ارے بھئی ہم تو ڈاکٹر بھابی لائیں گے۔ اپنا کلینک کھولے گی تو دولت برسے گی اور پھر باہر کے کسی ڈاکٹر کی محتاجی بھی ختم ہو جائے گی اور پتہ ہے یہ بڑا جہیز بھی لائے گی ساتھ۔ میں تو اس سے ڈائمنڈ کی انگوٹھی لوں گی جوڑے کے ساتھ۔ سمجھیں؟''

''شرم کرو رخسانہ! مجھے معلوم نہ تھا تمہارے اتنے گھٹیا خیالات ہوں گے۔ تم نے انسان سے زیادہ ان پتھروں کو وقعت دے رکھی ہے لیکن تم سوچو تو سہی کہ جو کچھ تمہیں خدا نے دے رکھا ہے اس کے سامنے یہ ہیرے جواہرات کیا چیز ہیں۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر احساس کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ جس کے پاس یہ نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کے گلے میں جنتی گھنٹیاں اور منکوں کے ہار باندھ دو، اسے کیا پتہ۔ اسے تو گھاس کھانے اور دولتیاں جھاڑنے سے مطلب ہے۔ تم کیسی لڑکی ہو جو اپنے جیسی لڑکی کا گلا گھونٹنے پر تیار ہو؟ لالچ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' طارق ذرا گرم ہو کر بولا۔

''یہ سب فضول باتیں ہیں بیٹا۔ جب تم اچھی خاصی زندگی گزار لو گے تو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ اس دنیا میں ہر شخص اپنے کو آگے بڑھانے، اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لیے دوسرے کا گلا کاٹنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ رہ گئی لالچ والی بات تو میرے ساتھ بھی دو بیٹیاں ہیں۔ اس گھرانے سے رشتہ جوڑنے کے بعد جو سوسائٹی میں ہمارے وقار اور سٹیٹس میں اضافہ ہوگا اس کا خوشگوار اثر ان کے مستقبل پر بھی پڑے گا۔''

''آپ سوسائٹی کے جس وقار اور سٹیٹس کا ذکر کر رہی ہیں امی، اسے تو شرفا کا متوسط طبقہ دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ آج آن پر جان دینے والے قدیم شرفا اپنی سفید پوشی میں سر چھپائے سسک سسک کر وقت گزار رہے ہیں۔ تو کیوں؟ اس لیے کہ آپ جیسے لوگوں کی سوچ کے انداز ہی بدل گئے ہیں۔ خیر جو بھی ہے امی...... آپ ذرا یہ تو سوچیں کہ وہ لڑکی میری برسوں کی تلاش کا حاصل ہے۔ میری محبت ہے۔'' طارق کی آنکھوں سے جلتے خوابوں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

''چاہت کا جذبہ کتنا ہی سچا اور منہ زور کیوں نہ ہو، دنیا اور قانون کی نظروں میں ناجائز تعلقات کا نام ہے میرے بیٹے! آئندہ ایسے الفاظ منہ سے نکال

www.urdukorner.com

کر اس لڑکی کے لیے بھی مشکلات پیدا نہ کرو۔"

"آپ...... آپ سنگدل لوگ ہیں۔ آپ کے نزدیک دلی تعلقات اور احساسات کے رشتوں کی کوئی قیمت نہیں۔" رنج اور غصے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر طارق کے منہ سے بے ربط جملے نکلنے لگے۔ ماں بہنوں نے اس سے پہلے اسے اس قدر اشتعال میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر منہ زور ریلے کی طرح وہ باہر نکل گیا۔ اس کی چاہت اسے والدین سے بغاوت کی منزل پر لے آئی تھی۔

طارق کی امی نے اس کے ابو کو تمام بات بتائی اور سمجھانے کی تاکید کی۔ انہوں نے بیٹے کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس رشتے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھانا چاہا۔ کچھ مالی منفعت...... کچھ سوسائٹی میں وقار...... کچھ برادری میں اونچی ناک کا حوالہ دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا ابا جی! کہ آپ مجھے ایک ناسمجھ چھوٹا بچہ سمجھ کر اپنے اصول میرے دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ اگر شمسہ یتیم ہے اور دولت میں رئیس خاندانوں کا مقابلہ نہیں کرتی تو یہ بات اس کے ماتھے کا کلنک کیسے بن گئی اور اسے بیاہ کر لانے سے آپ کی ناک کیسے نیچی ہو جائے گی؟" کیا ہمارے رسول ﷺ غریب نہ تھے، یتیم نہ تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو کتنا جہیز دیا تھا؟ آپ مسلمانی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اپنے نبی ﷺ کی پیروی کرنے سے انکار کرتے ہیں اور پھر اگر شمسہ کا پیشہ معلمی یا درس و تدریس ہے تو یہ کام اس قدر گھناؤنا اور گھٹیا کیسے بن گیا کہ آپ اس لڑکی کی ہر صلاحیت پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔ کاش آپ ایک دفعہ اس سے مل کر ہی دیکھ لیتے۔ آپ کا تو مجھ سے زیادہ تجربہ اور علم ہے، کتنی عبادت کرتے ہیں۔ کیا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر نہیں فرمایا کہ "العلم النور" یعنی علم نور ہے اور اسے حاصل کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور وہ ہستی یعنی استاد جو اس علم سے اس نور سے ہمارا سینہ منور کرتی ہے، قوم کے نونہالوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے، اس کا تو رتبہ اتنا بلند کیا گیا ہے کہ اساتذہ کو انبیاء اور صالحین کا ہم پیشہ قرار دیا گیا ہے۔ استاد ہی ایسی عظیم ہستی ہے جس کی تعلیم و تربیت سے آج انسان چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور پھر حقیقت یہ ہے کہ جن ڈاکٹروں کو ہم اساتذہ پر ترجیح دے رہے ہیں کیا ان کا بھی تمام ٹیلنٹ بنیادی طور پر اساتذہ ہی کا مرہون منت نہیں ہے۔ ابا جی! اگر ہم اسی طرح اساتذہ کے پیشے کو حقیر خیال کرتے رہے تو آئندہ آنے والی نسلوں کا کیا ہو گا۔ جب کوئی درس و تدریس کا پیشہ اپنانے پر تیار نہ ہو گا تو نئی نسل کو لفظوں کی پہچان کون کرائے گا؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔ استاد کی عظمت سے مجھے بھی کب انکار ہے لیکن ایک کاروباری آدمی ہمیشہ اپنے نفع نقصان کو پیش نظر رکھ کر بات کرتا ہے۔ دیکھو نا ایک ڈاکٹر اپنے ایک ہی کیس میں استاد کی پورے مہینہ کی تنخواہ جتنا کما لیتا ہے۔" طارق کے باپ نے کہا۔

"بجا فرمایا آپ نے ابا جی لیکن اس میں اساتذہ کا اپنا کیا قصور ہے؟ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ اساتذہ کو ان کی خدمات کا بیش بہا معاوضہ ادا کرے اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹروں پر بھی یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ وہ خلق خدا کی کھال اُتارنے سے باز آ جائیں۔ جب تک ایک ڈاکٹر طالب علمی کے دور میں ہوتا ہے خلق خدا کی خدمت کی رٹ لگائے رکھتا ہے لیکن ڈاکٹر بنتے ہی اس کا رویہ منفی [illegible]

www.urdukorner.com

خاموش تماشائی بن کر معاشرے میں پیدا کی ہوئی برائیوں کو پنپنے کا موقع دیتے ہیں ابا جی۔ اور پھر گستاخی معاف، مجھے تو ان لالچی لوگوں سے نفرت ہے جو بیوی کے مال پر نظر رکھتے ہیں، چاہے ذہنی طور پر مطابقت نہ ہونے کے باعث تمام زندگی روتے روتے ہی کیوں نہ گزار دیں۔ مجھے خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور میں اپنے زور بازو سے کماؤں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ ابا جی جو کوئی اس دنیا کے بسنے والوں کے دکھ سکھ بانٹتا ہے وہی عظیم ہے اور اسی کے پاس اصلی اور سچی روحانی خوشی ہوتی ہے مگر آپ تو میری اس تمام گفتگو کو ایک شاعر کی گپ سمجھ رہے ہوں گے کیونکہ آپ سب کی آنکھوں پر تو رخشندہ کے جہیز کی لسٹ کی پٹی بندھ چکی ہے لیکن اگر آپ نے مجھے رضامندی سے اجازت نہ دی تو پھر میں خود ہی یہ قدم اُٹھا لوں گا کیونکہ زندگی میں نے گزارنی ہے۔ آپ نے نہیں۔'' طارق نے بے حد آزردگی سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''تم بے شک اس سے شادی کر لو لیکن میں اسے اپنے گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔ وہ کبھی بھی میرے گھر میں بڑی بہو کا مقام نہ پا سکے گی۔ نہ کسی عزت کی حقدار ہو گی۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ایک غیر لڑکی کے لیے تم ماں کی نافرمانی کرو گے۔ آج سے میں تمہاری ماں نہ تم میرے بیٹے ہو۔ نہ ہی میں تمہیں دودھ کی بتیس دھاریں بخشوں گی۔''

طارق کی امی دروازے میں کھڑی یہ تمام گفتگو سن رہی تھی، یکدم اندر آ گئی۔ طارق کے والد دم بخود رہ گئے۔ طارق کی باتوں نے تو ان کی آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ کسی اور انداز سے سوچ رہے تھے لیکن بیوی کی ناحق ضد نے ایک عجیب صورتحال پیدا کر دی تھی۔

''بیٹے!'' انہوں نے طارق کو مخاطب کیا۔ ''عورت ساس کے روپ میں ہمیشہ ظالم ہوتی ہے۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں پرائی عورت اس کا نازوں سے پالا بیٹا نہ چھین لے اور بدقسمتی سے تمہارے معاملے میں تو ابتدا ہی ایسے حالات سے ہو رہی ہے کہ تمہاری ماں کی انا کو شکست مل رہی ہے۔ عورت کی نفسیات بھی ایک چکر ہی ہے۔ تم نے آغاز ہی میں اس کی انا اور جذبۂ ملکیت کو چیلنج کر دیا ہے جبکہ عورت اپنی سلطنت میں دوسری ملکہ کو دیکھنا کسی صورت گوارا نہیں کر سکتی۔ بیٹے یہ عورت، جس کے ماں کے روپ میں پاؤں تلے جنت ہوتی ہے، جب اس کی انا مجروح ہوتی ہے تو پھر یہ اولاد کی زندگی جہنم بنانے سے بھی نہیں چوکتی۔ بیٹا میری بات مان لو۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تمہاری تمام زندگی رسہ کشی میں گزر جائے گی۔ روز کے روز لینے سے ایک دن رو لینا بہتر ہوتا ہے۔ ایک ہی دن رو کر صبر کر لو۔ آخر مرے ہوئے بھی صبر آ ہی جاتا ہے۔''

''نہیں ابا جی! میں نے اس کے سامنے اپنے اس نام کی قسم کھائی ہے جس کی خداوند کریم نے بھی قرآن مجید میں قسم کھائی ہے۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔ ایک احقمانہ ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کا دل نہیں توڑ سکتا۔ کاش کہ آپ لوگوں نے مجھے جنم دینے کی اتنی بڑی قیمت مجھ سے طلب نہ کی ہوتی۔''

وہ یکدم اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور پاؤں پٹختا ہوا کار کی طرف بڑھا مگر گاڑی لاک تھی اور ڈرائیور چابی سمیت غائب تھا۔

''امیر خان..... امیر خا آ آ آن.....'' وہ غصے سے چلا کر پکارا۔ اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ اپنے اردگرد کسی کو نہ پا کر طارق تیز تیز قدموں سے

سرونٹ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ ساتھ کے کوارٹر کے سامنے کھیلتے مالی اور جمع دار کے بچوں نے حیرت سے اس لال بھبھوکا چہرے والے صاحب کو دیکھا اور وہاں سے کھسک کھڑے ہوئے۔ وہ کوارٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا سامنے چارپائی کے نیچے سے دو ٹانگیں باہر نظر آ رہی تھیں۔ اس نے زور سے آواز دی تو امیر خان یک دم گھبرا کر 'جی' کہتا ہوا ریورس گیئر لگاتے ہوئے چارپائی کے نیچے سے سر کتا ہوا باہر آنے لگا۔

''یہاں کیا کر رہے تھے؟'' طارق نے دھاڑ کر پوچھا۔

''جی..... جی..... وہ..... خنزیر کا بچہ..... چوہا..... میرا مفلر لے کر چارپائی کے نیچے گھس گیا تھا جی۔ میں تین دن سے اسے ڈھونڈ رہا تھا اور یہ اسے مزے مزے سے کھا رہا ہے جی۔ یہ دیکھئے نا صاحب جی۔'' اس نے اپنا مفلر کھول کر دکھایا جس میں جابجا سوراخ ہو چکے تھے۔ طارق نے امیر خان کی طرف دیکھا۔ بالوں اور ناک پر چارپائی کے نیچے سے مٹی لگ جانے کی وجہ سے وہ بھنتا نظر آ رہا تھا۔

''خدا کے لیے امیر خان کبھی تو انسان بن جایا کرو۔ آفس جانے میں دیر ہو رہی ہے۔ چلو جلدی کرو۔''

اس نے جیب سے پچاس کا نوٹ اس کی طرف اچھال دیا۔

''یہ لو، اور لے لینا بازار سے۔''

آئندہ ویک اینڈ پر طارق پھر شمسہ کو ملنے گیا اور تمام سرگزشت سنانے کے بعد شمسہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں والدین کو شامل کیے بغیر دوستوں کی برات لا کر تم سے شادی کر لوں گا اور ہم علیحدہ مکان میں رہیں گے۔ شمسہ یہ بات سن کر پوری جان سے کانپ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے، تب طارق اسے لے کر اس کی امی سے ملنے چلا آیا۔

''بیٹے! میں تمہارے جذبات و احساسات کی قدر کرتی ہوں۔'' ساری صورتحال سن کر وہ بولیں ''اگرچہ ہم زیادہ دولت مند نہیں ہیں لیکن ہم نجیب الطرفین ضرور ہیں اور کافی اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج تک ہمارے خاندان میں اس قسم کی شادی نہیں ہوئی۔ ہم نے شمسہ کے باپ کے مرنے کے بعد بھی نہایت عزت اور شرافت سے زندگی گزاری ہے اور اب میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہم پر انگلی اٹھائے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

''بیٹے تقسیم ہند کے دور میں بادشاہ فقیر ہو گئے اور فقیر بادشاہ..... ایک افراتفری اور نفسانفسی کا دور تھا جو آ کر چلا گیا مگر خاندانی شرفاء کے لیے پھر وہ بات نہ بن سکی۔ بعض لوگوں نے ذاتی مفاد کے لیے کئی قسم کے کردار ادا کیے جن کے لیے خاندانی شرفاء کے ضمیر تیار نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ قدیم خاندانی رؤساء منظر عام سے ہٹ کر پس پردہ چلے گئے اور عام اور نچلا طبقہ اپنی ذات اور نسل تبدیل کر کے سامنے آ گیا اور اس طرح احساس کمتری کا شکار ایک نو دولتیا طبقہ وجود میں آیا۔ جس کی اخلاقی اقدار کی حد پیسہ اور ظاہری نام و نمود پر ہی آ کر ختم ہوتی ہے۔ میرے بچے! پرانے خاندان مٹ گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں سونے کے برتنوں میں کھانے والے لوگ نجانے کہاں کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے نکل گئے اور آج یہ عالم ہے کہ

اوچھے کے ہاتھ تیتر
باہر باندھوں کہ بھیتر

جسے دیکھو اپنی ہی ڈفلی بجائے جا رہا ہے۔''

''آنٹی اگر یہ آپ کے ہاں خاندانی مسئلہ ہے تو

www.urdukorner.com

اسے اتنی اہمیت نہ ملنی چاہیے کہ دو انسانوں کی زندگی کا سوال بن جائے۔ اب وہ پہلا سا زمانہ نہیں رہا اور ہر زمانے کے چند ایسے تقاضے ضرور ہوتے ہیں جو پرانی روایات میں دراڑیں ڈال دیتے ہیں۔" طارق نے بے چینی سے کہا۔

"نہیں میرے بیٹے! میں اپنی خاندانی روایات کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔ ہماری تو وہی بات ہے۔ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ جو دلہن اپنے سر پر ننددں کے ارمانوں اور ساس کی دعاؤں کا آنچل لے کر میکے سے رخصت نہ ہو، وہ دلہن ہی کیا۔ ہم میں تو یہ سخت بدشگونی سمجھی جاتی ہے۔ برادری والے سو سو نام دھریں گے۔ ابھی تو شمسہ کی دوسری بہن بھی بیٹھی ہے۔ شمسہ کے کسی بھی غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھانے سے اس کا بھی مستقبل مخدوش ہوسکتا ہے اور ہمارے پاس سوائے عزت کے اور ہے ہی کیا؟ کوشش کرو کہ تمہارے ماں باپ مان جائیں اور اگر تم ان کو منانے میں کامیاب نہ ہوسکو تو ہماری طرف سے معذرت سمجھنا اور انہیں ساتھ لیے بغیر آئندہ ادھر نہ آنا۔"

شمسہ کی امی یہ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

طارق اور شمسہ گم سم بیٹھے رہ گئے۔

کمرے میں کچھ دیر مکمل خاموشی رہی۔

آخر گلا کھنکارتے ہوئے طارق نے کہا۔

"شمسہ! میرا تو خیال ہے کہ تمہاری امی نہیں مانتیں، تو نہ سہی، اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو ہماری زندگیاں برباد ہونے سے بچ سکتی ہیں۔ پھولوں کے حصول میں کانٹوں کو نظرانداز کرنا چاہیے۔ ازدواجی زندگی تو ہم دونوں نے ہی گزارنی ہے نا! ہمارے والدین یا بہن بھائیوں نے تو نہیں۔ ہر کوئی اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ میری بھی بہنیں ہیں والدین ہیں مگر مجھے اپنے اصولوں کے سامنے ان کی پروا نہیں۔"

"ٹھیک ہے طارق! آپ مرد ہیں آپ کو تو کوئی کچھ نہ کہے گا مگر عورت کی ذرہ بھر کی لغزش تمام زندگی کا ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔ میں ماں سے بغاوت نہیں کرسکتی۔ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ میرا اس طرح کا اٹھایا ہوا قدم ان کی جان لے لے گا اور میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کرسکوں گی۔" شمسہ کے اندرونی جذبے اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

"اچھا..... اچھا روؤ نہیں شمسہ! میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ میں ایک دفعہ پھر کوشش کرتا ہوں کہ امی کو یہاں لانے میں کامیاب ہوسکوں مگر اب ان حالات میں نہایت مشکل نظر آتا ہے کہ وہ یہاں آئیں۔ بہرحال دعا کرتی رہنا۔" طارق نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور شمسہ کو سلگتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

شام ڈھلے وہ واپس آیا تو برآمدہ میں ہی ان کے فیملی ڈاکٹر اور ابو سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے تشویش بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری امی اب بہتر ہیں نوجوان لیکن احتیاط ازحد ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے اس کا بازو تھپتھپایا۔

"طارق میاں! دیکھ لو اپنی ہٹ دھرمی کا نتیجہ۔" ڈاکٹر کو رخصت کر کے ابو بولے۔

"تمہارے جانے کے بعد وہ اتنا روئیں کہ دورہ پڑ گیا۔ تمہیں تو پتہ ہے ہی کہ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ ایسے مریض کو ویسے بھی غصہ زیادہ آتا ہے۔ اب ڈاکٹر نے ای سی جی کرنے کے بعد دل کا انجائینا بتایا ہے۔ اگرچہ یہ زیادہ مہلک نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس میں مریض کا پرسکون رہنا ازحد ضروری ہے، ورنہ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔"

(باقی آئندہ)

☆☆☆

www.urdukorner.com

www.urdukorner.com